قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

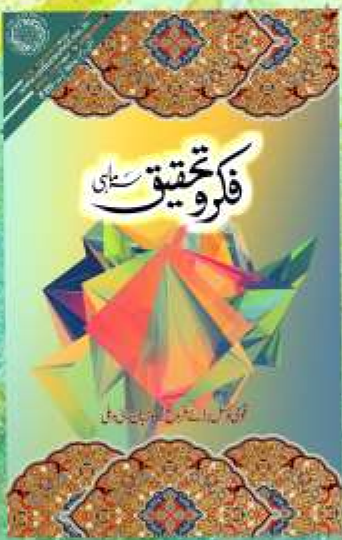

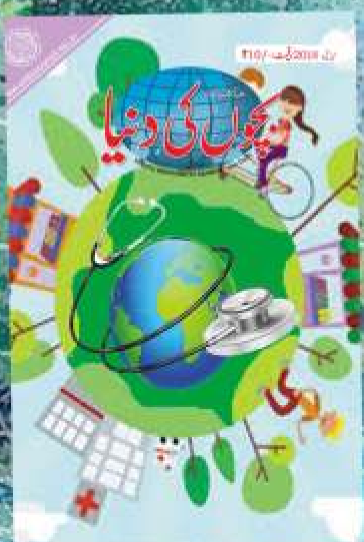

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

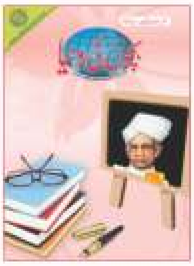

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

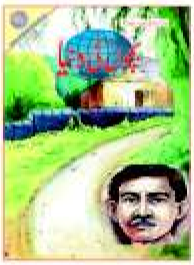
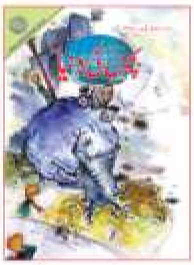

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:04، اپریل 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون:040-2441519

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

گفتگو
رئیس خان پٹھان — شعیب رضا فاطمی 8

انٹرویو
مضطر مجاز — محبوب خاں اصغر 10

نقد و نگاہ
نصرتی اور ان کی شاعری — محمد غلام ربانی 14
سید والا گہر کی تخلیق نادر: اولین اردو افسانہ — مظفر حسین سید 17
جدید اردو شاعری کی خاتون اول: ادا جعفری — محی بخش قادری 20
زخ ش — نعمان قیصر 23

گوشۂ اقبال
عظمت انسانی کا حدی خواں — جمال رضوی 26
اقبال کی ایک مغالطہ آمیز تلمیح — جمال عبدالواجد 29
اقبال کا ماحولیاتی شعور — سمی اقبال 32

اپریل کے آفتاب
سلیمان اریب اور ان کے چار درویش — سید معظم راز 35
جگر کا سدا بہار غزلیہ سفر — ندیم راعی مرادآبادی 38

یاد رفتگاں
جدید لب و لہجے کا شاعر: محمد علوی — محمد یوسف رضا 40

چراغ دل
بابا گورونانک کا تصور وحدت — ناشر نقوی 42

اردو ادب میں سنت کبیر کا مقام — یوسف صابر 45

جنھیں ہم نے بھلا دیا
پنڈت رتن پنڈوری — شجاع الدین شاہد 47

نیا آسماں نئے ستارے
مسعود حسن رضوی ادیب کے تنقیدی نظریات — عبداللہ مدنی 49

اردو ناول کا سفر — محمد امان اللہ 53

سلسلۂ صحافت
طنز و مزاح اور الکٹرانک میڈیا — اختر آزاد 55

فلم
بلراج ساہنی — انیس امروہوی 58

کمپیوٹر
ونڈوز 7 میں مدد لینا 61

کوئز
ادبی کوئز — محمد ناظم علی 67

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 69

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

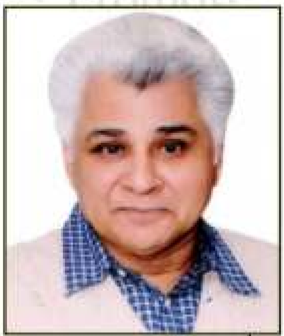

زبان وادب کے فروغ کے لیے ہر ادارہ اپنے وسائل اور ذرائع کا استعمال کرتا ہے اور ہر ادارے کی اپنی ترجیحات بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے ادارے ہیں جن کا بنیادی مقصد زبان وادب کی ترویج واشاعت ہے۔ یہ ادارے اپنی اپنی سطحوں پر فروغ زبان کے لیے لائحہ عمل اور منصوبے بھی تیار کرتے ہیں اور ان منصوبوں کے نفاذ کی بھی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے۔ یقینی طور پر بعض ادارے بہت فعال اور متحرک ہیں اور ان اداروں کے ذریعے جو بھی کام کیا جارہا ہے وہ قابل ستائش بھی ہے۔ زبان وادب کے فروغ کے تعلق سے ایسا ہی ایک ادارہ قومی اردو کونسل بھی ہے جس نے پہلے ترقی اردو بیورو کی صورت میں زبان وادب کے فروغ کے لیے بہت عمدہ کام کیا اور اب یہ قومی اردو کونسل کی شکل میں زبان وادب کی ترویج کے لیے مختلف محاذ پر سرگرم ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ مختصر عرصے میں اس ادارے نے کمپیوٹر کے تربیتی مراکز ان علاقوں میں قائم کردیے جہاں کے لیے اردو زیادہ مانوس زبان نہیں ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے بیشتر حصوں میں قومی اردو کونسل نے اس طرح کے مراکز قائم کرکے ایک نئی مثال قائم کی ہے کہ آج جب اردو سے تعلق رکھنے لوگ ان اطراف کا سفر کرتے ہیں اور وہاں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مراکز کو دیکھتے ہیں تو انھیں حیرت ہوتی ہے کہ اردو زبان اس علاقے تک پہنچ گئی جہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آج ہندوستان کے بیشتر علاقوں، خاص طور پر شمال مشرق کی ریاستوں میں قومی اردو کونسل کے قائم کردہ جو اردو کمپیوٹر کے مراکز ہیں وہ بہت اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان علاقوں میں اب اردو زبان ایک نئی شکل اور صورت میں سامنے آرہی ہے اور ایک بڑا طبقہ اس سے جڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ قومی اردو کونسل اشاعتی محاذ پر بھی سرگرم ہے۔ اس ادارے نے مختلف علوم وفنون اور اہم موضوعات پر جو بیش قیمت کتابیں شائع کی ہیں، وہ پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ خاص طور پر سماجی، سائنسی اور تکنیکی علوم سے متعلق کتابوں کی اشاعت قومی اردو کونسل کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ کتابوں کی اشاعت کے علاوہ رسائل کی اشاعت کے ذریعے یہ ادارہ اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اور شاید یہ واحد ادارہ ہے جو مختلف ذہنی سطحوں کا خیال رکھتے ہوئے رسائل شائع کررہا ہے۔ ایک طرف جہاں باشعور اور تحقیقی ذہن رکھنے والے افراد کے لیے سہ ماہی 'فکر وتحقیق' کے عنوان سے تحقیقی موضوعات پر محیط مجلّہ شائع کررہا ہے تو وہیں بچوں کی ذہنی نفسیات اور مزاج کے مدنظر ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کی اشاعت بھی جاری ہے اور اس سے بچوں کا ایک بڑا طبقہ کسب فیض کررہا ہے۔ خواتین کے مسائل ومتعلقات کا خیال رکھتے ہوئے پہلی بار سرکاری سطح پر خواتین کے لیے مختص ایک رسالہ 'خواتین دنیا' کے نام سے شائع کررہا ہے جو خواتین کے حلقے میں بہت مقبول ہے اور خواتین کو یہ احساس ہورہا ہے کہ ان کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کے لیے سرکاری سطح پر ایک رسالہ موجود ہے۔ اسی ادارے سے ماہنامہ 'اردو دنیا' کے نام سے ایک ایسا رسالہ شائع ہوتا ہے جو علمی، ادبی، ثقافتی موضوعات پر محیط ہوتا ہے اور اس میں ہر ذوق اور سطح کے قارئین کی ذہنی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی موضوعات کے علاوہ، طب، سائنس، ٹیکنالوجی اور سماجیات پر بھی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کے ان چاروں رسائل سے اردو زبان وادب کا فروغ ہورہا ہے اس کا اعتراف پوری اردو دنیا کو ہے اور یہ رسائل ایسی صورت میں شائع ہورہے ہیں جب قارئین کی تعداد گھٹ رہی ہے، اخبارات اور رسائل کا سرکولیشن بھی کم ہورہا ہے اور اچھے لکھنے والوں کی بھی کمی ہے۔ یہ صرف آج کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ماضی میں بھی صورت حال کم وبیش یہی تھی۔ ایک تو رسائل خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد پہلے بھی کم تھی، دوسرے تخلیقات بھی اول درجہ کی نہیں ہوتی تھیں۔ عابد سہیل جیسے مدیر نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''تخلیقات میں ایک آدھ قدر اول کی ہوتی ہے۔ باقی دوسرے اور تیسرے درجے کی اور ان کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار ہوجاتا ہے۔'' مجلّہ 'شاعر' کے مدیر اعجاز صدیقی نے بھی یہ بات کہی تھی کہ ''90 فیصد تخلیقات غیر معیاری ہوتی ہیں۔'' یہ اس زمانے کی بات تھی جب اچھے لکھنے والے موجود تھے مگر آج صورت حال ناگفتہ بہ ہے پھر بھی اردو رسائل شائع ہورہے ہیں۔ تخلیقات کی اشاعت ہورہی ہے۔ اس لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ کم ازکم ان رسائل سے اردو زبان وادب کو زندگی تو مل رہی ہے اور آج کے دور میں زبان وادب کو زندہ رکھنا زیادہ اہم ہے کیونکہ دنیا کی بہت سی زبانیں مررہی ہیں، مستقبل میں اور بھی بہت سی زبانیں مرنے والی ہیں جس کی پیش گوئی کچھ ماہرین لسانیات نے بھی کی ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

'اردو دنیا' فروری 2018 کا شمارہ کہیں زیادہ آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس کی ابتداء ہی معروف گیت کار یوگیش سے لیے گئے انٹرویو سے ہوئی ہے۔ یوگیش نے فلم آنند کے بڑے عمدہ گیت تحریر کیے تھے اور اس سے قبل 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' اور 'تم کو پیا دل دیا' بہت مقبول ہوئے تھے۔ انٹرویو تو بہر حال اچھا ہے پر تفصیلات اکتا دیتی ہیں۔ ص 13 تا ص 23 قومی اردو کونسل کے اکیسویں کل ہند اردو کتاب میلے کی دستاویزی روداد کی ابتدا شہر سولاپور کی تاریخ و جغرافیہ کی دلچسپ تفصیل، محل وقوع، صنعت و حرفت، تعلیم، اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد و کارکردگی، فلم و فن سے لے کر سیاست، تعلیم و کھیل سے جڑے مشاہیر کا بیان بھی درج ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام تفصیلات کتاب میلے کی بے مثال کامیابی اور اختتامی تقریب کی جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ ص 25 تا ص 28 لسانیات پر مبنی مختلف لسانی خاندانوں کا تعارفی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو اپنے آپ میں علمی اور تحقیقی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے یہ نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ص 29 پر غلام ربانی تاباں کے کلام اور اس کے رنگ سے بحث کی گئی ہے۔ ص 31 پر مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کے معاصرین کے درمیان علمی بحث پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔ ص 34 پر جاں نثار اختر کا ذکر ہے۔ یہ ذکر 'اردو دنیا' میں بارہا ہوتا رہا ہے۔ اس مرتبہ یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف رومان و انقلاب بلکہ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری میں بھی توازن اور اعتدال برقرار رکھا ہے۔ ص 93 پر ڈاکٹر ذاکر حسین کے طرزِ ادب اور زورِ خطابت پر بحث کی گئی ہے۔ ص 42 پر اودھ میں ڈراما نگاری کے ارتقا اور ترقی پر سماجی اور تاریخی حوالوں سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اردو ڈرامہ سے ذوق رکھنے والے طلبہ و ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ بہت عمدہ مضمون ہے۔ ص 46 پر سکندر علی وجد کی نظم نگاری پر قلم تو اٹھایا گیا ہے، لیکن فاضل مصنف کے مطابق ''...... اجنتا کے غاروں میں تراشے گئے جمال پرور مجسموں کے حسن و خوبصورتی کو سراہتے ہوئے سنگ تراشی کے ان نادر روزگار نمونوں کے تخلیق کاروں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔'' (ص 47) حالانکہ وجد نے نظم 'اجنتا' میں رنگوں اور تصویروں کا ذکر کیا ہے نہ کہ مجسموں کا۔ اسی

ص 47 کے وسطی کالم کو غور سے دیکھیے، وجد نے جہاں نظم 'اجنتا' میں تصویروں کا ذکر کیا ہے وہیں نظم 'ایلورہ' میں مجسموں کا بیان ہے۔ بہر حال مصنف کو مضمون لکھتے وقت یہ فرق محسوس کر لینا چاہیے تھا، کیونکہ ان پر طلبہ کو تعلیم دینے کی اہم ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ص 49 پر انیسویں صدی کے اخبار 'وکیل' کا ذکر ہے، جس کا مقصد عوام کو قانون اور معلومات عامہ سے آگاہ کرنا تھا۔ ص 66 پر دیا گیا مضمون افادیت سے بھرپور ہے۔ اس میں کمپیوٹر سے متعلق ونڈوز کی بنیادی اصطلاحیں سمجھائی گئی ہیں۔ ص 71 تا ص 80 کتابوں کی دنیا کے ذیل میں کوئی تیرہ کتابوں سے متعارف کراتے ہوئے ان پر تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ ص 81 تا ص 100 قومی اردو کونسل کی چیدہ چیدہ سرگرمیوں کا خبرنامہ دیا گیا ہے، جس میں اردو ادب اور نیچرل سائنس پینل نشستوں کا انعقاد اور روداد کے علاوہ عالمی کتاب میلے اور سولاپور کل ہند کتاب میلے کی تحریری و تصویری جھلکیوں کے ساتھ ساتھ وفیات کے تحت اردو کے نامور شعراء، ادبا اور دیگر فنکاروں کی وفات کی جانکاہ خبریں شامل ہیں۔

مصطفی ندیم خان غوری: اورنگ آباد، مہاراشٹر

فروری ماہ کا شمارہ مختلف زبانوں کے رسم الخط کے پس منظر سے مزین سرورق کے ساتھ دستیاب ہوا۔ اس میں بھی تمام مشمولات حسبِ سابق معیاری ہیں۔

غلام ربانی تاباں کی شاعری کا ایک نہایت احسن تجزیہ جناب شارب ردولوی نے پیش کیا ہے۔ تاباں کی تابندہ شاعری اسلوب کی سطح پر سہل ممتنع کی بہترین مثالوں سے مملو ہے اور مواد کے مدِ نظر قنوطیت پسندی سے کہیں زیادہ اس میں رجائیت پرستی کا حوصلہ افزا جذبہ پے در پے ملتا رہتا ہے، بالخصوص قابلِ محولہ یہ ایک شعر تو ہزار ہا اشعار پر حاوی ہے: ''عافیت سفینوں کی سیلِ آب میں معلوم / بات یہ ہے کچھ مانجھی سر پھرے بھی ہوتے ہیں۔'' انھوں نے انسان کو عموماً زندگی میں کامرانی پانے کے لیے اسی طرح کے جنون (Passion) کا مفید سبق فراہم کیا ہے۔

محمد افضل صاحب نے بھی موقر شاعر جاں نثار اختر کے کلام پر تنقید کی ہے، اس مقالے میں فقط ان کے اعلیٰ نغمہ نگاری کی حیثیت کو ضرور نشان زد کرتا رہ گیا ہے، جو کہ جگہ کی تنگی کے ہی باعث ہو سکتا ہے۔

محمد یاسین گنائی صاحب نے اردو شاعری میں گلوں کے تذکرے کی تحقیق جیسے نایاب موضوع کو پیش کرنے کے علاوہ گلوں کی طبی اہمیت کو جس عرق ریزی کے ساتھ تحریر کیا ہے، وہ بھی لائقِ دید و داد ٹھہرتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر 201-A، گلی نمبر 18-A، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

اردو دنیا فروری 2018 کا شمارہ مطالعے میں آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالہ ایک طویل مسافت کے بعد بلندی کی اس منزل تک پہنچا کہ قابلِ تحسین ہے۔ رسالہ 'اردو دنیا' جغرافیائی قید و بند سے آزاد ہو کر اردو قارئین کے ایک وسیع تر حلقے تک اپنی خوشبو بکھیر رہا ہے۔ رسالہ داخلی و ظاہری دونوں سطحوں پر ہمارے جمالیاتی احساس کو بیدار کرتا ہے۔ جو اردو نہیں جانتے وہ کم از کم اسے چھو کر ضرور دیکھتے ہیں۔ گزشتہ مہینے میرے ایک عزیز دوست نے جنھیں اردو نہیں آتی، رسالہ 'اردو دنیا' دیکھ کر اپنی حیرت ناک خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو میں بھی اتنا سندر پتریکا پرکاشت ہوتا ہے؟'' اس خوشگوار حیرت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو زبان سیکھنے کی اپنی دیرینہ خواہش بھی ظاہر کی۔

اپنی اداریتی تحریر کے تحت محترم پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب نے بے حد اہم موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ موصوف نے مادری زبان اور لسانیاتی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے نہایت فکر انگیز اور کارآمد گفتگو کی ہے۔ قابلِ غور ہے کہ ادارے

میں جن اہم نکات کی نشاندہی کی گئی ہے،اس سے کسی بھی صورت انکار ممکن نہیں۔ جگ ظاہر ہے کہ اس مشینی اور برق رفتار زندگی میں لسانی وتہذیبی قدروں کا زوال عام ہے۔ اس جانب دانشوروں اور مفکروں کی گہری خاموشی ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اس سیاق میں اجتماعی کوششوں کے ساتھ ساتھ انفرادی سطحوں پر بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کی یہ بات حق بجانب ہے کہ ''مادری زبان سے بچوں کو جوڑنا ہمارا بنیادی فرض ہے۔

اس شمارے میں نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی صاحب کی طویل رپورتنگ بعنوان 'اکیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ' نہایت حوصلہ بخش اور خوش آئند ہے۔ محترم کی عمدہ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہاں کے لوگ اردو سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ مہاراشٹر کے لوگوں کا عمل پیہم ہم سب کے لیے باعث عبرت ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے ابتداء میں وہاں کی علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی قدروں پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ اس خوبصورت اور منظم رپورتنگ کے مطالعے سے کتاب میلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا احساس ہوا۔ پیش نظر تحریر کی روشنی میں مہاراشٹرا کے اورنگ آباد، مالیگاؤں، ممبئی، بھیونڈی، پونے، ناگپور، امراوتی، ناسک، تھانے، سولاپور اور دوسرے شہروں وعلاقوں میں اردو کی موجودہ صورت حال کا خاطر خواہ اندازہ ہوا۔ بقول موصوف ''اردو زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان کافی پھلی پھولی ہے اور وہاں بنیادی سطح پر بھی اردو تعلیم کا بہتر نظم ہے۔''

خوشی کا مقام ہے کہ رسالہ 'اردو دنیا' میں ہندوستان کے مختلف علاقوں/صوبوں کے مصنفین کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ کسی تعصب و جانب داری سے قطع نظر اس رسالے میں پورے ہندوستان کی روح سمٹ آئی ہے۔ اس سے نکلنے والی علمی و ادبی شعاعیں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب ہر سمت کو منور کر رہی ہیں۔ تازہ شمارے کے بیشتر مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔ یادرفتگاں کے ذیل میں خدا داد خاں مونس اور انور جلال پوری کے حوالے سے دو مضامین شامل ہیں۔ ان ادبی شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کر کے ادارے نے اپنی دیانت داری کا عمدہ ثبوت پیش کیا ہے۔ نقد و نگاہ کے ذیل میں محترم شاہد حسین صاحب کا گراں قدر تحقیقی و تنقیدی مضمون 'دبستان لکھنؤ اور اردو ڈراما' اردو ڈرامے کی ادبی و تاریخی روایت سے منطقی واستدلالی انداز میں مکالمہ قائم کرتا ہے۔ محمد یاسین گنائی کے مضمون 'اردو شاعری میں پھولوں کا تذکرہ' پر پھولوں کا اس قدر رنگ چڑھ گیا ہے کہ مطالعے میں ذرا دشواری پیش آئی۔ دیگر مضامین میں 'سکندر علی وجد کی نظم نگاری' از مقبول احمد مقبول 'غلام ربانی تاباں' از شارب ردولوی اور 'رومان اور انقلاب کی معتدل آواز: جاں نثار اختر' از محمد افضل پسند آئے۔ مضامین کے علاوہ تبصرے اور ادبی خبریں بھی لائق توجہ ہیں۔ البتہ کلاسیکی ادب کے متعلق مضامین/ تحریروں کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔

❖ **ڈاکٹر محبوب حسن**: نئی دہلی

دس کارآمد خطوط اور بیس السانی خاندانوں کی معلوماتی تفصیل سے مالامال اردو دنیا فروری 2018 ملا۔ گیارہ صفحات پر مشتمل قومی اردو کونسل اور بزم غالب کے مستحسن اشتراک سے ریاست مہاراشٹر کے سولاپور میں منعقدہ اکیسویں کل ہند کتاب میلے کی سیر حاصل رپورٹ نے اس شمارہ کی قدر و قیمت کو دوبالا کر دیا۔ مہاراشٹر میں 4900 اردو میڈیم اسکولوں کے بارے میں پڑھ کر میں خوشی کے مارے پھولے نہیں سمایا، اکیلے سولاپور میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد 164 کافی معنی رکھتی ہے، خدا ان تمام اسکولوں کو اردو طالب علموں کے ساتھ قائم و دائم رکھے آمین۔ اس معلومات افزا رپورٹ کو شمارے کا مغز کہا جا سکتا ہے۔ میلے کے تعلق سے افضل میر صاحب کی نظم، اردو کتاب میلا فتی کم مجتبی زیادہ ہے مگر اچھی ہے۔ دس لوگوں کے میلے کے تعاون سے تاثرات ترغیب بخش ہیں۔ نومبر 2000 سے 2017 تک کا اردو کتابوں کی فروخت کا قومی رکارڈ قابل غور ہے۔ ادارے کو مرحوم غلام ربانی تاباں صاحب کی بڑھاپے والی تصویر دینی چاہیے تھی۔ اس بار کے شمارے میں چند نئے لکھنے والوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نو واردین پر ہی زبانوں کا مستقبل منحصر ہے۔ شاہد حسین صاحب کا مضمون فرحت بخشتا ہے۔ سکندر علی وجد صاحب کی نظم نگاری غالب کی مشکل ترین غزل گوئی کی مانند ہے۔ میرا خیال ہے کہ ذی علم قلمکاروں کو معیار سے مصالحت نہیں کرنی چاہیے۔ اوم پرکاش سونی کے توسل سے سنہ 1895 کا اردو اخبار دیکھنے کا حسن اتفاق ہوا۔

رؤف خیر صاحب کا اشہب قلم نظم ونثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر دوڑتا نظر آتا ہے۔ خداداد صلاحیت کے مالک خداداد خاں مونس سے متعلق مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ فرحان خان صاحب نے معروف زمانہ مرحوم انور جلال پوری کے تعلق سے بہت مناسب عنوان کا انتخاب کیا ہے۔ کاش دنیا میں کوئی کسی کا دشمن نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ وہ لوگ مرکر بھی زندہ رہتے ہیں جن کے کارنامے تعمیری نقطہ نظر سے ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ، بہار

ماہ فروری 2018 کا 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ شعری تخلیقات سے مبرا 'اردو دنیا' کے علاوہ اور بھی ادبی جرائد ہو سکتے ہیں۔ تاہم میری دانست ابھی اس امکان سے قاصر ہے۔ کالم ادبی کوئز بھی فروری کے حصے میں نہیں آیا۔ البتہ یادرفتگاں کے تحت مرحوم خداداد خاں مونس اور انور جلال پوری نے مایوسیوں کا ازالہ کر دیا۔ بہتر از بہتر سوالات اور بہترین جوابات پر مبنی صدر عالم گوہر اور فلمی نغمہ نگار یوگیش کی ملاقات خوب رہی مگر میں یوگیش جی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ لکھنؤ کی زبان بگڑ گئی ہے۔ ضرب کاری زمانہ کے سبب اس کی شیرینی و لطافت قدرے مکدر ضرور ہوئی ہے لیکن اس کا پروقار تشخص تاحال برقرار ہے۔ 'اردو شاعری میں پھولوں کا تذکرہ'، 'السنہ عالم کے مختلف خاندانوں کا جائزہ'، 'دبستان لکھنؤ اور اردو ڈرامہ' نیز 'ہندوستان کا عوامی طرز رقص' بہت ہی اچھے تحقیقی مضامین ہیں غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی شمولیت کے باعث طلبا میں ماہ فروری کی پذیرائی جنون کی حد تک پائی گئی۔ معتبر اطلاعات کے مطابق کتاب میلہ اردو کے فروغ میں بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اردو کتابوں کی فروخت کا ریکارڈ انتہائی سرور بخش ہونے کے ساتھ ساتھ دستاویزی حیثیت کا حامل بھی ہے اس کے حوالے سے قسم کھائی جا سکتی ہے کہ 'اردو دنیا' کی کتنی پسندیدہ زبان ہے۔

❖ **سید عارف لکھنوی**: نیشنل پبلک اسکول مغربی چمپارن، بہار

'اردو دنیا' فروری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ ہمیشہ کی طرح بے حد جاذب نظر اور معیاری و مفید تخلیقات سے مزین ہے۔ بالخصوص محترم عبدالحی (نائب مدیر) کی مرتب کردہ شولاپور کے اکیسویں اردو کتاب میلے کی روداد نظر نواز ہوئی۔ یہ روداد ماشاء اللہ، بہت بہترین ہے۔ شولاپور کے حوالے سے بہت سے تاریخی ریفرینسز، معلومات و تفصیلات قابل تعریف ہیں۔ موصوف نے بڑی عرق ریزی سے یہ رپورٹ بنائی ہے۔ یہ شولاپور کے اردو طالب علموں کے لیے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رپورٹ میں شولاپور کے کتاب میلے کی روز اول سے اختتام تک کی ہر تفصیل کو بہت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ میں اپنی اور شولاپور والوں کی جانب سے محترم شاہ نواز خرم، جناب کمل سنگھ، ڈاکٹر فیروز عالم، محترم عبدالحی اور کونسل کے جملہ کرم فرماؤں اور تمام پبلشرز، شعراء، ادبا اردو کے چاہنے والوں، اساتذہ کرام، طلبہ وطالبات اور جملہ محبان اردو کا شکر گزار ہوں۔

❖ **ڈاکٹر ہارون رشید احمد صاحب باغبان**: مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2018 کا شمارہ اپنے روایتی حسن کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ کور پیج اور بیک پیج پر بولتی تصویریں قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کی گواہی دے رہی ہیں۔ قومی اردو کونسل اپنے نام کے شایان شان اردو کے فروغ کے لیے جو کوششیں کررہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اداریے میں آپ نے صحیح فرمایا کہ ہندوستان میں بہت سے اردو میڈیم اسکول ہیں۔ ہم نے پٹنہ میں ایسے اسکول دیکھے ہیں جہاں ہر سبجیکٹ اردو میں پڑھایا جاتا ہے۔ آپ کا مشورہ کہ اردو زبان کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دیں کہ اردو میں علمی، دینی موضوعات کے علاوہ سائنس و سماجی علوم وفنون پر وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ہندوستان بھر میں کتاب میلہ منعقد کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ فروری کے فرتاب نشان غلام ربانی تاباں، مولانا عبدالسلام ندوی، جاں نثار اختر اور علی عباس حسینی پر مضامین ان کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ کمپیوٹر کے بڑھتے ہوئے استعمال کے مدنظر اردو کو بھی شانہ بہ شانہ لانے کے لیے ونڈوز پر بنیادی معلومات فراہم کرکے کونسل قابل تعریف کام کررہی ہے۔ اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں اکٹھا کرکے قارئین تک پہنچانا بھی اردو زبان کو فروغ دینے کی ایک کوشش ہے۔

عبدالحی پیام انصاری: پپر ولی بازار، ضلع گورکھپوری، یوپی

'اردو دنیا' فروری کا شمارہ دستیاب ہوا۔ سرورق سے لے کر آخیر تک دیدہ زیب ہے۔ مضامین اچھے ہیں۔ محمد فرحان خان نے انور جلال پوری پر مختصر لیکن بہتر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ علی عباس حسینی پر اسود گوہر نے متاثر کیا۔ عبیداللہ ہارون نے مولانا کے معاصرین پر لکھ کر اچھا کام کیا ہے۔ سارے مضامین معیاری ہیں۔ تبصرے کا حق بھی ادا ہوگیا۔ حقانی القاسمی نے نظامی آواز پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔ یوگیش سے صدر عالم گوہر کا انٹرویو بہت اچھا ہے۔ ایک جگہ 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' کو کلیان جی کی دھن بتایا گیا ہے جبکہ یہ لکشمی کانت پیارے لال کی دھن ہے۔

ڈاکٹر بصرا اعظمی: مریاد پور، مئو، اترپردیش

اردو دنیا فروری 2018 کا نیا شمارہ زیر مطالعہ ہے، سولاپور میں کل ہند اردو کتاب میلے کی تصویری جھلکیوں کے ساتھ دلچسپ اور مفصل روداد پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا، تصویری جھلکیوں میں جہاں کتابوں کی نمائش وخرید وفروخت، ثقافتی پروگرام، مزاحیہ مشاعرہ، تعلیمی پروگرام، تقریری مقابلہ، فلموں میں اردو ادب، غالب شناسی، تمثیلی مشاعرہ، وغیرہ کے ساتھ سرورق پر عالمی یوم مادری زبان کے نقوش کو ابھارنے والے مختلف زبانوں کے ہجائی حروف کی تصویریں سامنے آ گئی ہیں، وہیں ان موضوعات سے متعلق روداد اور مضامین سے مقصد پوری طرح واضح ہوجاتا ہے، مادری زبان سے متعلق محترم کریم صاحب کا فکرانگیز اداریہ چشم کشا اور بصیرت افروز ہے۔

صدر عالم گوہر کے ذریعے معروف نغمہ نگار یوگیش سے لیا گیا انٹرویو معلوماتی ہونے کے باوجود تشنہ ہے، یوگیش کے مشہور نغمات کا کچھ ذکر ہی نہیں ہے، ایسا لگتا ہے کہ کہیں کہیں سے اسے مختصر کردیا گیا ہے، اسی لیے سلسلہ دراز ہونے کے باوجود تسلسل برقرار نہ رہ کر سکتہ وارد ہوگیا ہے۔

مضامین اکثر معیاری ہیں مگر سب سے زیادہ جو مضامین پسند آئے وہ محترم خیال انصاری صاحب کا مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین سے متعلق معلوماتی اور متاثر کرنے والا ہے، اس میں انھوں نے بہت سی باتوں کے ذکر کے ساتھ ذاکر صاحب کی بچوں سے متعلق تحریروں کا بھی تعارف کرادیا ہے، اور ساتھ ہی ان کے اقوال زریں کو بھی حوالۂ قرطاس کردیا ہے، اس سے احقر نے استفادہ کیا، سکندر علی وجد پر مقبول احمد مقبول کا طویل مضمون بھی دلچسپ ہے۔ انھوں نے وجد صاحب کی نظموں کے ذکر اور اس کے اقتباس سے مضمون میں چار چاند لگادیے ہیں، بالخصوص وجد کے بقول ایلورا نظم لکھنے میں دو برس، اجنتا نظم انیس برس اور کاروان زندگی لکھنے میں تیس برس کا وقت لگا، جسے پڑھ کر ہوش اڑگئے، کہ واقعی ہمارے شعرائے کرام نے: کلام کو فن پارہ بنانے میں خون جگر صرف کیا ہے، وجد کی نظموں میں بڑی نغمگی ہے، مقبول صاحب نے بہت عمدہ مضمون قلم بند کیا ہے۔

چند مہینے قبل ہم سے بچھڑ جانے والوں میں خداداد خاں مونس کے بارے میں رؤف خیر صاحب نے معیاری مقالہ تحریر کیا ہے، خاں صاحب کی تاریخ نویسی وقطعۂ تاریخ نویسی نکالنے کے سلسلے میں اچھی معلومات فراہم کی ہے، مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر دلچسپ ہے۔

آخر میں رؤف خیر نے خود متوفی کا تاریخی قطعہ نکال کر ان کی روح کو خوش کردیا ہے، محمد یاسین گنائی کا مضمون 'اردو شاعری میں پھولوں کا تذکرہ' بہت خوب ہے، انھوں نے اشعار کے مہکتے گلدستے میں سجا کر نیز اردو دنیا کے کاتب کمپیوٹر نگار نے ان صفحات کو مضمون کی مناسبت سے پھولوں کی خوشنما زمین سے سجا کر کشمیر کے مغل گارڈن کی گویا تصویر کشی کی ہے۔

انصار احمد معروفی: مدرسہ چشمۂ فیض، اوری، مئو، یوپی

ماہ فروری 2018 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ اردو دنیا کے شمارے اپنے دامن میں ایسا مواد و مضامین لیے ہوتے ہیں جس سے اردو قاری کی تربیت ہوتی ہے۔ سولاپور کل ہند کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں اور رپورٹ پڑھنے کے بعد اردو والوں میں توانائی پیدا ہوگی۔ ایسے میلے منعقد کرنے سے اردو کا فروغ ہوگا۔ مدیر نے ہماری بات میں اردو مادری زبان کے تعلق سے فکرانگیز اور بصیرت افروز باتیں کی ہیں۔ مادری زبان سے ہی بچوں میں فطری صلاحیتیں و لیاقتیں ابھرتی ہیں۔ نسل نو کو اردو سے جوڑنا ناگزیر ہے۔ معروف نغمہ نگار یوگیش سے ملاقات میں کئی انکشافات ہوئے ہیں۔ ماضی میں لوگ اگر کہیں جاتے تھے یا گم ہوجاتے تھے تو بمبئی میں مل جاتے تھے۔ بمبئی معاش کا بڑا مرکز تھا۔ یوگیش کی زندگی کے نشیب وفراز سے ایک سبق ملتا ہے کہ مستقبل محنت، لگن اور شوق وذوق سے بنتا ہے۔ السنہ عالم کے مختلف خاندانوں کا ایک مختصر تعارفی جائزہ معلوماتی ہے۔ لسانی خاندانوں کی تفصیل ملتی ہے۔ غلام ربانی تاباں نئے معلومات سے پر مضمون ہے۔ دیگر مشمولات اپنے اندر جدت وندرت لیے ہوئے ہیں۔ ایسا شمارہ جس کے پڑھنے سے ہمہ قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور مختلف علوم وفنون سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کو ہندوستان و دنیا کے ہر اردو خاندان کو پڑھنا چاہیے۔ طلبا کے لیے تو ایک نعمت سے کم نہیں۔ اس کو پڑھ کر JRF-NET اور کئی دوسرے مسابقتی امتحانات میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر گوناگوں خوبیاں وصفات لیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، مورتاڑ، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد، تلنگانہ

رسالہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ شکریہ! رسالے کے بیشتر مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ اس شمارے سے ادارے کی دیگر سرگرمیوں کا بھی علم ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحی کی دلکش تحریر پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ موصوف نے کتاب میلے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کردی ہیں۔ مہاراشٹر کی طرز پر کاش کبھی بنارس کو بھی یہ اعزاز حاصل ہو۔

محمد جاوید: ریسرچ فیلو شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، یوپی

تازہ شمارے میں اردو کتاب میلے کی روداد بہت بہتر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں نہ صرف میلے کے ہر دن کے پروگراموں کی تفصیلات ہیں بلکہ سولاپور کی تاریخی وتہذیبی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔ میں قومی اردو کونسل اور متعلقہ وزارت کو اس میلے کے انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ٹی جے افضل بیگ: ریٹائرڈ ڈپٹی منیجر، کرناٹک ہاؤسنگ بورڈ، بنگلور

■

گفتگو

شعیب رضا فاطمی

سر سید
انگریزوں کے تعلیمی نظام کے قتیل تھے : رئیس خان پٹھان

محترم رئیس خان پٹھان نہ اردو کے ادیب ہیں نہ شاعر نہ یہ اردو کے استاد ہیں نہ کسی اردو ادارے میں نوکری کرتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی ایسے شہر سے بھی نہیں ہے جسے اردو کا شہر کہا جا سکے۔ گجرات کے احمد آباد میں پیدائش ہوئی اور زیادہ وقت ممبئی میں گزارا۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ ان کے خون میں شامل تھا لہٰذا نرملا دیش پانڈے کی ٹیم میں شامل ہو گئے اور عوام کی مشکلات کو حکومتوں کے سامنے لانے کی مہم کا حصہ بن گئے۔ اردو زبان سے شغف ہونے کے سبب گجرات میں پوسٹ کارڈ پر اردو میں پتے لکھ کر پوسٹ کرنے کی کامیاب مہم بھی چلائی جس کے نتیجے میں پوسٹ ڈپارٹمنٹ میں گجراتی کے ساتھ اردو جاننے والوں کی تقرری بھی ہوئی۔ گجرات فساد کے بعد انہوں نے اپنی مہم کا رخ بدلا اور مہلوکین کے ورثا، کو معاوضہ دلانے کے لیے سرگرم ہو گئے اور سیکڑوں لوگوں کی باز آبادکاری کرائی۔ آپ عوامی خدمات اور ملّی مسائل سے دلچسپی کے سبب فی الحال مرکزی وقف کونسل کے سرگرم اور فعال رکن ہیں گذشتہ دنوں جامع مسجد دھلی کے اردو بازار میں ان سے ایک کتاب کی دوکان پر ملاقات ہو گئی اور انہیں بے تحاشہ اردو کی کتابیں خریدتے ہوئے دیکھ کر ان سے گفتگو کا اشتیاق ہوا اور انہوں نے بھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ جامع مسجد کی چائے بھی پی گئی خوب گفتگو ہوئی اور اسی دوران انہوں نے بتایا کہ میں جب بھی دھلی آتا ہوں تو اپنے لیے بھی اور اپنے جیسے کئی دوستوں کے لیے اردو کی کتابیں لے جاتا ہوں۔ مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ خاص طور پر اردو کے ادیبوں کی سوانح عمری ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر کے مداح ہیں اور مولانا کے شہر میں قائم رضا لائبریری میں اکثر جاتے ہیں۔

رئیس خان پٹھان سے ہوئی گفتگو پر مبنی اس تحریر پر اپنی آرا، کا بھی اظہار کریں تاکہ اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے۔

میں گجرات میں رہتا ہوں اور ہندی بولتا ہوں انگریزی میں دفتری کام کرتا ہوں لیکن میری مادری زبان اردو ہے اور مجھے اس زبان پر اس لیے فخر ہے کہ میری ماں اردو میں مخاطب کرتی تھی اور مجھے میری ماں نے اردو زبان کی لوری اپنی پیاری آواز میں اس وقت سنائی تھی جس وقت میں صرف سن سکتا تھا اور کسی بھی زبان سے آشنا نہیں تھا۔'

محترم رئیس خان پٹھان اردو کے حوالے سے جب اپنے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کر رہے تھے اس وقت ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ میری ان سے یہ ملاقات دہلی میں ہوئی جہاں وہ سینٹرل وقف کونسل کی میٹنگ میں شریک ہونے آئے تھے۔ اور جامع مسجد کے اردو بازار میں اردو کتابیں خریدنے آئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس گجراتی مٹی کے اندر اردو کے لیے وافر نمی ہے اور پھر میں نے انھیں قومی اردو کونسل میں تشریف لانے کی دعوت دی جسے انھوں نے شرف قبولیت بخشی اور دوسرے دن حسب وعدہ فروغ اردو بھون تشریف لائے۔ یہاں وہ تقریباً 2 گھنٹے رہے اور دفتر کے ایک ایک کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد جب بیٹھے تو گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔

میں نے ان سے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ کو 'فروغ اردو بھون' آکر کیسا لگا؟ انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا کہ مجھے کہنا تو صرف یہ چاہیے کہ بہت اچھا لگا لیکن میں پہلے یہ کہوں گا کہ مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور بے حد افسوس ہوا کہ میں نے انھیں کونسل آنے کی دعوت ہی کیوں دی۔ اس ایک لمحے کے وقفے میں میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ میری اس غلطی کی وجہ سے اردو کے حوالے سے اس شخص کے جو جذبات تھے اسے کس قدر ٹھیس پہنچی ہوگی کہ اس نے برملا یہ کہہ دیا کہ مجھے یہاں آکر بے حد افسوس ہوا۔ بہر حال میں نے خود کو سنبھالا اور قومی اردو کونسل کی وکالت کرنے کے ارادے سے صحافیانہ لہجے میں پوچھا۔ مایوسی کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟ انھوں نے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضی کریم سے مخاطب ہوئے اور ان سے سوال کر دیا کہ آپ نے اپنی وزارت سے یہ درخواست کی کہ آپ کی یہ عمارت اتنے وسیع پیمانے پر کام کرنے کے لیے بہت چھوٹی ہے؟

میں نے سکون کی سانس لی اور ہمارے ڈائرکٹر کے

چہرے پر بھی مسکراہٹ کی لو تیز ہوگئی۔ رئیس خان صاحب کی گفتگو جاری تھی وہ کہہ رہے تھے۔ مجھے ایک عرصہ ہوگیا دہلی آتے ہوئے میں یہاں مہینوں رہتا ہوں اور مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اس سے قبل یہاں کیوں نہیں آیا۔ وہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ جس پیمانے پر یہاں اردو کا کام ہو رہا ہے اس سے چار گنا زیادہ جگہ اور دو گنا مزید اسٹاف کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم سمیت ہم تمام لوگ انھیں حیرت سے تک رہے تھے اور وہ بے دریغ بولے جا رہے تھے کہ آخر لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اردو زبان پوری دنیا میں لنگوا فرینکا بن چکی ہے۔ مجھے دنیا کے مختلف ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھے اس وقت بے حد خوشی ہوتی ہے جب آسٹریلیا میں، افریقہ میں، جاپان اور اٹلی میں بھی اردو بولنے والے ملتے ہیں اور وہاں وہ ہندوستان کے سفیر بن کر ہمارے کلچر، ہمارے تہوار، ہمارے رسم و رواج اور ہمارے بزرگوں کے کارناموں سے وہاں کے مقامی لوگوں کو روشناس کراتے ہیں۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ میں گجراتی ہوں اور گجراتی میری ریاست کی زبان ہے۔ ہندی بولتا ہوں کیونکہ یہ قومی زبان ہے لیکن اردو سے اس لیے محبت ہے کہ یہ میری مادری زبان ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی جب میں نے عمارت میں داخل ہوتے وقت سنگِ بنیاد کا پتھر دیکھا جس پر ہمارے سینئر لیڈر مرلی منوہر جوشی کا نام کندہ ہے۔ مجھے مزید خوشی ہوئی جب آپ لوگوں نے مجھے یہ بتایا کہ مودی جی کی حکومت میں آپ کے بجٹ میں اضافہ بھی کیا گیا اور کئی نئے پروجیکٹ بھی شروع ہوئے۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ آپ کے ادارے کی سب سے بڑی ضرورت بڑی جگہ کی ہے تاکہ دنیائے اردو کے سب سے بڑے اور فعال ادارے کو کام کرنے میں مزید آسانی ہو۔

مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی اور خوشی بھی کہ ایک طویل عرصے تک بی جے پی کی سیاست کے اندرونی حلقے میں رہنے والے رئیس خان اتنی فراخدلی سے اردو کے حوالے سے اتنی گہری باتیں کیونکر کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے لگے ہاتھوں یہ پوچھ لیا کہ آخر موجودہ حکومت اردو کے حوالے سے کیا سوچتی ہے؟

انھوں نے توقف کیا اور کہا کہ یہ نہایت سنجیدہ سوال ہے لیکن آپ خود اس کا جواب دے چکے ہیں کہ موجودہ حکومت نے آپ کے بجٹ میں اضافہ بھی کیا ہے اور کئی نئے پروجیکٹ کا بھی آغاز ہوا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ ہماری حکومت اردو کے تئیں کوئی مخاصمانہ جذبہ نہیں رکھتی۔ ہمارے وزیر اعظم ہمیشہ اپنی گفتگو میں ہندوستان اور اس کی تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہندوستان کی تہذیب یہاں کی تمام زبانوں اور بولیوں کے ذریعہ ہی پروان چڑھی ہے اور اردو ان زبانوں میں بے حد اہم زبان ہے۔ ہماری سرکار ان تمام ہندوستانی زبانوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے جن زبانوں کا رشتہ ہماری تہذیب اور ہماری مٹی سے ہے اور اردو میں تو بیشتر مذاہب کی مذہبی کتابیں بھی موجود ہیں۔ ایسے میں ہماری سرکار کیوں اردو کی ترقی کے راستے کو کھوٹا کرے گی۔

رئیس خان صاحب ایک سیاسی دانشور کی طرح مجھے جواب دے رہے تھے اور میں انھیں مسلسل گھیرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے ان سے پھر یہ پوچھ لیا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے اور اس میں حکومتوں کا کیا رول ہے؟۔ وہ مسکرائے اور اپنی کرسی کا رخ میری جانب کرکے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے الٹا مجھ سے سوال کرلیا۔ آپ کی عمر کیا ہے؟ میں نے کہا یہی پچاس برس انھوں نے کہا جب آپ اسکول سے ہوکر کالج میں آئے ہوں گے تقریباً 30 برس قبل اس وقت بھی اردو کے بڑے بڑے دانشوروں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ اردو مر رہی ہے اور بہت جلد اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں رہے گا لیکن آپ آج ہیں اور اردو کے اتنے بڑے ادارے میں عالمی طور پر اردو کے فروغ کا کام کر رہے ہیں۔ یہ زبان بہت میٹھی ہے اور اس کے چاہنے والے پوری دنیا میں ہر مذہب کے لوگ ہیں اس لیے اس زبان کا مستقبل بے حد تابناک ہے۔

دراصل ہم اپنی تاریخ نہیں پڑھتے اور پڑھتے ہیں تو اس سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔ سرسید احمد خاں نے جب علی گڑھ میں ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالی جس میں انگریزوں کی طرز پر تعلیم دی جائے گی اور اسے انگریزوں کی سرپرستی بھی حاصل رہے گی تو عوام کا کیا ردِ عمل تھا؟۔ اگر سرسید اس ردِ عمل پر خاموش بیٹھ جاتے اور اپنے مشن سے منحرف ہو جاتے تو آج ہندوستانی مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا؟ ہماری اردو زبان کہاں ہوتی؟ عوامی سطح پر عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن جو دانشور ہوتے ہیں، دانشمند ہوتے ہیں ملک اور عوام کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ اپنے مشن کو کبھی ادھورا نہیں چھوڑتے۔ ان کا مشن دوراندیشی کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ آنے والی صدی کو بھی صاف دیکھتے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ آج ہمارے درمیان کوئی سرسید جیسا دانشور اور دانشمند نہیں ہے ورنہ اقتدار اور اردو عوام کے درمیان اتنی دوری قائم نہیں ہوتی۔

میں پروفیسر ارتضی کریم سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ موجودہ حالات میں حکومت اور اردو زبان کے درمیان پل بن جائیں آپ دیکھیں گے کہ اردو زبان کا مستقبل کس قدر تابناک ہو جاتا ہے۔

دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے انھوں نے جانے کا قصد کیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے انھیں رسائل، کتابوں اور ادبی کلینڈر کا تحفہ دیا اور رخصت کیا۔

خان صاحب کی اس موثر اور سنجیدہ گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان اور اس کی ترقی کی کتنی شدید خواہش رکھتے ہیں وہ اردو کو مشترکہ کلچر اور ساجھی وراثت کا علم بردار سمجھتے ہیں ساتھ ہی وہ اسے ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا سفیر سمجھتے ہیں۔ ان کی اس فکر کو سلام ان کے اس جذبے کو سلام۔ 'اردو دنیا' کے قارئین کو ان کی گفتگو پر مبنی اس تحریر کو پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ بھی ان کے جذبے کو سلامت رکھنے کے لیے خدائے رب العزت کی بارگاہ میں دعا کریں۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

پس نوشت: خان صاحب کی گفتگو پر مبنی تحریر لکھ کر میں اردو دنیا کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی صاحب کے سپرد کرچکا تھا کہ اچانک آج صبح ان کا فون آیا۔ دعا سلام کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ میں ان کی گفتگو کو تحریری شکل میں شائع کر رہا ہوں وہ چونکے اور پوچھا کہ آپ نے اس میں اس قیمتی تحفے کا ذکر کیا یا نہیں جو مجھے ارتضی کریم صاحب نے دیا ہے۔ میں نے کہا ہاں! کتابوں کا ذکر تو میں نے کیا ہے۔ انھوں کہا نہیں فاطمی صاحب اس ادبی کلینڈر کا جو مجھے کل انھوں نے دیا...... میں نے حیرت سے پوچھا اس کا کیا ذکر کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہاں تو میں نے اس کلینڈر کو خاص اہمیت نہیں دی لیکن اپنی کوٹھی پر آکر جب اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ کلینڈر نہیں دستاویز ہے اردو ادیبوں کی یادوں کا دستاویز جنھیں ہم رفتہ رفتہ بھولتے جا رہے ہیں۔ بہتوں کو تو بھلا بھی چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے اردو کا ماضی اس کلینڈر کے ذریعے ہمارے گھروں کی دیواروں پر ہماری آنکھوں کے سامنے آویزاں کردیا ہے کہ ہم اس میں اپنے ماضی کے سرمائے کو دیکھیں اور حال کو تابناک بنانے کی جدوجہد کریں۔ اگر آپ اس کلینڈر سے متعلق میری یہ رائے اس میں شامل نہیں کریں گے تو مجھے افسوس ہوگا۔

■

Mr. Shoib Raza Fatmi
H.No-47/48- J. Block,
New Silampur
Delhi-110053

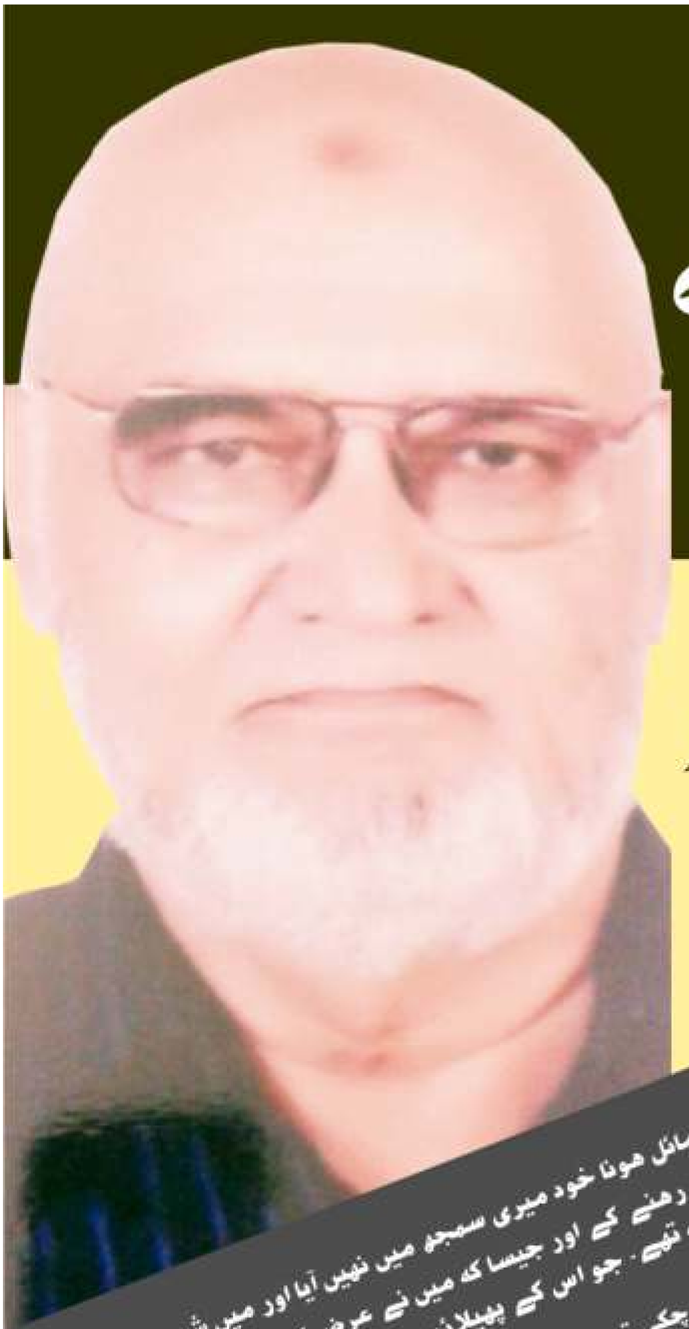

مضطر مجاز سے گفتگو

محبوب خاں اصغر

محبوب خاں اصغر: محترم۔ اول تو آپ یہ بتائیں کہ کیا علم و ادب کا روشن گہوارہ حیدرآباد دکن ہی آپ کا مولد و مسکن ہے؟

مضطر مجاز : جی ہاں۔ میرا مولد و مسکن حیدرآباد ہی ہے۔ میرے والد محترم اور ان کے آبا و اجداد بلند شہر یوپی کے باسی تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ برٹش انڈیا کی سروس میں آگئے۔ پھر جب گاندھی جی کی ترک موالات تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے بھی ملازمت چھوڑ دی اور نظام دکن کی ملازمت میں حیدرآباد چلے آئے اور اس طرح یہیں کے ہو رہے۔ میری والدہ حیدرآباد ہی کی تھیں۔ میرے والد کی پوسٹنگ بیدر میں ہوئی۔ اور میری تعلیم کا آغاز بھی بیدر ہی میں ہوا۔ قبل ازیں انھوں نے گھر ہی پر دو اساتذہ سے ریاضی، انگریزی، اردو اور فارسی کی تعلیم دلائی۔ پھر تعلیمی سلسلے کے آغاز پر مدرسہ فوقانیہ میں شریک کروایا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس وقت وہاں اسکول کے جو صدر مدرس تھے وہ انگریز تھے۔ انھوں نے میرا انگریزی کا امتحان لیا اور راست پانچویں جماعت میں میرا داخلہ ہوا۔ مگر سوئے اتفاق کہ ان دنوں بیدر میں طاعون پھیل گیا تھا اور ہماری کلاسیس شہر کے باہر ہونے لگی تھیں اور حالات دگرگوں ہونے لگے تھے۔ والد صاحب ہم لوگوں کو لے کر حیدرآباد آگئے اور چنچل گوڑہ کے اسکول میں شریک کیا گیا تھا۔ آصفیہ ہائی اسکول سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور آگے کی تعلیم کے لیے چادر گھاٹ کالج میں شریک کیا گیا جہاں محقق و دانشور ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب پرنسپل تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں دو سال گزرے۔ یہ دو سال میری زندگی میں اس اعتبار سے بھی اہم رہے کہ تہذیب وثقافت کا ایک اہم مرکز یعنی زور صاحب کی معیت میں کالج کا پورا عملہ طلبا کی کردار سازی اور شخصیت سازی میں منہمک تھا اور تمام طلبا کا تعلیمی سفر تہذیب کے اجالوں میں جاری تھا۔

> کامرس کا طالب علم ہونے کے باوجود میرا شعر و ادب کی طرف مائل ہونا خود میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں شہر کے ادبی حلقوں سے بھی وابستہ نہیں ہوا. سوائے جدید ادب سے چند دن وابستہ رہنے کے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ بھی ایک آدھ دھے کے اندر اپنی عمر کو پہنچ گئی. دراصل ان لوگوں کے اصول بہت انتہاپسندانہ تھے. جو اس کے پھیلانو میں ممدو معاون نہیں ہوئے.
>
> جب میں نے شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت تک ترقی پسند تحریک ختم ہوچکی تھی. جدید شاعری میں اینٹی غزل کا شہرہ شروع ہوا. یہ کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں تھی. ہمارے اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں. کھردرے لفظوں کا استعمال کوئی نئی بات نہیں. جیسے غالب نے دھول دھپاکا لفظ استعمال کیا اور دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں. خصوصاً سودا کے یہاں لیکن کچھ لوگ اس کا سہرہ جدید شاعری کے سر باندھتے ہیں.

م خ ا: کس جامعہ سے آپ نے گریجویشن کیا۔

مضطر مجاز : جامعہ عثمانیہ سے۔ گریجویشن کے دوران اردو کے معروف قلمکار مجتبیٰ حسین بھی اسی جامعہ میں ملے اور ان سے میری رفاقت نصف صدی کو محیط ہے۔ ادب کی ایک پوری کہکشاں ان کے ساتھ تھی وہ ایک ادبی انجمن کے جنرل سکریٹری تھے۔ وصف ذاتی کے سبب ان

کا طوطی اس وقت بھی بولتا تھا اور آج بھی بول رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے ملازمت اختیار کر لی اور اضلاع میں مارا مارا پھرتا رہا۔

م خ ا : آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا؟

مضطر مجاز : شاعری کا لپکا مجھے شروع ہی سے رہا۔ اس سلسلے میں میں نے کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں میں کسی سے جڑا نہیں رہا۔ ترقی پسندی ان دنوں اپنے دن پورے کر رہی تھی۔ البتہ کچھ احباب نے جدید ادب کی نیو رکھی۔ میں کسی حد تک اس سے وابستہ ہو گیا۔ مگر ایک دہے بعد اس نے بھی دم توڑ دیا۔

م خ ا : کامرس کا طالب علم ہونے کے باوجود اردو شعر و ادب کی طرف آپ کی رغبت کیسے ہوئی؟

مضطر مجاز : کامرس کا طالب علم ہونے کے باوجود میرا شعر و ادب کی طرف مائل ہونا خود میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں شہر کے ادبی حلقوں سے بھی وابستہ نہیں ہوا۔ سوائے جدید ادب سے چند دن وابستہ رہنے کے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ بھی ایک آدھ دہے کے اندر اپنی عمر کو پہنچ گئی۔ دراصل ان لوگوں کے اصول بہت انتہا پسندانہ تھے۔ جو اس کے پھیلاؤ میں مدد و معاون نہیں ہوئے۔

م خ ا : آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا

مضطر مجاز : جہاں تک میرا علم و ادب سے یا شاعری سے تعلق ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔ مجھے شعر و ادب سے دلچسپی اپنی ابتدائی جماعتوں سے رہی۔ وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں میں جو اردو کی کتابیں ہمارے نصاب میں شامل تھیں ان میں اسماعیل میرٹھی (شاگرد غالب) حامد اللہ افسر اور محمد حسین آزاد کی نظمیں بھی تھیں اور دیگر اساتذہ کی غزلیں بھی تھیں جو مجھے بآسانی یاد ہو جاتی تھیں اور اب تک بھی جستہ جستہ یاد ہیں۔ اس طرح شاعری میری گھٹی میں پڑ گئی اور اتفاق سے کسی استاد سخن سے واسطہ نہیں پڑا۔ چناں چہ میں نے کبھی کہا تھا۔

مضطر مزے کی بات تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ
آئے نہ آج تک کسی اُستادِ فن کے پانو

شاعری پڑھتے پڑھتے میں خود شعر کہنے لگا۔ ثانوی جماعتوں سے ہی اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ شدہ شدہ شاعری کا لہجہ بدلنا شروع ہوا۔ میرے عزیز دوست یوسف کمال نے جدید شاعری سے مجھے متعارف کروایا (خدا انھیں غریق رحمت کرے)

م خ ا : آپ نے شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت کون سی تحریک عروج پر تھی؟

مضطر مجاز : جب میں نے شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت تک ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی تھی۔ جدید شاعری میں اینٹی غزل کا شہرہ شروع ہوا۔ یہ کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں تھی۔ ہمارے اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ کھردرے لفظوں کا استعمال کوئی نئی بات نہیں۔ جیسے غالب نے ڈھول دھپا کا لفظ استعمال کیا اور دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصاً سودا کے یہاں لیکن کچھ لوگ اس کا سہرہ جدید شاعری کے سر باندھتے ہیں۔

م خ ا : جدید شاعری کو فروغ کب حاصل ہوا؟

مضطر مجاز : جدید شاعری کا فروغ معروف رسالے شب خون سے ہوا۔ ہمارے شمس الرحمن فاروقی نے اس تعلق سے بڑی محنتیں کیں۔ اس کی حیثیت ایک تحریک کی سی ہو گئی۔ لیکن وہ بہر حال کوئی تحریک نہیں تھی۔ فاروقی صاحب نے اس کو تحریک بنانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لیکن اتنا ہوا کہ ایک تازہ کاری کی فضا پیدا ہوئی۔ حیدرآباد میں خورشید احمد جامی اس کے بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنا لہجہ بدلا اور ان کے ساتھ کچھ نوجوان ہو لیے اور اس طرح حیدرآباد کی ادبی دنیا میں تازہ ہوا کے جھونکے چلنا شروع ہوئے۔ مگر اس کے بعد یہ سلسلہ رک سا گیا ہے۔

م خ ا : آپ کی دانست میں اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

مضطر مجاز : اس کا سبب کچھ اور نہیں خود اہل اردو اس کے ذمے دار ہیں۔ ایک بہت بڑا دھکا جو اردو زبان کو پہنچا وہ اردو زبان کا دیس نکالا ہے۔ شمال میں یہ بڑی تیزی کے ساتھ ہوا۔ اب تو یہ حال ہے کہ مشاعروں میں شاعر اور زیادہ تر شاعرات اپنا کلام ہندی رسم الخط میں لکھ کر سناتی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی کچھ کم یہی حال ہے۔ یہاں بھی نئی نسل اردو رسم الخط سے محروم ہو چکی ہے۔ چند سال پہلے تک جو مشاعرے ہوا کرتے تھے اب ان کا زور و شور نہیں رہا۔ پرانی نسل ختم ہو گئی۔ اور ان کی جگہ نئی نسل نے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ اس بات کی طرف اکبر الہ آبادی نے اشارہ کیا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اردو ذریعہ تعلیم ختم ہو گیا۔ اس طرح نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہو گئی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہزاروں کا مجمع اردو مشاعرے سننے کے لیے ٹوٹ پڑتا تھا اب مشاعروں کا وجود باقی نہیں رہا۔ اب لے دے کے دیوان خانوں کی محفلیں ہوتی ہیں۔ جہاں شاعر اور سامعین شاعر ہی ہوتے ہیں۔

م خ ا : خالص روایتی غزل سے جدید غزل تک کے سفر میں دونوں کے حسن کو آپ نے اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

مضطر مجاز : دراصل میں نے کلاسیکل ادب کا بہت مطالعہ کیا ہے اس لیے اس کا پرتو ظاہر ہے میری شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دقیانوسی شعر و ادب کا میں رسیا رہا۔ لیکن جہاں تک نئے خیالات اور نئی لفظیات کا تعلق ہے اسے بھی اپنایا۔ اقبال نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

بہ ہر بادے کہ آئی سینہ بکشائے
نگہ دار آن کہن داغے کہ داری

یعنی ہر وہ تازہ ہوا جو آئے اس کے لیے اپنا سینہ کھول دے لیکن اس داغ کہن کی نگہ داری کر جو تو رکھتا ہے۔ یہ گویا ہماری زندگی کا ماٹو رہا۔

م خ ا : کیا آپ شکیب اور ناصر کو جدید شاعری کا سرخیل مانتے ہیں؟

مضطر مجاز : شکیب جلالی اور ناصر کاظمی ہی نہیں حیدرآباد کے خورشید احمد جامی، سلیمان اریب اور مخدوم نے بھی جدید لہجہ اپنایا۔ مخدوم کٹر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنے طرز اظہار میں جدید تھے۔ جدیدیت ترقی پسندی کی طرح کسی فکر و فلسفے میں محدود نہیں ہے اس کا تعلق بڑی حد تک اظہار سے ہے۔ رشید احمد صدیقی سے لے کر کلیم الدین احمد نے غزل سے متعلق بالکل مختلف النوع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غزل کے ساتھ مشکل یہ

سوانحی کوائف

نام: سید غلام حسین رضوی
قلمی نام: مضطر مجاز
والد: سید زوار حسین رضوی
تاریخ پیدائش: 13 فروری 1935
تعلیم: بی کام (جامعہ عثمانیہ)
ملازمت: محکمہ امداد باہمی
عہدہ: ڈپٹی رجسٹرار موظف
تصانیف: موم سنگ، ایک سخن اور، ایک داغ نہاں (کلیات طلسم مجاز)
تراجم: نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلیات کا ترجمہ)، پیام مشرق، جاوید نامہ، ارمغان مجاز، پس چہ باید کرد (طلوع مشرق)
مصروفیت: اردو روزنامہ منصف (ادبی صفحہ کے نگراں)
پتہ: 16-1-14/38، سعید آباد، ذاکر حسین کالونی، حیدرآباد، موبائل: +919908800165

انٹرویو

ہے کہ شاعری کی باگ جوش کے الفاظ میں قافیہ کے ہاتھ میں بندھ جاتی ہے۔ اگر کسی قانون کے ذریعے غزل کہنے پر پابندی لگادی جائے تو اردو میں شاعری کے پنپنے کے آثار معدوم ہوجائیں گے۔ اردو میں چھپنے والے سارے رسالے اور دیوان معدوم ہوجائیں گے۔ دراصل غزل کا فارم اس قدر سہل الحصول ہے کہ ''ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی'' والی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو دیکھیے غزل دربغل صف میں کھڑا ہوا ہے۔ ایرانیوں نے بڑی حد تک غزل سے نجات حاصل کرلی ہے۔ وہاں اچھی اور سچی شاعری ہورہی ہے۔ اردو میں غزل گوئی نے جو صورت حال پیدا کردی ہے اس کا جوش نے بہت اچھی طرح اظہار کردیا ہے کہ

شعر کی کس طرح روشن ان کے سینوں میں ہو آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہے جن لوگوں کی باگ

آپ نے روایتی غزل اور جدید غزل کو میری اپنی شاعری

میں ہم آمیز کرنے کا سوال اٹھایا تھا۔ میری دانست میں اس کا تعلق ذہن کی آزادی سے ہے۔ اگر آپ کا ذہن اور فکر آزاد ہے تو بقول اقبال

قدم اندر تلاش آدمے زن
خدا خود در تلاش آدمے ہست

آپ آدمی کی تلاش میں نکل چلیے۔ آپ کو ہر قدم نیا طور اور نئی برق تجلی ملے گی۔

م خ ا : کیا مشاہدات اور تجربات کسی شاعر کے جذبے اور فکر کو شعور عطا کرتے ہیں؟

مضطر مجاز : مشاہدات اور تجربات فن کی آنکھ کھولنے میں بڑے مددگار ہوتے ہیں اور اس کے ذہن اور فکر کو شعور عطا کرتے ہیں۔

م خ ا : پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔ جوش کو غزل کی بے ربطی اور ریزہ خیالی کی شکایت رہی۔ فراق نے غزل کو انتہاؤں کا سلسلہ بتایا۔ یگانہ کی دانست میں شاعری کی بنیاد غزل ہی ہے۔ اس ضمن میں آپ کیا فرمانا چاہیں گے؟

مضطر مجاز : آپ کا سوال اپنی جگہ درست ہے۔ اور جن نقادانِ فن کے حوالے سے آپ نے سوال اٹھایا ہے اور ان کے ریمارکس کو کوٹ کیا ہے وہ بھی درست۔ البتہ جوش نے اگرچہ کہ غزلیں کہی ہیں لیکن وہ بڑی حد تک غزل کے مخالف ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا ہے کہ

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی کوئی کرکے تو دیکھے

غالب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ غزل قافیہ پیمائی نہیں بلکہ مضمون آفرینی کا نام ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مضمون آفرینی ہر کس وناکس کا کام نہیں۔

ان ہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

چونکہ یہ ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے رسالے غزلوں سے زیر بار رہتے ہیں اور مشکل ہی سے کوئی مضمون آفرینی نظر آتی ہے۔ اقبال نے اس تعلق سے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

بے محنت پیہم نہیں کھلتا جوہر
روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

غالب نے اس کی بڑی اچھی مثال پیش کی ہے۔ اس نے اپنے کلام کا بڑا سختی سے انتخاب کیا۔ یہاں تک کہ یگانہ نے طنز کیا کہ چند جز پر محیط آپ کا دیوان ہے جس میں مطلع بھی غائب ہے۔ اور مقطع بھی۔

م خ ا : حلقہ، حیدرآباد لٹریری فورم کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

مضطر مجاز : حلقہ کا آغاز بڑے زور وشور سے ہوا۔ جدید شاعری کے فروغ میں اس نے اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ لیکن وہ اردو زبان کے زوال کا شکار ہوا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اردو ذریعہ تعلیم کے زوال سے حلقہ کا زوال ہوا۔ ہوا یوں کہ نئی نسل اس تحریک سے وابستہ نہ ہوسکی۔ کیوں کہ وہ اردو زبان ہی سے نابلد ہوچکی تھی۔ چناں چہ جب حلقہ کے بنیاد گزار ختم ہوئے تو یہ تحریک اپنے آپ ختم ہوگئی۔ اس میں تھوڑا بہت دخل حلیفوں کے بنیاد گزاروں کا بھی ہے۔ یہ لوگ اپنے عقیدے میں انتہا پسند تھے۔ انھوں نے نئی نسل کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کی۔

م خ ا : آپ کا شمار کلام اقبال کے بہترین مترجمین میں ہوتا ہے۔ آپ اس فن پر کچھ کہنے کی زحمت گوارہ کرلیں۔

مضطر مجاز : دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمے کی حیثیت ثانوی اور ذیلی رہی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا میں علم وحکمت کا فروغ ترجمے ہی کا مرہون منت ہے۔ قدیم مصری ادیب ارارا سونب سے ارسطو تک اور سقراط سے سارتر تک کسی بھی عظیم فلسفی شاعر اور دانشور سے صرف اور صرف ترجمے کی مدد ہی سے ہم متعارف ہوسکے۔

م خ ا : ایک مترجم کو کیا مسائل درپیش ہوتے ہیں؟

مضطر مجاز : مترجم کی مشکلات یا مسائل تو چند در چند ہیں۔ اس کو اس شعور اور لاشعور کے درمیان دھندلکے سے اپنے آپ کو شعوری طور پر گزارنا پڑتا ہے جس سے فنکار وجدانی سطح پر بآسانی گزر چکا ہوتا ہے یہی وہ دشوار گزار راہ ہے جہاں مترجم فنکار کے تخلیقی سفر کے اسود و ابیض (لاشعور وشعور) سے اپنے آپ کو گزارتا ہے تو بقول ایذرا پاونڈ خود اپنی زبان کے نشیب وفراز سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ ترجمے کے عمل کی ایسی پیچ در پیچ جکڑ بندیوں کے باعث دنیا کا کوئی مترجم اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کا ترجمہ اکمل اور اصل کا نعم البدل ہے۔ ترجمہ زیادہ سے زیادہ اصل فن پارے کی تفہیم میں معاون ہوسکتا ہے لیکن اس کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ یہ محض ایک آئینہ ہوتا ہے، جس میں مترجم قاری کو فن پارے کے حسن اصلی کی جس قدر زیادہ جھلک دکھلا سکے اسی قدر کامیاب ہے۔ ترجمے کا نعم البدل بننا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ ہر زبان اپنا ایک پیچیدہ تشکیلی نظام رکھتی ہے جس میں اس کی قومی تاریخ کے زیر اثر مقررہ تہذیبی اقدار، سماجی تعصبات، مخصوص استعاراتی اور تلمیحاتی نظام اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں کے مقابل فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ سب سے

زیادہ ممکن العمل ہے کیوں کہ دونوں زبانوں کا تہذیبی، تلمیحاتی اور استعاراتی نظام بڑی حد تک مشترک ہے۔

م خ ا : اقبال کے کلام کا ترجمہ کب کیسے اور کیوں کیا۔ کیا آپ نے فارسی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی؟

مضطر مجاز : آپ کو تعجب ہوگا کہ فارسی کی تعلیم تیسری جماعت سے دی جاتی تھی۔ 'آمدن سی لفظی' فارسی گرامر کے لیے بہت اچھی کتاب تھی۔ میں نے میٹرک تک فارسی پڑھی اور بڑی جماعتوں میں گلستاں اور بوستاں (سعدی) پڑھائی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے میرے اساتذہ بھی بڑے قابل تھے۔ یوں فارسی میری گھٹی میں پڑ گئی پھر میں نے اردو کے ساتھ فارسی کا بھی مطالعہ شروع کیا۔ پھر میرے سر میں اقبال اور غالب کے منتخب کلام کے ترجمے کا سودا سمایا۔ اسی رواروی میں میں نے اقبال کے چھ مجموعوں میں سے چار مجموعوں کا منظوم ترجمہ کردیا۔ اس وقت تک میری شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ اسی عرصے میں غالب کی غزلوں کے کچھ تراجم بھی ہوگئے۔ بہرحال بقول اقبال۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

جاوید نامہ، پیام مشرق، ارمغان حجاز، پس چہ باید کرد (طلوع مشرق) اور چند فارسی منظومات کا منظوم اردو ترجمہ کلیات تراجم صدائے دل کشا کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ نقش ہائے رنگ رنگ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

م خ ا : اپنی شعری تصانیف کے نام بتائیں۔

مضطر مجاز : موم سنگ، ایک سخن اور ایک زخم نہاں اور دو سال قبل ایک کلیات طلسم مجاز کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اقبال کے تراجم اور بھی مترجمین نے کیے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس کا تفصیلی محاکمہ کیا ہے۔ میرا اس معاملے میں کہنا نامناسب ہے۔ جیسا بھی ترجمہ کیا ہے وہ شائع ہو چکا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اہل علم اس پر مناسب طور پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

م خ ا : ہم عصر شعرا کے مقابل آپ کا کلام ہند و پاک کے جرائد میں خال خال ہی شائع ہوا ہے۔ کیا آپ قاری تک اپنے کلام کی رسائی ضروری نہیں سمجھتے؟

مضطر مجاز : میں نے اپنی شاعری یا اپنے تراجم رسائل میں طباعت کے لیے نہیں بھیجے۔ اس میں میرے تساہل کا بڑا دخل ہے۔ لیکن بہرحال میری شاعری اور میرے تراجم کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

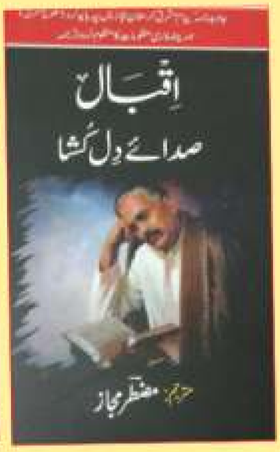

م خ ا : نثر اور نظم پر یکساں دسترس حاصل ہونے کے باوجود ہنوز کوئی نثری کتاب منظر عام پر نہیں آئی جبکہ شاعری کی کئی کتابوں کے آپ خالق ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

مضطر مجاز : نثری مضامین کا مجموعہ طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔ بہت جلد آجائے گا۔

م خ ا : آپ کی شخصیت سازی میں کن عناصر کا دخل رہا۔

مضطر مجاز : میں اپنے والد ہی کا احسان مند ہوں۔ پروفیسر سید عالم خوندمیری، پروفیسر سید سراج الدین، پروفیسر مغنی تبسم اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب جیسے جینیئس (Genious) کے علاوہ مصلح الدین سعدی ڈاکٹر یوسف کمال، یوسف الدین خاں (مرحوم) خورشید خضر مرحوم جیسے عالموں کی صحبتیں میرے لیے مفید رہیں۔

م خ ا : کن ممالک کے اسفار کیے؟

مضطر مجاز : میں بڑی حد تک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ لیکن کچھ کرم فرماؤں نے مجھے بیرون ہند بھی یاد کیا جہاں مجھے امریکہ کے طول و عرض نیویارک، نیو جرسی، شکاگو، کیلی فورنیا، لاس اینجلس میں شعر سنانے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ لندن، سعودی عرب، اور عرب امیریٹس میں بھی کچھ شعری محفلوں میں شرکت کی ہے۔ ہندوستان میں بھی ممبئی، پونا، بنگلور، شولاپور وغیرہ میں کچھ علم دوستوں نے یاد کیا۔ بعض جگہوں پر میں نہ جا سکا۔

م خ ا : روزنامہ منصف کے ادبی صفحے کے آپ نگراں ہیں۔ اس سے وابستگی کو کتنا عرصہ ہوا؟

مضطر مجاز : منصف سے وابستہ ہوئے ربع صدی ہوگئی۔

م خ ا : شعر و ادب کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو کوئی ایوارڈ ملا ہے تو بتائیں؟

مضطر مجاز : علاقائی سطح پر متعدد ایوارڈ ملے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا غالب ایوارڈ ملا۔ کل ہند اردو ادبی کانفرنس شولاپور کا قومی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

م خ ا : اپنے کچھ منتخب شعر سنائیں؟

م م:

کیا اعتبار پھک سے کسی روز بجھ ہی جائے
سورج کا کیا بھروسہ، دیوں کو جلائے رکھ

روز سحر ہوگی ہونے کو، روز شب آئے گی
کتنے سورج نکل چکے ہیں، صبح کب آئے گی

بینک کا کچھ بیلنس بڑھاؤ، زمین خریدو، گھر بنواؤ
مضطر مجاز صاحب تم کو عقل کب آئے گی!

ظلمت کدۂ ذہن میں جاری تھے مباحث
کچھ سوچ کے ہم لوگ ہی باہر نکل آئے

ہماری دنیا سے ہرگز نہ پٹ سکی مضطر
تھی اک تو عمر بہت، کچھ بنی ٹھنی بھی نہ تھی

سر میں بھینسوں کے بین کا سودا
لب پہ زاغوں کے نغمۂ خسرو

جو کہنا ہے کہہ دے کھل کر اپنی بات
بچی بات میں مضطر کاہے کا سنکوچ!

پھول کاغذ کے تو گل دان میں بس جائیں گے
گھر کے جو لوگ ہیں خوشبو کو ترس جائیں گے

سیم و زر کی بارش ہوگی سوکھ جائیں گی ندیاں
دل ویراں ہو جائیں گے اور گھر بھر جائے گا!

■

Mahboob Khan Asghar
11-3-192, Ground Floor , New Mallepally
Hyderabad - 500001 (Telangana)
Mob.:9246272721

عادل شاہی دور کے ملک الشعرا نصرتی اور ان کی شاعری

محمد غلام ربانی

اردو ادب کی تاریخ میں عادل شاہی عہد ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس وقت اردو ادب کو بہت ترقی ملی۔ اردو میں قصیدہ، مثنوی اور غزل کہی جانے لگی۔ داستانیں بھی لکھی جانے لگیں۔

عادل شاہی دور 1490 سے 1685 تک پھیلا ہوا ہے۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ ہے۔ وہ نہایت ذہین و محنتی اور با اخلاق تھا۔ وہ بیجاپور کا حاکم ہوا۔ محمود شاہ بہمنی کے اخیر وقت میں جب فسادات شروع ہوئے تو اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور دکن میں ان کی سلطنت شروع ہوئی۔

یوسف عادل شاہ علما، ادبا، اور فضلا کی کافی قدردانی کرتے تھے۔ وہ ایران، روم اور عرب کے علما و فضلا کو اپنے پاس بلاتے تھے۔ اس لیے ہر وقت قابل لوگوں کا مجمع اس کے دربار میں ہوتا تھا۔

یوسف کے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ بھی علم و ادب کے حامی تھے۔ وہ بھی شاعری کرتے تھے۔ فارسی میں اچھے شعر کہتے تھے۔ بانی سلطنت یوسف عادل شاہ سے لے کر اسمٰعیل عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی کی شاہی سرپرستی نے شعر و شاعری کو معاشرے میں مقبول بنا دیا۔

اس دور کے ابراہیم عادل شاہ (1580-1627) علم دوست آدمی تھے۔ عالموں اور صوفیوں کے قدردان تھے۔

اس علم دوستی کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"جب مغلوں نے گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو تباہ کرنا شروع کیا تو اس نے وہاں کے تمام باکمالوں کو بیجاپور میں آجانے کی دعوت دی اور ان کے آنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں دے کر اپنے آدمیوں کو اُن سلطنتوں کی طرف روانہ کیا۔ اس فیاضی نے بیجاپور کو علم و فضل کی تاریخ میں زندہ جاوید بنا دیا۔ مختلف ملکوں کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور اولیاء اللہ کی آمد نے بیجاپور کی زندگی میں ایک ایسی جان ڈال دی کہ شہر تقریباً ایک صدی تک علوم و فنون کا مرکز بنا رہا۔"

(محی الدین قادری زور: دکنی ادب کی تاریخ، اردو اکادمی، سندھ کراچی، جون 1960، ص 32-31)

عادل شاہی دور کے شروع میں فارسی دفتری زبان تھی۔ ابراہیم عادل شاہ اول نے فارسی کے بجائے ہندوستانی زبان کو دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر علی عادل شاہ اول نے فارسی کو دفتری زبان بنا دیا۔ جب ابراہیم عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس نے دفتروں میں دوبارہ اردو جاری کی۔ اس کے بعد عادل شاہ دور کے اخیر تک اردو زبان ہی حکومت کے دفتروں کی زبان رہی۔ ابراہیم عادل شاہ کی 'کتاب نورس' بھی اردو میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی خاندانی زبان بھی اردو ہو گئی تھی۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت ششم، 2004، ص 185)

علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں دکنی اردو زبان میں بہت اچھے اچھے شاعر ہم دیکھتے ہیں۔ ان میں ملا نصرتی کا پایہ بہت اونچا ہے۔ نصرتی نے اپنی مثنویوں گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ سکندری کے ذریعے دکنی مثنوی کو فارسی مثنوی کے ہم پایہ بنانے کی کوشش کی۔ اس نے اس عہد کی ثقافت کو خوبی سے اجاگر کیا۔

محمد نصرتی کی سال پیدائش معلوم نہیں۔ نصرتی کے والد کی بہادری اور وفاداری کی وجہ سے معاشرے میں باعزت سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نصرتی 'گلشن عشق' میں یوں لکھتا ہے:

کہ تھا پدر سو شجاعت مآب
قدیم یک سلح دار جمع رکاب

(نصرتی: گلشن عشق (بحوالہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نصرتی) کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعت ثانی 1961، ص 12)

نصرتی کے باپ نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا اچھا بندوبست کیا۔ چنانچہ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔

(ڈاکٹر سید اعجاز حسین: مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکادمی، سندھ، تیسرا ایڈیشن 1971، ص 31)

نصرتی حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلے سے مرید تھے۔ نصرتی علی عادل شاہ کا بچپن کا ساتھی اور مقرب ہونے کے باوجود اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اپنے کو بادشاہ کے شاگرد کی حیثیت سے بھی تعارف کراتا تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ کے استاد بھی خود کو شاگرد اور بادشاہ کو اپنا استاد لکھتے تھے۔

(دکنی ادب کی تاریخ، ص 52-51)

اگرچہ نصرتی خود کو بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا تھا، یہ ان کی شاہی عقیدت مندی اور انکساری تھی۔ نصرتی فطری شاعر تھا۔ (ڈاکٹر عبدالحق، نصرتی، ص 18)

اس کے بارے میں لکھتا ہے:

نہ کچھ شاعری کسب کا کام ہے
کہ یو حق کی بخشش تھے الہام ہے

(ایضاً)

نصرتی کو بیجاپور کے دربار میں جو شرف اور رتبہ حاصل تھا وہ کسی اور دکنی شاعر کو حاصل نہ ہوا۔ وہ ہر وقت علی عادل شاہ کے ساتھ رہتا تھا اور رزم و بزم دونوں میں ان کا شریک تھا۔

نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا اور ان تینوں سے فائدہ اٹھایا۔ (ایضاً)

عادل شاہی دربار سے نصرتی کو اپنی شاعری کی داد میں ملک الشعراء خطاب ملا۔

(نصیر الدین ہاشمی: دکن میں اردو، اردو مرکز، لاہور، چوتھی بار 1952، ص 175)

نصرتی کے دو حقیقی بھائی تھے۔ ہر ایک اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ شیخ عبدالرحمن سپہ گری میں، شیخ ملا نصرتی شاعری میں اور شیخ منصور علم و دعوت میں کمالات رکھتے تھے۔

شاعری میں ملا نصرتی کی شہرت اور ترقی نے ان کے کچھ حاسدین پیدا کر دیے تھے۔ حاسدین ان کو ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ نصرتی کو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان لوگوں کی دشمنی اتنی بڑھی کہ وہ لوگ نصرتی کو قتل کرنے پر آمادہ ہوگئے اور شہید کر دیا۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، ص 320)

ملا نصرتی کی سنہ وفات میں کافی اختلافات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ان کی وفات 1085ھ/ 1674 میں ہوئی۔ ان کے تاریخ وفات اس قطعہ میں بیان کی گئی ہے:

ضرب شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ
جا کے جنت میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے
یوں کہے نصرتی شہیدا ہے

1085

(ڈاکٹر عبدالحق، نصرتی، ص 15)

مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق نصرتی کی قبر بیجاپور کے نگینہ باغ میں ہے۔ یہ زمین گورنمنٹ ہائی اسکول کے احاطے میں ہے۔ (13)

ملا نصرتی نے شعر و شاعری کو اپنایا۔ باپ کی سپہ گری کے پیشہ کو چھوڑ کر شاعری ہی میں ڈوب گئے۔ مثنوی گلشن عشق (1067ھ/ 1665)، علی نامہ (1072ھ/ 1665)، تاریخ اسکندری (1083ھ/ 1672) اور دیوان نصرتی جس میں عقائد کے علاوہ غزلیات بھی ہیں، رباعیات، مخمس اور ہجو بھی ہیں، ان کی ساری زندگی کا نچوڑ ہیں۔

مثنوی 'گلشن عشق' لکھنے سے پہلے ہی نصرتی شاعری میں مشہور ہوگئے تھے۔ فارسی کے بجائے اردو میں مثنوی لکھنے کے لیے نبی ابن عبدالصمد نے نصرتی کو ترغیب دی۔ ان کا کہنا تھا:

دکھن میں توں ہے آج نصرت قریں
بلند شعر کے فن میں سحر آفریں
رکھے گا توں جس ٹھار اپنا قدم
سکت کسی جو واں آسکے مار دم

نصرتی نے حسب فرمائش فارسی مثنوی کے معیار پر دکنی خصوصیات سے ملا کر ایک نیا فنی معیار قائم کیا اور اردو دنیا کو 'گلشن عشق' جیسی مثنوی عطا کی۔

'گلشن عشق' عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سدرسین اور چپاوتی کا بھی ذکر ہے۔ اس کا آغاز دوسری مثنویوں کی طرح حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ نصرتی لکھتے ہیں:

صفت اس کی قدرت کی اوّل سراؤں
دھریا جس نے یو گلشن عشق ناؤں
کیا کہ گرم عشق کا تس ابحال
یو باغ آفرینش کا کپڑ یا جمال
عجب کوئی توں اے باغبان جہاں
کہ صفت میں تجھ چل سکے تا زباں
رنگارنگ جی گل بن باس ہے
اور ہر گل میں تجھ عشق کی باس ہے

نصرتی اس مثنوی میں اس زمانہ کے بادشاہ علی عادل شاہ کی طویل مدح کرتے ہیں۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

زمانے کا سر رشتہ سا ندیا تہیں
ٹوٹا چرخ کا ٹھاٹ یا ندیا تہیں
اتھا۔ عشق ذرہ ہوا تجھ تھے سور
ہر یک سے میں اپنا دکھا یا ظہور

نصرتی مناظر فطرت کو بھی اچھی طرح اجاگر کرتے ہیں۔ گلشن عشق میں باغ کے پرندوں کے غل مچانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہر مطرب یوں برگ کا دف بجائے
پپیا و کوئل نئی تان اچائے
سو سر خاں دیویں کھینچ سر خوش گلا
کریں کوک کرکے دلاں مبتلا
لگے ناچنے مہور ہو بے خبر
کریں حال نوٹن نکل رقص پر
ہو ادھر کبوتر کلاناں میں آئے
پراں جوڑ تالیاں سوں دستک بجائے

چاندنی رات کی جلوہ آفرینی یوں بیان کی ہے:

صفائی سوں چند نے کے چار و رخن
چھلکتی تھی بھوئیں صاف ابرک نمن
فلک اور زمین پراتھے نور میں
چھپیا تھا جتا مشک کافور میں

مثنوی میں حمد و ثنا، بادشاہ کی تعریف اور دوسرے لوازمات ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قصہ یا داستان جو بھی کہا جائے وہ شروع کرتے ہیں۔ منوہر اور مدمالتی کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے نصرتی لکھتے ہیں:

لب میں وہی یاد کرتیں بچن
اوٹھے بول یکایک سوتا جوں سپن
دھرے بانہہ اپس اپنے سینے سوں تنگ
کہ گلہار تھے وصل کے یار سنگ
چومے لب کا اینچہ ایں رنگ رس
شکر ہوئے تھے امرت تے شربت سرس

گلشن عشق کی کہانی کچھ یوں ہے کہ کنک گیر کا راجہ بکرم تھا۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ ایک روز راجہ کے پاس ایک فقیر آیا۔ کھانا مانگا۔ راجا کھانا لے کر فقیر کے پاس آیا۔ راجا کے بانجھ ہونے کی وجہ سے فقیر نے کھانا قبول نہیں کیا۔ اس سے راجہ کو صدمہ ہوا۔ کئی روز بعد راجہ نے فقیر کی تلاش شروع کی۔ پریوں کے ذریعے راجہ فقیر تک پہنچا۔ فقیر نے ایک درخت کا پھل رانی کو کھلانے کے لیے کہا۔ پھل کھانے کے نو مہینے بعد راجہ کو ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام منوہر رکھا گیا۔ اس لڑکے کو چودہ سال کی عمر میں ایک خطرہ ہونے والا تھا۔ اس لیے اس کی ایک محل میں پرورش کی گئی جہاں وہ آسمان نہ دیکھ سکے۔ جب لڑکا چار برس چار ماہ چار دن کا ہوا تو ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ چاندی

ایک رات پریوں نے اس محل کے پاس سے گزرتے ہوئے منوہر کو دیکھا اور پریاں آپس میں کہنے لگیں کہ اس کا جوڑا کہاں ملے گا۔ نو پریاں نو طرف تلاش میں نکلیں۔ ایک پری نے اس کا جوڑا مہارس نگر میں تلاش کیا۔ وہ تھی دھرم راج کی بیٹی مدمالتی۔ جس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اتنی حسین کہ چاند بھی شرماتے تھے اس کے حسن پر۔

ان دونوں میں جوڑا کیسا ہوگا یہ دیکھنے کے لیے پریوں نے منوہر کا پلنگ بھی ساتھ لے لیا۔ مدمالتی کے محل میں منوہر کا پلنگ رکھ دیا۔ جب دونوں بیدار ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا بہت تعجب ہوا۔ دونوں میں بات ہونے لگی اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہوگئے۔ ایک دوسرے کی انگوٹھیاں بھی بدل ڈالیں۔ پھر دونوں محبت کی باتیں کرتے ہوئے سوگئے۔ پریوں نے منوہر کو اپنے محل میں پہنچا دیا۔

مدمالتی کی محبت میں منوہر پاگل ہوگیا اور کھانا پینا بھی چھوڑ دیا جس سے اس کی صحت بھی خراب ہونے لگی۔ آخرکار منوہر اپنے عشق کو ظاہر کردیتا ہے۔ راجہ مہارس نگر کی جانب لوگوں کو پہنچتا ہے۔ لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ پھر منوہر راجہ کی اجازت سے مہارس نگر کے سفر پر نکلتا ہے اور جہاز سے چلتے چلتے مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔

جہاز ڈوبنے کے بعد وہ بہت مشکل سے کنارے پر آتا ہے۔ وہاں ایک بزرگ کی مدد سے ایک باغ میں پہنچتا ہے۔ جہاں ایک مکان پر ایک خوبصورت لڑکی ملتی ہے۔ اس لڑکی کا نام چنپاوتی ہے۔ راجہ سورل کی بیٹی اور مدمالتی کی سہیلی ہے وہ۔ ایک دیو اس کو اٹھا کر لے آیا ہے۔ منوہر دیو سے مقابلہ کرکے اسے ہلاک کرکے چنپاوتی کے ساتھ کنچن نگر پہنچتا ہے۔ جب چنپاوتی کی ماں منوہر کی داستان عشق سنتی ہے تو مدد کرنے کے لیے مدمالتی کو اپنے محل میں بلا لیتی ہے۔ جب منوہر اور مدمالتی دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے مل کر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ مدمالتی کی ماں لڑکی کے دیر سے آنے کی وجہ سے پریشان ہوکر چنپاوتی کے محل جاتی ہے۔ وہاں

اپنی لڑکی کی حالت دیکھتی ہے، تو ہاتھ سے گلاب کا پانی مدمالتی کے منہ پر چھڑکتی ہے اور منتر پڑھتی ہے جس سے مدمالتی طوطی کے روپ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ وہ اڑتے اڑتے ایک باغ میں اترتی ہے جہاں چندرسین سے ملاقات ہوتی ہے۔ چندرسین طوطی کو پاس رکھتے تھے۔ طوطی نے جب کھانا چھوڑ دیا تب چندرسین کے اصرار کے بعد طوطی اپنا حال بتاتی ہے۔ اس کے بعد چندرسین منوہر کے تلاش میں نکلتا ہے۔ طوطی کو مہارس نگر لے گیا۔ طوطی کا جادو اتارا گیا اور پھر وہ انسان ہوگئی۔ اب مدمالتی منوہر کے لیے بیقرار تھی۔ چندرسین کی کوشش سے راجہ سورل، چندرسین اور منوہر کے ساتھ مہارس نگر پہنچے۔ وہاں بہت دھوم دھام کے ساتھ دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چندرسین اور چنپاوتی کی شادی ہوجاتی ہے۔ چندرسین کچھ روز قیام کے بعد اپنے ملک واپس آجاتے ہیں۔

علی نامہ

نصرتی کی اور ایک مثنوی 'علی نامہ' ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی کے دور حکومت کے ابتدائی دس سال کے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اس کو شاہ نامہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کچھ باتیں تو اس میں ایسی ہیں جو تاریخ بیان کرنے سے قاصر تھی۔

واقعہ نگاری، منظرکشی میں نصرتی کی ہنرمندی جھلکتی ہے۔ یہ مثنوی رزمیہ مثنوی کی حیثیت سے بے نظیر ہے۔

نصرتی کی اور ایک مثنوی 'علی نامہ' ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی کے دور حکومت کے ابتدائی دس سال کے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اس کو شاہ نامہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کچھ باتیں تو اس میں ایسی ہیں جو تاریخ بیان کرنے سے قاصر تھی۔

تاریخ اسکندری

تاریخ اسکندری یا فتح بہلول خان کے نام سے نصرتی کی ایک اور مثنوی ہے۔ یہ 1672 میں مکمل ہوئی تھی۔ علی عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد جب اس کا پانچ سالہ بیٹا سکندر تخت پر بیٹھا تو فسادات شروع ہوگئے۔ اس وقت شیواجی نے قلعے پر قبضہ کرلیا تھا اور ملک کے امراء نے بھی اقتدار کے لیے سازشیں شروع کردی تھیں۔ بہلول خان کو شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے شیواجی کو شکست دی۔ ان واقعات کا تفصیلی بیان اس مثنوی میں ہے۔

مثنوی کے علاوہ نصرتی غزلیات لکھتے تھے۔ قصیدہ کے لیے بھی وہ مشہور تھے۔ ان کے گیارہ قصائد ہیں۔

نصرتی کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''اگر دکن کی یہ سلطنتیں باقی رہتیں اور دکنی اردو کا روپ قائم رہتا تو آج بھی نصرتی قدیم دور کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا لیکن ہوا یہ کہ مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی زبان دکنی ادب کی روایت پر غالب آگئی اور تیزی سے سارے برعظیم میں پھیل کر ادبی اظہار کا واحد معیار بن گئی۔ یہ تہذیبی و لسانی تبدیلیوں کی ستم ظریفی ہے جو تاریخ کے موڑ پر اکثر اس طرح اچانک آتی ہیں کہ بڑے درخت گر جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ چھوٹے درخت نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی ستم ظریفی نے نصرتی کو چھوٹا اور ولی کو بڑا بنا دیا۔'' (15)

نصرتی کے دور میں شعرا خصوصاً ہاشمی بیجاپوری نے نصرتی کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ نصرتی کی شاعری نے ان کو عادل شاہی دربار میں ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ وہ آج بھی عظیم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Ghulam Rabbani
Prof. Dept of Urdu
Dhaka University, Bengladesh

سید والا گہر کی تخلیق نادر
اوّلین اردو افسانہ

مظفر حسین سید

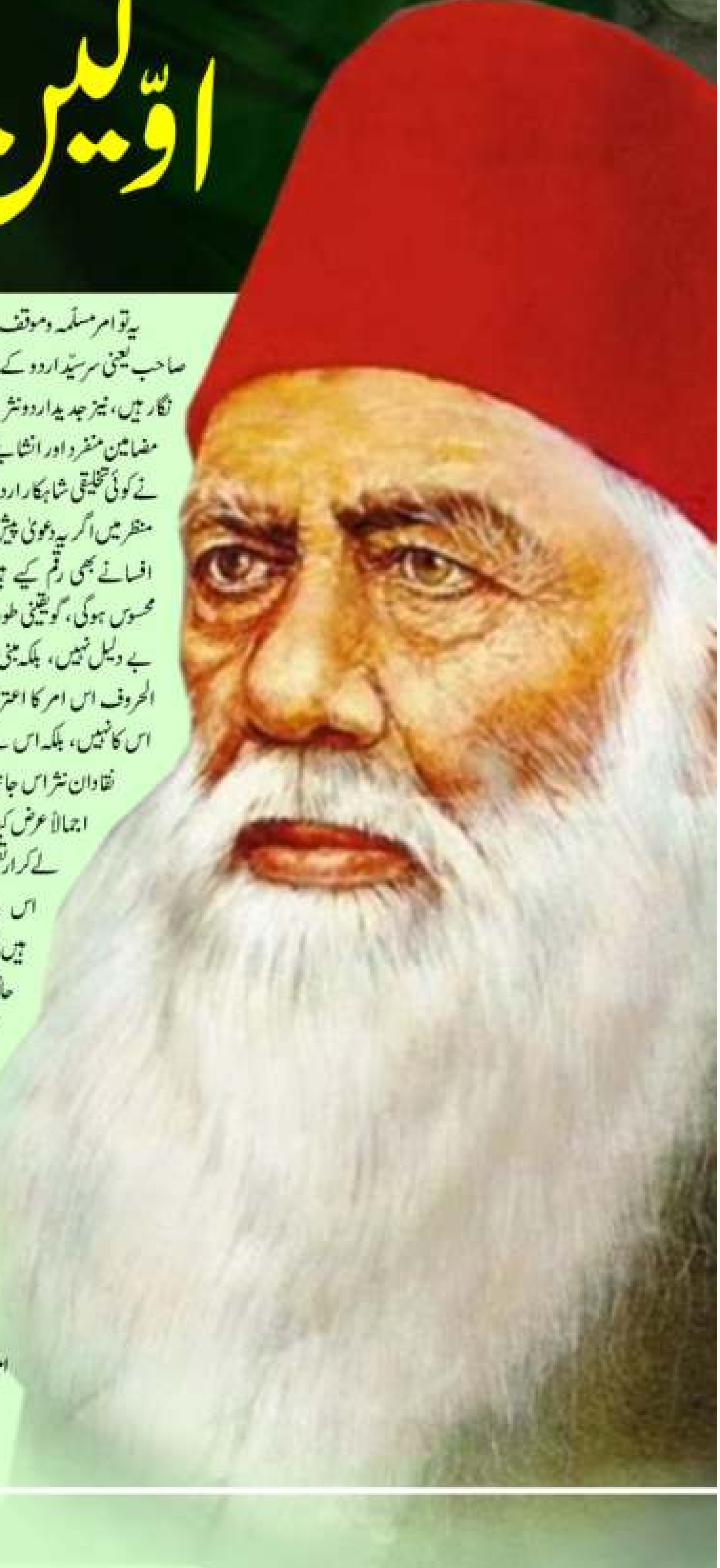

یہ تو امر مسلّمہ و موقف طے شدہ ہے کہ سید احمد خاں صاحب یعنی سر سیّد اردو کے اولین، باضابطہ و باقاعدہ نثر نگار ہیں، نیز جدید اردو نثر کے بانی و ترویج کار، ان کے مضامین منفرد اور انشائیے بے مثل ہیں، تاہم انھوں نے کوئی تخلیقی شاہکار اردو ادب کو نہیں بخشا۔ اس پس منظر میں اگر یہ دعویٰ پیش کیا جائے کہ انھوں نے چند افسانے بھی رقم کیے ہیں تو یہ بات غیر روایتی سی محسوس ہوگی، گو یقینی طور پر یہ انکشاف بے بنیاد اور بے دلیل نہیں، بلکہ مبنی بر صداقت ہے۔ اوّلاً راقم الحروف اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ انکشاف اس کا نہیں، بلکہ اس سے قبل کئی ماہرین سیّدیات و نقادان نثر اس جانب نشان دہی فرما چکے ہیں۔

اجمالاً عرض کیا جائے تو سید محمد عبداللہ سے لے کر ارتضیٰ کریم تک کئی حضرات نے اس جانب واضح اشارے کیے ہیں، اور انہی تحریرات سے تحریک حاصل کر، یہ کوتاہ قلم اس تسطیر حقیر کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔

دراصل سید صاحب کی کئی عدد انشائیاتی ترقیمات کو صنف افسانہ کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں 'گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی اور امید' کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ یوں یہ سرسری فیصلے ہیں اور اس بحث طلب موضوع پر کسی موقر ادیب نے مفصل، استدلالی گفتگو شاید نہیں کی ہے۔ سردست اس طولانی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے، یہ بیہ قلم، سید صاحب کی ایک نگارش 'گزرا ہوا زمانہ' کی افسانوی ہیئت و نوعیت پر گفتگو کی جرأت کر رہا ہے۔

راقم اگر یہ دعویٰ کرے کہ 'گزرا ہوا زمانہ' چند تکنیکی خامیوں کے باوصف ایک مکمل افسانہ ہے تو شاید یہ بعید از حقیقت نہ ہوگا۔ اقتضائے موضوع تو یہ ہے کہ گفتگو سے قبل ان کی اس نگارش علوی کی لفظ بہ لفظ قرأت کی جائے۔ مگر اوّل تو تنگیِ وقت اس کارلازم کی اجازت نہیں دیتی، دوئم غالباً حاضرین محفل میں سے بیشتر نے اس تحریر زیر بحث کا مطالعہ بارہا کیا ہوگا۔ لہٰذا یہ ناچیز، 'گزرا ہوا زمانہ' کی مکمل قرأت نہیں کر رہا ہے۔ صرف اس کی خوبی و خامی پر گفتگو کرنے کی جرأت رندانہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

زیر گفتگو نگارش، 'گزرا ہوا زمانہ' کا آغاز خاصے دلچسپ انداز میں ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، یہ ابتدائی سطور۔

''برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے، رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے، گھٹا چھا رہی ہے، بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے، مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر ہے، اور نہ اندھیری رات، بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے، ڈھکے ہوئے منہ پر، آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔''

اسی عالم میں اسے ایک خوبصورت دلہن نظر آتی ہے جب وہ دریافت کرتا ہے کہ وہ کون ہے تو وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ 'ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہے'۔ تب وہ سوال کرتا ہے کہ اسے تسخیر کرنے، یعنی حاصل کرنے کا بھی کوئی عمل یا نسخہ ہے، وہ جواب دیتی ہے، (خود مصنف کے الفاظ میں) "نہایت آسان، پر بہت مشکل کہ جو تسخیر کرنا چاہے وہ انسان کی بھلائی میں کوشش کرے، کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں، وہ جان و مال سے مساعی ہو۔"

یہ مُسکت جواب دے کر وہ حسینہ منظر نامے سے غائب ہوجاتی ہے، اور وہ پھر مایوس ہوجاتا ہے کہ وہ نکمّا نامراد ہے، کہ وقت گزر چکا اور اب تلافی مافات کا کوئی امکان نہیں۔ وہ بے چارگی سے چیخ اٹھتا ہے، (خود مصنف کے الفاظ میں) "ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے دس ہزار دینار، اسے دیتا، مگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔"

سید صاحب کی اس نگارش میں، ہنر تشکیل بھی ہے اور کمال بیان بھی، کہانی بہ خوبی منسوج ہے اور وہ تمام عناصر بھی یکجا ہیں، جو اس انشائیے کو افسانہ ثابت کرتے ہیں۔ اس میں کردار سازی بھی ہے اور کردار نگاری بھی۔ قصے کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے، جس نے ابھی اپنی عملی زندگی کی ابتدا بھی نہیں کی ہے، مگر وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ ایک عمر رسیدہ، ناکام، مایوس، ازکار رفتہ، ضعیف العمر شخص ہے، جسے اپنے تمام اعمال گزشتہ کی بے مصرفی اور عمر عزیز کے زیاں کا ادراک ہے اور وہ احساس پشیمانی کے وزن سے کچلا دبا، اس فکر میں غلطاں ہے کہ ساری حیات رائیگاں گئی، اور وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دے سکا، جو اس کے لیے باعث تفاخر ہوتا۔ اگر کبھی نیکی کے نام پر کچھ کیا بھی تو اخلاص نیت سے نہیں بلکہ محض رسمی طور پر۔ اور وہ بھی ذاتی فائدے کی غرض سے کبھی کوئی کام اجتماعی، معاشرتی فیض کے لیے نہیں کیا، نہ قوم کی فلاح کے لیے۔ مگر افسوس کہ اب عمر بیت چکی، عالم ضعیفی کا بھی مرحلۂ آخر ہے، اب نہ عالم شباب ہے، نہ قوت جسمانی، نہ توانائی عزم، نہ حوصلۂ زیست، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اب اس زمانے کی واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں، جو گزر چکا۔ تاسف، پشیمانی و احساس اتلاف کے اس عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی ہیں، اس کے بعد وہ بے ہوش ہوجاتا ہے اور جب ہوش میں آتا ہے تو خواب کی دنیا سے اپنی اصل زندگی میں واپس آتا ہے، جہاں مایوسی و نامرادی نہیں، بلکہ ایک خوبصورت، بھری پُری دنیا بانہیں پھیلائے کھڑی ہے، جسے وہ پا سکتا ہے اور اس خواب کے بوڑھے کے برخلاف، ایک بامراد انسان بن سکتا ہے۔

اس کی ماں جو پتہ نہیں کب سے اس کی اس حالت کا خاموش مشاہدہ کررہی تھی، اسے جگاتی ہے۔ بیدار ہونے کے بعد وہ جوان نوخیز والدہ کو اپنا خواب سناتا ہے، اور اس دلہن کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جسے وہ اپنی خیالی، گزری زندگی میں نہ پا سکا۔ تب اس کی ماں اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور تسلی دیتی ہے کہ اس کی زندگی تو ابھی شروع ہورہی ہے اس لیے اس خواب سے سبق حاصل کرے اور اس خوابی ضعیف العمر شخص کے برعکس، ایک سرخ رو، با مصرف زندگی گزارے، تاکہ اس کا شمار کامیاب و کامران، افراد فرید میں ہو۔

اس افسانہ نما قصے یا انشائیے کے مرکزی کردار کے بعد دیگر تمام کردار، یکے بعد دیگر سامنے آتے ہیں، کبھی اس کے والد اور والدہ نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تمھیں بہت سمجھایا، مگر تم کچھ سمجھے ہی نہیں، کبھی دیگر اعزہ، قرابت دار اور بہن بھائی نظر آتے ہیں، وہ بھی اس کے اعمال گزشتہ پر لعنت و ملامت کرتے ہیں اور کبھی اس کے احباب و رفقا نظر آتے ہیں، وہ بھی اسے احساس ندامت سے شرابور کرتے ہیں۔ یہ تمام کردار اپنی زیست تمام کر کے راہی ملک عدم ہوچکے ہیں اور ان سب کا ماتم کرنے کو مرکزی کردار، یعنی بوڑھا زندہ ہے۔ اور خود اس کا دامن مراد خالی ہے، وہ تہی دست ہے، سفر آخرت کے لیے اس کی خُرجی میں بطور زاد راہ کچھ نہیں ہے۔ ایک عجب بات یہ کہ سید صاحب کی اس نگارش میں اس ضعیف ستم زدہ کی شریک حیات یا اولاد کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، جو شاید اسے ہدف ملامت نہ بناتے کہ شریک سفر تھے، بلکہ کسی حد تک اس کی تشفی کی سعی کرنے کا فرض بھی انجام دیتے۔

کہانی بڑی سبک روی، مگر اثر آفرینی کے ہمرشتہ آگے بڑھتی ہے اور آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک خواب تھا اور جب مرکزی کردار نیند کی آغوش سے باہر آتا ہے، تو اسے علم ہوتا ہے، کہ جو دیکھا سو خواب تھا اور جو وہ اب بیان کرے گا وہ افسانہ ہوگا۔

'گزرا ہوا زمانہ' کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اس پنج ورقی تسوید میں افسانے کے تمام لوازمات موجود ہیں، نیز یہ ارقام تخلیقی ایک نمونہ ارفع ہے، ایک ایسے وصف کا مظہر، جو سید صاحب کی عام روش تحریر سے خاصے افتراق کا حامل ہے۔ ایک مخصوص نوعیت کی اس نگارش میں مسجع نثر بھی ہے، تخلیقی بیانیہ بھی، بشرط تلاش، تشبیہات، استعارات و تمثیلات بھی نظر آسکتی ہیں۔ ایک تخیلاتی فضا بھی ہے، کسی نہ کسی نہج پر شعور کی رو بھی اور خود کلامی بھی۔ مزید برآں ایک مبسوط تشکیلی خاکہ بھی اور واقعات کا تسلسل بھی، اور سب پر سوا یہ کہ یہ افسانہ، کہانی یا قصہ، بہ کمال مربوط و مبسوط ہے۔

جہاں تک منظر کشی کا سوال ہے تو سید صاحب اپنی اس تخلیقی نگارش میں بڑی مہارت فن کے ساتھ ایک موثر اور کامیاب مصوّر نظر آتے ہیں، بطور ثبوت یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا، کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی"۔

غالباً سید صاحب اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور تخلیقی نثر لکھ سکتے تھے، مگر ان پر سادگی و سلاست کا اصول حاوی تھا، اس لیے وہ غیر ارادی طور پر، حتیٰ کہ غیر شعوری طور پر بھی ایک حد سے آگے نہ جا سکتے تھے۔

ایک عمدہ، نمائندہ افسانے کے لیے اور کیا اوصاف درکار ہیں؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ سید صاحب، جس سادہ نثر کے بانی و مبلغ ہیں، یہاں اپنے اس طور خاص سے بھی گریزاں نظر آتے ہیں، ویسے وہ اپنی معتدد تحریروں میں اپنے مروجہ نہج سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں، تاہم یہ بحث دگر ہے۔

'گزرا ہوا زمانہ' کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا انداز، حسب روایت سیّدی خطیبانہ ہے، مقصد اصلاح و افادیت عمل تو پوری عبارت پر حاوی ہے ہی، لیکن بطور اتمام تحریر انھوں نے قوم کے نونہالوں کو خطاب کر کے، جو چار پانچ سطور رقم کی ہیں، وہ خالصتاً نصیحت آمیز ہیں، اگر انھیں حذف کر دیا جائے، تو نگارش مذکور، ایک مکمل اور کامیاب افسانہ ہے بقول شاعر، ع۔ تاہم یہ ادا ان کی دل آویز بہت ہے۔

ظاہر ہے کہ سید صاحب کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ وہ ایک افسانہ تخلیق کر رہے ہیں، جو ان کی پیاری زبان کا اوّلین افسانہ قرار دیا جائے گا۔ مگر وہ بڑے فطری انداز میں، لاشعوری طور پر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور نقطۂ عروج تک پہنچاتے ہیں۔

باور رہے کہ عہد سید میں صنف افسانہ نگاری کی کوئی تعریف متعیّن نہ تھی، کیونکہ نہ تو جب تک افسانے یا کہانی

کی باقاعدہ نمود ہوئی تھی، نہ نشوونما کی ابتدا، اور اس سبب نہ افسانے کی ساخت وعناصر تشکیلی کی کوئی صراحت تھی، نہ اس کی حدود وقیود طے ہوئی تھیں، اس لیے ان کی کسی تحریر کو جدید تکنیکی بنیادوں پر زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ لہٰذا یہ تمام گفتگو امکانات ورجحانات کو محیط ہے۔

دراصل سید صاحب، بنیادی طور پر مصلح قوم تھے، قلم کار اور ادیب بعدہ'۔ اس لیے ان پر ہمہ وقت، مقصدیت حاوی رہتی تھی اور تخلیق کار بنتے بنتے وہ واعظ و مبلّغ بن جاتے تھے۔ اگر ان پر افادیت کا نصب العین طاری نہ ہوتا تو شاید وہ ایک صاحب طرز تخلیق کار ہوتے۔ مگر پھر وہ سید عالی نہ ہوتے، تاریخ ساز نہ ہوتے، بلکہ خود تاریخ کا حصّہ بن کر رہ جاتے۔ اس ضمن میں معروف سیّد شناس، سید محمد عبداللہ نے بڑی دلچسپ رائے قائم کی ہے کہ، 'جن مغربی ادیبوں سے سرسید متاثر تھے، وہ پہلے ادیب تھے، پھر مصلح معاشرہ۔ اس کے برعکس سرسید پہلے مصلح قوم تھے، اس کے بعد ادیب یا کچھ اور۔''

ایک دلچسپ انکشاف اور کہ بعد از مطالعہ، ذرا غور کیا جائے تو یہ دلچسپ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ مولوی نذیر احمد کی شہرہ آفاق تصنیف 'توبتہ النصوح' میں ان کے مرکزی کردار نصوح کا جو خواب ہے، اس کی عبارت پر سید صاحب کی نگارش، 'گزرا ہوا زمانہ' کے اثرات صریح، نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، نہ صرف خواب کی مشاہداتی جزئیات، ایک دوسرے کے مماثل ہیں، بلکہ بعض مقامات پر انداز بیان اور الفاظ تک یکساں ہیں۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولوی نذیر احمد اپنے استاد معنوی، سید والا گہر کے زیر اثر تھے۔ اس لیے کہ 'گزرا ہوا زمانہ' پہلے اشاعت پذیر ہوا، جبکہ 'توبتہ النصوح'، کافی عرصے کے بعد شائع ہوئی۔ اور ایک 'توبتہ النصوح' پر کیا موقوف، اصلاحی ادب کو مالامال کرنے والی تمام تر تصانیف، زمانہ سیدی کے دوران یا اس کے بعد، ان کے زیر اثر ہی منظر عام پر آئیں۔

قبل از فرجام گفتگو ایک عرض اور کہ سید صاحب کی نگارش مذکور کی فہم کے لیے لازم ہے کہ ان کی دیگر تحریرات وخطبات کا بھی جائزہ لیا جائے، اور ان کی روشنی میں، ان کے نظریہ ارقام کی ترسیل، ابلاغ وتفہیم کی سعی کی جائے۔ اس ضمن میں ان کا ایک مختصر سا مضمون، 'ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا'، کا مطالعہ خاصا مددگار ثابت ہوسکتا ہے اور اس کا ایک اقتباس، اس باب میں دلیل بن سکتا ہے۔

''انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہیے کہ میں ایسا کوئی کام کر جاؤں، جس سے انسانوں کو، قوم کو، فائدہ پہنچتا رہے۔ مثلاً کسی علم کا ایجاد کرنا، کسی ہنر کا پیدا کرنا، یا کوئی ایسی بات ایجاد کرنا، جو لوگوں کو فائدہ مند ہو۔ یہ خیال بہت درست ہے، کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے، خصوصاً جبکہ وہ ذات بھی فنا ہوجائے، بلکہ زندوں کے لیے اور ایسوں کے لیے ہے، جن کا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہے گا۔''

اب یہ سوال بے معنی ہوجاتا ہے کہ سید صاحب کی نگارش 'گزرا ہوا زمانہ'، یا اس قبیل کی بعض دیگر نگارشات پر مقصدیت کیوں حاوی ہے؟ ان کا انداز خطیبانہ کیوں ہے؟ دراصل ان کا نصب العین، اصلاح قوم، فلاح معاشرہ اور تبلیغ اخلاق وآداب تھا۔ یہ ان کے تئیں ایسے طے شدہ مقاصد واہداف تھے، جن سے وہ بہ حالت مجبوری یا برائے تفنّن طبع بھی منحرف نہ ہوسکتے تھے۔ وہ کچھ بھی لکھتے، کہتے یا کرتے، مگر تمام تر سرگرمیوں کا مرکز و محور، وہی ماحصل جلیل ہوتا، جس کا تعین انھوں نے، بہ دقاقت و شدّت کر رکھا تھا اور جس کا حصول ہی ان کا مقصد حیات تھا۔ ان کے نزدیک تحریر، تقریر، تحریک سب بطور آلات عمل، محض وسیلہ تھے، ذریعہ تھے، راہ مبین طے شدہ تھی اور نشان منزل دور سہی، ان کے روبرو تھا۔

اس حقیقت کے بیان کی حاجت نہیں کہ سید صاحب خود اپنی اسی عبارت پر عمل درعمل کی روشن مثال ہیں، ایک طرح سے یہ چند سطریں ان کا منشور زیست ہیں، جسے انھوں نے جی کر دکھایا، اور بعد وفات مر کر، امر ہو کر بھی دکھا دیا۔ یہی ان کی عظمت ہے۔

چونکہ یہ امر طے شدہ ہے کہ سرسید، اولاً مصلح قوم و معاشرہ ہیں، نقیب انقلاب تعلیمی ہیں، اس کے بعد ادیب، قلم کار یا کچھ اور ہیں اس لیے ان کے اس حق کو تسلیم کرنا لازم ہے کہ وہ اپنی ہر تحریر کو افادیت ومقصدیت کا حامل بنائیں اور اپنی رہبرانہ روش پر قائم رہیں۔ حسب عادت ان کا وطیرۂ ناصحانہ، طریق واعظانہ، نیز انداز خطیبانہ، ان کی ہر تحریر پر حاوی ہوتا ہے اور نگارش ھذا میں بھی اس کا اثر ونفوذ عیاں ہے۔

یاد رہے کہ سید صاحب اردو میں نثر جدید کے بانی ہیں، وہی باقاعدہ مضمون نگاری کے موجد ہیں اور وہی اردو میں صنف انشائیہ متعارف کرانے کے بروصف لائق تحسین ہیں، اور جب ان کے چند انشائیے، اپنی صنفی حیثیت سے بلند ہو کر افسانے کی شکل اختیار کرتے نظر آتے ہیں، تو وہی اُردو کے اوّلین افسانہ نگار بھی قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ اس راقم ناچیز کے حاصل مطالعۂ ذاتی کی اساس پر اس کی حقیر رائے ہے، جس پر تصدیق، اتفاق، اختلاف، واسترداد کے تمام تر امکانات موجود ہیں اور یوں اہالیان علم کے لیے بحث وتمحیص کے تمام راستے وا ہیں۔ ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

ادب میں کوئی شے جامد نہیں، کوئی تحقیق حرف آخر نہیں، نیز ادبی مباحث کا کبھی اختتام نہیں ہوتا۔ یہ گفتگو، ابھی ناتمام ہے کہ اردو کا اوّلین افسانہ کون سا تھا۔ اگرچہ تقریباً متفقہ طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پریم چند کا افسانہ' دنیا کا سب سے انمول رتن'، اردو کا اوّلین، باضابطہ افسانہ ہے اور ان کا مجموعہ، 'سوز وطن' اردو کا اوّلین افسانوی مجموعہ۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پریم چند سے قبل بھی راشد الخیری جیسے اصلاحی ادیب اور سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری جیسے رومانوی قصّہ گو موجود تھے، بعض نقاد علامہ راشد الخیری کی نگارش 'نصیر اور خدیجہ' کو اردو کا اوّلین افسانہ قرار دیتے ہیں، بہر کیف یہ بحث اپنی جگہ، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سید صاحب، ان سب کے اکبر اور زمانی اعتبار سے یکے از اوّلون وسابقون ہیں۔ لہٰذا یہ کم سواد یہ نتیجہ برآمد کرنے کی جسارت علمی کرتا ہے کہ ان کی نگارش ارفع واعلیٰ، 'گزرا ہوا زمانہ'، ایک تقریباً مکمل افسانہ ہے اور وہی اردو کا اوّلین افسانہ بھی ہے۔

صراحت لازمی

ادبی دیانت داری کے تقاضے کے تحت یہ صراحت واجب و لازم ہے کہ سید والا کی نگارش، بعنوان 'گزرا ہوا زمانہ' اولاً 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' (18 اپریل 1873) میں شائع ہوئی۔ اس پر بطور مصنف سید احمد س ایف۔ درج ہے۔ اور وہاں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کہ مخفف، سی۔ ایف سے کیا مراد ہے، خود سید والا نے اس امر کی وضاحت نہیں کی ہے۔ چونکہ اولاً بطور مصنف سید احمد صاحب کا نام ہے اس لیے مضمون کو بلاتامل ان کی تحریر (یا تخلیق) تسلیم کرلیا گیا، نیز بعد ازاں یہ نگارش ان کے 'مجموعہ مقالات' (مولف: مولوی اسماعیل پانی پتی) اور متعدد انتخابات میں من وعن شائع ہوئی، اور سرسید کے نام سے ہی شائع ہوئی۔ حتیٰ کہ نصاب میں بھی شامل ہے۔ خود سید والا کی کسی تشریح، نیز کسی محقق کی مستند دریافت کی غیر موجودگی میں راقم الحروف نے بھی اسے بلا تردد، سید والا کی تحریر تسلیم کرلیا۔ نیز ان کا مخصوص انداز تحریر، اسلوب بیان ورنگ عبارت بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ 'گزرا ہوا زمانہ' قلم زاد سید ہے، خواہ اس کا مرکزی خیال ماخوذ ہو۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں تحقیق مزید کے در وا ہیں۔ (م۔ ح۔ س)

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road
Dariya Ganj, New Delhi - 110002
Mob.:9818827853
E-mail.: syedmh92@yahoo.com,
syedmh92@gmail.com

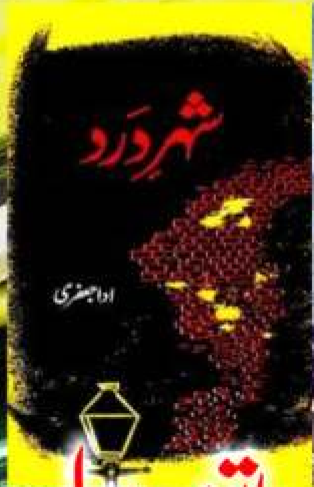

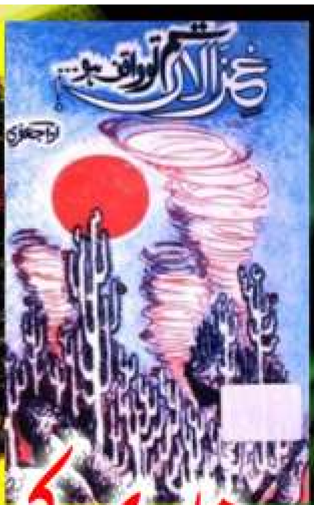

محی بخش قادری

جدید اردو شاعری کی خاتونِ اوّل

ادا جعفری

اردو شعر و ادب کی آبیاری میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ جب ہم اس حوالے سے اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو تین ایسی خواتین کا نام نمایاں نظر آتا ہے جنھوں نے اپنی انفرادیت کی بنا پر افسانہ، شاعری، اور تنقید میں اپنا منفرد شناخت نامہ مرتب کیا ہے۔ افسانوی ادب میں عصمت چغتائی، دنیائے نقد میں ممتاز شیریں اور شاعری کی دنیا میں 'ادا جعفری' موٴخر الذکر کو اردو شاعری کی خاتون اول بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا شمار بہ اعتبار طویل مشق سخن اور ریاضت فن کے صف اوّل کی معتبر شاعرات میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا دورانیہ کم و بیش 75 برس پر محیط ہے جس میں انھوں نے گاہے گاہے یا بطرز تفریح طبع نہیں بلکہ تواتر و کمال احتیاط کے ساتھ شاعری کی ہے اور جو کچھ کہا وہ شعور حیات اور دل آویزی فن کے سائے میں کہا۔ حرف وصوت کی شگفتگی اور فکر و خیال کی تازگی کے ساتھ کہا۔ فکر و جذبے کے اس ارتعاش کے ساتھ کہا جس کی بدولت ان کا شعر ان کی شخصیت کی شناخت بن گیا

ادا جعفری کی پیدائش اتر پردیش کے اس بدایوں ضلع میں ہوئی جو اپنی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ روایات کے مطابق اس شہر کو بدھ نام کے ایک راجہ نے بسایا تھا اور شروع میں اس کا نام بدھ موٴیا بیداد موٴ تھا جو بعد میں مسلمان سلاطین کے زمانے میں بدایوں ہوگیا۔

ادا کی پیدائش 22 اگست 1924 کو ہوئی۔ خاندانی نام عزیز جہاں ہے جب تین سال کی تھیں کہ والد مولوی بدرالحسن کا انتقال ہوگیا۔ پرورش ننھیال میں ہوئی۔ والدہ نے پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ گھر (بڑی حویلی) میں ہی ایک کتب خانہ تھا جس میں ڈھیروں اردو فارسی اور انگریزی کتابیں تھیں اور جہاں سب کو جانے کی اجازت نہ تھی لیکن چپکے چپکے ادا نے اس کتب خانے سے استفادہ کرنا شروع کردیا۔ اسی زمانے میں محض نو برس کی عمر میں ادا نے پہلا شعر کہا۔ بقول ادا جعفری انھوں نے ابتدائی نظموں پر اثر لکھنوی سے اصلاح لی لیکن یہ سلسلہ بہت مختصر رہا۔ اس کے بعد کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اختر شیرانی کو بھی ان کا استاذ کہا ہے۔

عزیز جہاں نے تیرہ برس کی عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کردی تھی۔ وہ 'ادا بدایونی' کے نام سے شعر کہتی تھیں جو اختر 'رومان' شاہکار اور 'ادب لطیف' میں شائع ہوتا رہا۔ ان کی شادی 1947 میں نورالحسن جعفری (لکھنؤ) سے انجام پائی۔ شادی کے بعد ادا جعفری کے نام سے لکھنے لگیں۔ تقسیم ہند کے بعد ادا اپنے شوہر کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئیں۔ ان کے شعری مجموعے شہر درد کو 1968 میں آدم جی ادبی انعام ملا۔ شاعری کے بہت سے مجموعہ جات کے علاوہ جو رہی سو بے خبری رہی کے نام سے اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی 1995 میں لکھی۔ 1991 میں حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغہ امتیاز سے نوازا۔

ادا جعفری کے شعری سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے عروج کے وقت ہوا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم کی ہنگامہ خیز فضا اور پاک و ہند کی تحریک آزادی کا پرآشوب ماحول تھا۔ یہ فضا بیسویں صدی کی پانچویں دہائی یعنی 1940 اور 1950 کے درمیانی عرصے سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ یہ دہائی سیاسی اور سماجی اور شعری و ادبی، ہر لحاظ سے پرشور و ہنگامہ خیز دہائی تھی۔ تاج برطانیہ ہندوستان سے اپنا بستر بوریا سمیٹ رہا تھا اور نئی بساط سیاست بچھ رہی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ ایسے حالات میں ان کی شاعری دلوں پر اثر کرتی تھی اور ضمیر کو جھنجھوڑ دیتی تھی۔ ان کا باقاعدہ شعری سفر 1937 سے 2015 تک جاری رہا۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

میں ساز ڈھونڈتی رہی 1950 (شاعری)، شہر درد 1967 (شاعری)، غزالاں تم تو واقف ہو 1947 (شاعری)، ساز سخن بہانہ ہے 1982 (ہائکو)، حرف شناسائی (شاعری)، موسم موسم (کلیات 2002)، جو رہی سو بے خبری رہی 1995 (خودنوشت)، غزل نما (تنقید و ترتیب)

پہلا مجموعہ 'میں ساز ڈھونڈھتی رہی' 1950 میں منصۂ شہود پر آیا۔ حالانکہ یہ 1947 میں مرتب ہو چکا تھا لیکن تقسیم ہند کی وجہ سے بعد میں شائع ہوا۔ یہ ادا کی اپنی پہچان کا پہلا لمحہ تھا اور کچھ نقادوں کی نظر میں اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی جرأت اظہار۔ نظم 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' کا آخری ٹکڑا کچھ یوں ہے:

میں ساز ڈھونڈتی رہی
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظام نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی، خزاں بھی بیت جائے گی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظام نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں؟؟

اس شعری اسلوب کو ادا جعفری کے ناقدین نے جدید شاعری کی سمت ادا جعفری کا پہلا قدم تسلیم کیا ہے۔ ممتاز ادیب قاضی عبدالغفار نے ادا جعفری کے پہلے شعری مجموعے 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' کے دیباچے میں اس عہد کی ادبی اور فکری صورت حال کے تفصیلی تجزیے کے ساتھ ساتھ ادا جعفری (جو اس وقت ادا بدایونی کے نام سے معروف تھیں) کی شعری شخصیت پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں لکھنے والی دیگر باشعور اہل قلم خواتین کے ساتھ ادا بدایونی کو بھی عہد جدید کے ان قلم کاروں میں شمار کیا ہے جو اپنی تحریروں کے ذریعے مطالبۂ حقوق انسانیت کے لیے آواز بلند کر رہی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جدید اردو ادب و شعر کے معماروں کی صف اول میں ادا بدایونی کا اور کلام بہت نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں قدیم اور فرسودہ نظام زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے۔ ان کی آواز سراپا طلب اور احتجاج ہے۔ ان کے انداز بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔"

جس دور میں 'میں ساز ڈھونڈھتی رہی' منظر عام پر آیا وہ دور ادب میں ترقی پسند تحریک کے عروج اور 'حلقہ ارباب ذوق' جو آگے چل کر جدیدیت میں تبدیل ہو گیا کے متضاد رجحانات کا دور تھا۔ ترقی پسند تحریک کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف تھا۔ یعنی یہ کہ ادب کو سیاسی اور سماجی نظام کے تابع ہونا چاہیے۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند ادیبوں اور شاعروں کے دو واضح گروپ سامنے آئے تھے۔ ن م راشد اور میراجی کا جدید شعری اسلوب، جوش کی سیاسی، اختر شیرانی کی رومانی، احسان دانش کی سماجی اور حفیظ جالندھری کی اسلامی اور تاریخی نظمیں مختلف حلقوں میں مقبول و معروف تھیں۔ فراق، فیض، اختر الایمان، مجید امجد، مجروح سلطان پوری، ساغر، عدم، مجاز، جذبی، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری یہ سارے نام شعری افق پر اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ دمک رہے تھے۔ ایک تیسرا اسلوب فکر علامہ اقبال کے شعری سرمائے کی شکل میں موجود تھا۔ شاعری اپنی بھرپور اسلامی روح اور شکوہ بیان کے ساتھ، دلوں کو فتح کر چکی تھی۔ ناقدین نے یہ مانا کہ ان تینوں شعری اسالیب اور نظریات حیات کے درمیان ادا جعفری کے لیے کسی خاص رنگ پر نگاہیں ٹھہرانا آسان نہ تھا۔ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' میں شامل شاعری میں زندگی کے جمالیاتی رُخ کی کشش اور رومان کی دنیا سے فطری لگاؤ کے باوجود، تخیل اور محسوسات کے رنگ تو نمایاں ہوئے ہیں مگر ان کا اپنا شعری لہجہ متعین نہیں ہو پایا ہے۔

1968 میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام 'شہر درد' شائع ہوا۔ 'شہر درد' میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی مشہور زمانہ غزل بھی اسی مجموعے میں شامل ہے جسے پٹیالہ گھرانے کے نامور گائیک امانت علی خاں مرحوم نے گایا ہے:

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی، برسر الزام ہی آئے
لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے
کیا راہ بدلنے کا گلہ ہمسفروں سے
جس رہ سے چلے تیرے در و بام ہی آئے
تھک ہار کے بیٹھے ہیں سر کوئے تمنا
کام آئے تو پھر جذبہ ناکام ہی آئے

ادا جعفری کی شاعری میں کچھ ایسے الفاظ بھی جا بہ جا ملتے ہیں جو موجودہ زبان و اسلوب میں شامل نہیں سمجھے جاتے جیسے پوچھو ہو، چلے ہے لگے ہے، کہیو وغیرہ۔ یہ الفاظ ان کے ثقافتی پس منظر اور ان کے داخلی آہنگ کی ابتدائی صورت گری کے دیرپا اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اک وحشت جاں ہے کبھی صحرا کبھی زنداں
اک عالم دل ہے کہ بہاراں سا لگے ہے
دل کے لیے بس آنکھ کا معیار بہت ہے
جو سکہ جاں ہے سربازار چلے ہے

ادا جعفری پر گفتگو کرتے ہوئے عالمی تناظر میں کہی گئی ان کی مشہور نظم 'مسجد اقصیٰ' کا ذکر ناگزیر ہے۔ تاریخ شاعری میں دو مسجدوں پر شاہکار نظمیں کہی گئی ہیں۔ ایک اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' اور دوسری ادا جعفری کی نظم 'مسجد اقصیٰ'، ڈاکٹر اسلم فرخی، ادا جعفری کے شعری اظہار کے تعلق سے اپنی ایک تحریر میں رقم طراز ہیں:

1967 میں وہ یادگار نظم 'مسجد اقصیٰ' شائع ہوئی جس نے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اردو ادب میں مسجدوں کے حوالے سے دو شعری شہ کار وجود میں آئے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' فلسفیانہ اساس میں ڈوبی ہوئی، زمان و مکاں کے اسرار ہویدا کرنے والی، سطوت ماضی کی بازیافت اور مستقبل کا ایک خوف ناک نظارہ پیش کرتی ہوئی۔ مگر 'مسجد اقصیٰ' ذاتی جذبات، واردات سے لبریز وہ فریاد ہے جسے سن کر عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں۔ ایسی پر اثر اور سراپا آرزو نظمیں ہمارے ادب میں خال خال ہیں جن میں فریاد، آرزو، تقاضا سبھی کچھ موجود ہو۔ ادا جعفری کے یہاں جس نسائی حسیت کی جھلک ابتدا سے ملتی ہے وہ اس نظم میں اپنے عروج پر آگئی ہے۔"

اس نظم میں مسلمانوں سے تخاطب کا انداز یہ ہے:

تم تو خورشید بکف تھے سرباز اروفا
کیوں حریف نگہ چشم تماشا نہ ہوئے
کس کی جانب نگراں تھے کہ لگی ہے ٹھوکر
تم تو خود اپنے مقدر کی عناں تھامے تھے
اس صحیفے میں ندامت کہیں مفہوم نہ تھی
اس خریطے میں ہزیمت کہیں مرقوم نہ تھی
محترم ہے مجھے اس خاک کا ذرہ ذرہ
ہے یہاں سرور کونین کے سجدے کا نشاں

اور پھر نظم کے آخری حصے میں کہتی ہیں:

تم نے کچھ قبلہ اول کے نگہباں سنا؟
حرمت سجدہ گہ شاہ کا فرمان سنا؟
زندگی مرگ عزیزاں کو تو سہ جاتی ہے
مرگ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹی
جس میں جل جائے تو خاکستر دل بھی نہ ملے

اس نظم میں جس طرح ادا جعفری نے 'مرگ ناموس' کو ملت کی زبوں حالی کا اصل سبب قرار دیا ہے یقیناً اسی ادراک کو ڈاکٹر اسلم فرخی نے ادا کے نسائی شعور کا نقطہ عروج قرار دیا ہے۔

ادا جعفری کی کلیات 'موسم موسم' جس میں ان کے پانچ شعری مجموعے اور غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل حصہ بہ عنوان 'سفر باقی ہے' شامل ہے کے مطالعے کے بعد یہ صاف ہوجاتا ہے کہ ان کی شاعری مدھم مدھم سرگوشی اور خودکلامی کی کیفیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کے بیانیہ لہجے میں قدیم وجدید لفظیات کے امتزاج سے ایک ایسا شعری اسلوب وجود میں آیا ہے جس کی جھلک اس وقت کی شاعرات میں صرف زہرہ نگاہ کے یہاں ملتی ہے۔ یہی اسلوب ادا جعفری کی شناخت ہے۔ اس شناخت کو انھوں نے اپنے طویل شعری سفر میں مستقل برقرار رکھا ہے۔ یہ آسان نہیں تھا۔ جتنا مشکل شناخت قائم کرنا ہے اس سے کہیں مشکل شناخت کو برقرار رکھنا ہے۔ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' سے 'حرف شناسائی' اور 'سفر باقی ہے' تک تمام شعری پیرایوں میں ان کا لہجہ، غم ذات اور غم کائنات سے مانوس و آشنا اور زندگی کے جمالیاتی رنگوں سے سرتیں کشید کرنے کے باوجود پرسوز نظر آتا ہے۔

1987 میں شائع ہونے والی کتاب 'غزل نما' اور ان کی سوانح 'جو رہی سو بے خبری رہی' کو ان کے نثری اظہار کا بے مثل نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ 'غزل نما' اردو غزل کے قدیم اساتذہ کے مختصر حالات زندگی اور انتخاب کلام پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جو انجمن ترقی اردو کے ماہنامے قومی زبان کے لیے قلم بند کیے گئے تھے اور دسمبر 1983 سے ہر ماہ تواتر کے ساتھ 137 اشاعتوں تک شائع ہوتے رہے۔ قدیم غزل گو شعرا کے حالات زندگی کے بنیادی نکات رقم کرتے ہوئے اور ان کے نمونہ ہائے کلام کو منتخب کرتے ہوئے ادا جعفری نے بحیثیت ایک تخلیق کار اور شاعرہ، جن معیارات کو پیش نظر رکھا ہے اس سے خود ان کے ذوق شعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جولائی 1995 میں شائع ہونے والی ادا جعفری کی خودنوشت 'جو رہی سو بے خبری رہی' ایسی تحریر ہے جو اردو زبان میں معیاری نثر کی تازہ تر لطافتوں اور دلکشی کے ساتھ سپرد قلم کی گئی ہے۔ اور ایک خاص زمانے کی تہذیب، طرز فکر اور طرز معاشرت کی عکاس ہے۔ تقسیم ہند سے قبل کے مسلمان معاشرے کی دیرینہ روایات کے ساتھ پروان چڑھنے والی ادا جعفری سفر در سفر، مختلف معاشروں کے تنوع اور رنگارنگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے زندگی کی حرارتیں کشید کرتی رہی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تجربات نے کس کس طرح ان کی شاعرانہ حسیت کی تشکیل کی۔ شاعری میں انھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی لیکن اس کے باوصف انھوں نے زیادہ تر نظموں کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ ادا نے اردو اصناف کے علاوہ جاپانی صنف سخن ہائیکو پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان ہائیکو کا مجموعہ 'ساز سخن' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں بھی ادا جعفری نے حیات وکائنات کو موضوع بنایا ہے۔ اور کامیابی سے اردو ہائیکو کہا۔ ان کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ انہی کی رہنمائی و پیش قدمی نے نئی آنے والی پود کو حوصلہ دیا ہے اور نئی منزلوں کا پتہ بتایا ہے بلاشبہ وہ اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادا جعفری کی شخصیت میں کتابوں بچوں اور مظاہر فطرت سے محبت اور قربت کا احساس بچپن ہی سے شامل رہا ہے۔ زندگی کی انھیں خوشیوں کو ترتیب دے کر وہ اپنے اداس دل کے بہلاوے کی صورتیں پیدا کرلیتی تھیں۔ ابتدا میں انھوں نے کاغذ اور قلم تھام کر ہر گزرنے والے لمحے کا حساب درج کرنا شروع کردیا وہ بڑی باقاعدگی سے روزنامچہ لکھا کرتی تھیں۔ اپنی ڈائری میں اپنے روز وشب کا احوال لکھتے ہوئے وہ اپنے جذبے کی کہانیاں رقم کیا کرتی تھیں۔ یہ ڈائری اگر آج دستیاب ہوتی تو اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ ابتدائی زندگی میں وہ کن کن جذبات و احساسات سے دوچار رہی تھیں۔ مگر 1947 کے فسادات میں یہ ڈائری کہیں گم ہوگئی اور یوں ادا جعفری کے اظہار کے اوّلین مراحل سے شناسائی کا ایک در ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ ادا کی شاعری کا مجموعی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان کی شاعری میں جو تصویریں ہیں وہ نہ کسی چوپالی ہیں اور نہ کسی محل سرا کی۔ جو ترقی پسندی کی خاص پہچان ہے بلکہ یہ دلوں کے اندر کی، ذات کے نہاں خانوں کی تصویریں ہیں جو جدیدیت کی پہچان ہیں لیکن پھر بھی یہ زندگی کے خاکے ہیں۔ کچھ ان کے انفرادی اور کچھ انسان کی اجتماعی زندگی کے، کچھ دکھ سکھ ان کے اپنے ہیں اور کچھ سماج کے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کہنا درست ہوگا کہ ادا جعفری کا شمار ان شاعرات میں نہیں کیا جاسکتا جو نسائیت کے اظہار کے لیے نمائش اور نعرہ بازی کی حد تک اتر آتی ہیں اور 'کیا ہے شعر کو پردہ سخن کا' کے پردے اور حجاب سے بے نیاز ہوجاتی ہیں جو شاعری کی روح کہلاتا ہے۔ وہ جدید شاعرہ ہونے کے باوجود اس 'جدیدیت' سے دور ہیں جس کا چیستانی عمل جدیدیت کو لے ڈوبا۔ ان کا شمار اردو کے ان شعرا و شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی

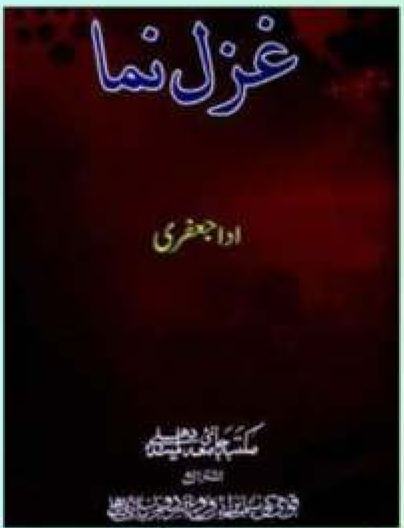

پسند تحریک کے ساتھ باقاعدہ وابستگی نہ رکھتے ہوئے بھی ترقی پسند شاعری کی۔ ان کی شاعری میں نسائی تشخص کی بازیافت بھی کلاسیکی روایتوں کے احترام کے ساتھ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ادا جعفری نے بحیثیت ایک نسوانی وجود، جن دو متضاد زمانوں کو دیکھا، برتا اور جھیلا ہے ان کے اہم تجربات کو بہت سی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ اپنی شاعری میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔ ادا جعفری کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند موضوعات اور نظم کے پیرائے کو اپنا کر شاعری کے جدید تجربات کی طرف خواتین کو متوجہ کرنے کا کام کیا۔ مضمون کو جناب سحر انصاری کے اقتباس پر سمیٹتا ہوں انھوں نے اپنے مضمون 'ادا جعفری: ایک مطالعہ' میں اظہار خیال کیا ہے:

''ادا جعفری کی شاعری مجموعی طور پر اقدار حیات اور انسان دوستی کی شاعری ہے اور ان کے پہلے شعری مجموعے سے لے کر 'ساز سخن بہانہ ہے' تک ان کے اس مسلک شاعری میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ زندگی کی صداقتوں کو شعری پیکروں میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں اور اس ضمن میں انتہا پسندی کا شکار کبھی نہیں ہوئیں۔ ادا کی شاعری میں زندگی کے کئی روپ اور زاویے ہیں جن میں بنیادی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔''

12 مارچ 2015 کو مختصر علالت کے بعد 90 برس کی عمر میں ادا جعفری کا کراچی پاکستان میں انتقال ہوگیا۔

ابھی تو خواب چہرے سب دعا کی رہ گزر میں تھے
کہانی ختم کیسے ہوگئی آغاز سے پہلے

■

Mohi Bakhsh Qadri
6/48, Veneet Khand, Gomti Nagar
Lucknow - 226010 (UP)
Mob.:09839018959
mohibaksh@gmail.com

نعمان قیصر

زاہدہ خاتون شروانیہ کے تخلیقی وجود سے مکالمہ

انیسویں صدی کے اوائل میں جن شاعرات نے اردو کی نظمیہ شاعری میں کمال حاصل کیا، ان میں ایک نمایاں نام ز۔خ۔ش۔ یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نثر کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا، لیکن ان کے تخلیقی وفور کا احساس ان کی نظمیہ شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور انتہائی بالیدہ ہے۔ ان کو اسلامی اقدار و روایات سے دلی لگاؤ ہے، جس کا احساس ان کی نظموں کی قرأت سے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں مضامین کا تنوع بھی ہے، عصری حسیت اور عصری مسائل وموضوعات سے ہم آہنگی بھی ان کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری میں نسائی حسیت کا بھر پور اظہار بھی ملتا ہے۔ زاہدہ خاتون شروانیہ غالباً اردو کی پہلی شاعرہ ہیں جو اپنی مثبت فکر اور منفرد طرز ادا کی وجہ سے اتنی نمایاں ہیں کہ انھیں نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سرسری ذکر کر کے گزرا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں ان کی تاریخی نظموں نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ انیسہ ہارون شروانی کے لفظوں میں 'دنیائے ادب میں انھوں نے تہلکہ مچادیا تھا۔ پردۂ خفا میں رہنے کے باوجود وہ اپنی نغمہ باریوں سے عالم کو مسحور و متحیر کرتی رہیں۔'

ز۔خ۔ش۔ کا اصل نام زاہدہ خاتون شروانیہ ہے، لیکن رسائل وجرائد میں زخ ش کے نام سے ہی ان کی تخلیقات منظر عام پر آئیں اور ادبی دنیا میں بھی وہ اپنے اسی مخفف نام سے جانی جاتی ہیں۔ ان کا شاعری کا ذوق فطری تھا۔ دس برس کی عمر سے ہی انھوں نے اشعار کہنا شروع کر دیا تھا اور اس وقت کے معیاری رسائل وجرائد 'زمیندار' لاہور 'خاتون' علی گڑھ 'تہذیب نسواں، اخبار النساء، شریف بی بی، نظام المشائخ، کہکشاں 'لاہور' اور 'ستارۂ صبح' وغیرہ میں ان کی شعری اور نثری کاوشیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ انھوں نے شاعری میں پہلے 'گل' اور بعد میں 'نزہت' تخلص اختیار کیا۔ ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی ز۔خ۔ش۔ کا گھر کے ادبی ماحول سے متاثر ہونا فطری تھا۔ ان کی بڑی بہن احمدی بیگم اور چھوٹا بھائی احمد اللہ خان کو بھی شعروادب سے خاص دلچسپی تھی۔ شاعری میں احمدی بیگم 'نکہت' تخلص کرتی تھیں جبکہ احمد اللہ خان کا تخلص 'حیران' تھا۔ زخ ش کے والد نواب مزمل اللہ خاں شروانی، سرسید احمد خان کے افکار ونظریات سے نہ صرف متفق تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں سرسید کے متبعین میں سے تھے اور ان کے تعلیمی مشن کے فروغ میں عملی طور پر دلچسپی بھی لیتے تھے۔ نواب مزمل اللہ خان بھی شعروادب کا گہرا ذوق رکھتے تھے اور فارسی میں اشعار بھی کہتے تھے۔ اس وقت کے فارسی کے معروف شاعر آغا کمال الدین ہجر سے آپ مشورۂ سخن کرتے تھے۔

8 دسمبر 1894 میں بھیکم پور علی گڑھ (اتر پردیش) میں زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت ہوئی اور زندگی کی بہت کم بہاریں دیکھنے کے بعد محض 27 سال کی عمر میں 2 فروری 1922 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے ادبی کارنامے کی مدت صرف سترہ سال پر محیط ہے۔ لیکن سترہ برس کی قلیل مدت میں انھوں نے جو ادبی اور تخلیقی سرمایہ چھوڑا ہے، اس کے مطالعے سے ان کی افتادِ طبع اور ان کی تخلیقی اٹھان کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'آئینہ حرم' اور 'فردوس تخیل' ان کے مجموعہ کلام ہیں۔ 'رویائے صادق' کے نام سے انھوں نے ایک مثنوی بھی تحریر کی ہے۔ 'دیوان نزہت' (نزہت الخیال) کے نام سے ان کا دیوان بھی منظر عام پر آیا۔ 'قید فرنگ، گنج شہیداں، اضغاث احلام، عالم نسواں میں انقلاب، بہنوں سے دو دو باتیں، مہذب بہنوں سے خطاب، اور چیست یاران طریقت، بعد ازیں تدبیر ما! آئینہ حرم، تصادم رواج وشرع، دام فریب، قدوم میمنت لزوم، اور شمر کا شجر کا خطاب' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ 'زخ ش کی نظمیہ شاعری روایتی اسلوب کی پابند ضرور ہے لیکن اس میں مضامین کی رنگارنگی بھی ہے، اس میں عصری مسائل وموضوعات کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔

تعلیم کا فقدان اور دقیانوسی خیالات کے عام ہونے کی وجہ سے انیسویں صدی میں شعروادب سے خواتین کی دلچسپی معیوب تصور کی جاتی تھی، جبکہ اخبارات ومیگزین میں ان کے نام کی اشاعت ناپسندیدگی پر محمول کی جاتی تھی۔ میرے خیال سے اسی لیے زاہدہ خاتون شروانیہ نے اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے مخفف نام (ز۔خ۔ش۔) کا سہارا لیا۔ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رجحان

عام نہیں تھا۔ والدین اپنی بچیوں کے لیے گھریلو تعلیم کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ لیکن ز۔خ۔ش کے والد نواب مزمل اللہ خاں ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے اور وہ تعلیم کی اہمیت وافادیت سے بھی واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی بچیوں کی تعلیم وتربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ز۔خ۔ش کے لیے فارسی کی تدریس کے لیے ایران سے ترک وطن کر کے آنے والی باکمال شاعرہ فرخندہ بیگم طہرانیہ کی خدمات حاصل کی گئیں، جبکہ صرف ونحو، حساب اور فقہ کی تعلیم مولوی محمد اسرائیل سے حاصل کی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مولوی سید احمد ولایتی جیسے متبحر عالم کا انتخاب کیا گیا۔

انتہائی کم عمر پانے کے باوجود ز۔خ۔ش نے نظمیہ شاعری کا جو قیمتی اثاثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔ ان کی وقیع شعری خدمات کو جمیل الدین عالی نے کرامت سے تعبیر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔ 'اس دور جہالت کی ماری ہوئی حیرت انگیز خاتون نے صرف 28 برس کی عمر پائی اور اتنا کچھ لکھ گئی۔ یہ شاعرہ قدرت کی ایک کرامت کہی جا سکتی ہے۔ (اور میں معجزہ کہتے کہتے رک گیا ہوں) سچ تو یہ ہے کہ اس کے والد نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی (علی گڑھ کے حوالے سے ہندوستان کی بہت مشہور شخصیت) نے گھر میں ہی ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر رکھا تھا۔

'آئینۂ حرم' زاہدہ خاتون شروانیہ کا اولین شعری مجموعہ ہے، جو 1931 میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔ یہ ان کی مختصر نظموں کا مجموعہ ہے۔ 39 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ایک حمد کے علاوہ 9 نظمیں ہیں۔ اس مجموعے کی تمام نظموں میں قوم کی اصلاح اور اس کی بہتری کا جذبہ کارفرما ہے۔ مجموعے کی بیشتر نظمیں خطابیہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔ مجموعے کا انتساب خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انتساب میں قوم وملت کے تئیں شاعرہ کی دردمندی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زاہدہ خاتون نے مجموعے کی نظموں کو آنسوؤں کی لڑی سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ کریں۔ ''یہ آنسوؤں کی لڑی، یہ درد کی تڑپ، یہ سوزش کی آہ، ہاں ایک فریادی کا استرحام، ایک ناشاد کی نوحہ گری، ایک زخمی کی چیخ یعنی کتاب آئینۂ حرم، اسلام کے اس سچے شیدائی تعلیم نسواں کے اس زبردست حامی کے نام نامی منسوب ومعنون کی جاتی ہے جس کا فیضان تربیت اس مجموعہ پریشان خیالی کی تسوید وتبئید کا معنوی سبب ہے اور جس کی قومی محبت وراثتی اثر ونسلی خصوصیت کے طور پر خاکسار مصنفہ کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔''انتساب کا ایک ایک لفظ رقت آمیز ودرد انگیز ہے، جسے پڑھ کر قاری کے لوح دل پر درد وغم کی وہی لہریں مرتسم ہوتی ہیں جس سے شاعرہ کا ربط خاص رہا ہے۔

'فردوس تخیل' زاہدہ خاتون کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جو 1941 میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اپنی نظموں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ مجموعے میں ایک طویل غزل بھی شامل ہے لیکن اس میں بھی نظم کی کیفیت نمایاں ہے۔ ایک مسلسل خیال ہے جو پوری غزل میں رواں ہے۔ رومانی تصور یہاں بھی عنقا ہے۔ پوری غزل میں سنجیدگی کا پہلو نمایاں ہے، اس کا لہجہ بھی غزل کے لہجے سے میل نہیں کھاتا، چونکہ زاہدہ خاتون کی طبیعت اور ان کے مزاج میں متانت ہے جو غزل کے رومانی تصور سے میل نہیں کھاتی۔ ان کی تخلیقات میں اقبال کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ اقبال کی فکر سے بہت متاثر ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ زاہدہ خاتون کے اشعار میں معنی ومفہوم کی سطح پر وہی گہرائی اور گیرائی ہے جس سے اقبال کی شاعری کے در وبام روشن ہیں۔ موضوع اور مفہوم کی سطح پر مماثلت اور یکسانیت کی وجہ سے ان کے اشعار پر کلام اقبال کا التباس ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کا قیام 1936 میں عمل میں آیا، لیکن اس کی تاسیس سے برسوں قبل زاہدہ خاتون شروانیہ اپنی شاعری میں عوامی جذبات واحساسات اور ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس میں مزدوروں اور محنت کش طبقوں کی حمایت وتائید کے ساتھ ساتھ استحصالی قوتوں اور ظالمانہ نظام کے خلاف ان کا مزاحمتی رویہ اور احتجاجی آہنگ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس میں وہ گھن گرج نہیں ہے جس سے ترقی پسندوں کا شعری سرمایہ مملو ہے۔ ایک واضح مقصدی ترسیل اور خاص نظریے کی تشہیر کے باوجود ان کی غزل پر نعرے بازی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

شاہد ارض کرے کیوں یہ دعائے مزدور
بہر زینت ہے وہ محتاج بقائے مزدور
دیکھ کر حسن مکاں کی صفت عقل کہیں
آہ! نکلی نہ کسی لب سے ثنائے مزدور
کارخانے میں جو بارود کا بم آ کے پھٹا
جل گیا پیکر بے جرم وخطائے مزدور
غلہ ڈھونے سے پسینے میں نہائے سو بار
جب ہوا ایک پارۂ ناں روزہ کشائے مزدور
کلبۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر
فرش آتش ہے مئی میں تہہ پائے مزدور

مذکورہ اشعار میں زاہدہ خاتون کے ترقی پسند نظریات بدرجہ اتم محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ مزدوروں کی زبوں حالی اور امرا کے استحصالی رویے سے شاعرہ کبیدہ خاطر ہے۔ حالات کی ستم ظریفی شاعرہ کے حساس دل کو ملول ضرور کرتی ہے، لیکن امیدوں وآرزوؤں کی قندیل کو وہ اپنے دل میں بجھنے نہیں دیتی۔ انھیں آنے والے کل پر امید ہی نہیں یقین بھی ہے مایوسی کے بادل چھٹیں گے اور حالات بہتر ہوں گے۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ دشوار راہوں کا سفر مشکل ضرور ہوتا ہے، لیکن عزم جوان ہو اور حوصلہ بلند ہو تو مشکلیں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں۔

سنا ہے ہم نے دور عیش وعشرت آنے والا ہے
ہوئی کافور ظلمت اب اجالا ہی اجالا ہے
یہ دونوں لفظ ومعنی کی طرح ملزوم ولازم ہیں
یہ گل، وہ شاخ، یہ جاں، وہ بدن، یہ مے، وہ پیالا ہے
نہ سمجھو دل کو تم بے غم، نہ سمجھو غم کو معمولی
ہمارا درد بے پایاں، ہمارا زخم آلا ہے

زاہدہ خاتون شروانیہ نے قطعات ورباعیات کے علاوہ اساتذہ میں غالب اور اقبال کے کلام کی تضمین بھی کی ہے۔ تضمین نگاری میں بھی انھوں نے فنی حرمت کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔ ان کے اشعار حسن معنی اور حسن اظہار دونوں اعتبار سے چونکاتے ہیں۔

کلام غالب کی تضمین:

درد الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری ہائے ہائے
کیوں لگایا پھر وفا کا زخم کاری ہائے ہائے
دنیا میں زحمت کش دنیا کوئی دن اور
ہے طوعاً وکرہاً مجھے جینا کوئی دن اور
تھا صبر وسکوں تم کو بھی زیبا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

ز۔خ۔ش۔ اپنے عہد کے حالات کی خاموش ناظر نہیں رہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری، خطوط اور مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی حالات، سماجی محرکات اور قومی وملی انتشار کو قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے طویل اور موضوعاتی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے یہاں موضوع کی سطح پر جدت اور ندرت تو نہیں ہے، لیکن ان کی تخلیقات میں ان کے جذبۂ صادق، ان کے نازک احساس اور ان کی ملی دردمندی کو ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں تاریخی شواہد بھی ہیں اور جمالیاتی احساس بھی۔ وہ ہمیشہ مشرقی تہذیب کے فروغ کے لیے کوشاں رہیں۔ ان کے

انتقال پر تعزیتی نوٹ کے تحت 'تہذیب نسواں' کے ایڈیٹر مولوی ممتاز علی نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ 'مرحومہ کی بے وقت موت سے تہذیب نسواں کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ وہ اپنی صنف کے لیے درد بھرا دل رکھتی تھیں اور اس درد کو تہذیب کے ذریعے ظاہر کرتی تھیں۔'

مصورِ غم علامہ راشد الخیری نے رسالہ 'عصمت' میں زخ ش کی بے وقت موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ان کا دل قومی درد و غم سے لبریز تھا۔ 'زخ ش اس پائے کی عورت تھی کہ آج مسلمانوں میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ علاوہ ذاتی قابلیت جو ان کے مضامین میں نظم و نثر سے ظاہر ہوتی ہے، ان کا دل قومی درد سے لبریز تھا۔' حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال نے نواب مزمل اللہ خان کو زخ ش کے انتقال پر تعزیتی خط میں ان کی شعری اور تخلیقی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا 'اگر یہ طبعی عمر کو پاتیں تو میری ہم پلہ شاعرہ ہوتیں۔' ان کے استاذ مولوی یعقوب علی جو ایک معمر بزرگ اور اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ انھوں نے زخ ش کی فنی پختگی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے 'صرف سترہ برس کی عمر میں ان کے کلام میں پختگی اور فکر میں وسعت پیدا ہو چکی تھی۔'

زخ ش کو ترجمہ نگاری میں بھی مہارت تھی۔ اس میدان میں بھی ان کی صلاحیت کو اہل نظر نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس باب میں ان کی کدوکاوش کو استحسان کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ آخری ایام میں انھوں نے فرانسیسی مصنف پیر لوتی (Pier Loti) کے ناول ڈیزان شانتے (Desenchantees) کے فارسی ترجمے 'پری رویان ناکام' کا اردو ترجمہ کیا۔

ایک عرصے تک زخ ش ادبی دنیا میں معمہ بنی رہیں، اس لیے ایک عرصے تک ان کے فکر و فن پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ لیکن جب زمانے کا ورق پلٹا، تو ان کی تخلیقی اور فنی ہنرمندیوں کا اعتراف بھی کیا گیا۔ 'زخ ش کی حیات وشاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' کے عنوان سے سب سے پہلے انیس فاطمہ نے ڈاکٹر اسلم فرخی کی نگرانی میں کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ ان کی پھوپھی زاد بہن انیسہ خاتون شروانیہ نے 'حیات زخ ش' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد (دکن) سے 1940 میں شائع ہوئی۔ اس میں نقطہ 'راز' کے عنوان سے شان الحق حقی نے ایک طویل مقالہ لکھا۔ 'زخ ش طاق نسیاں کا ایک روشن چراغ' کے عنوان سے مدیحہ خانم شروانی نے ادبی ماہنامہ 'آج کل' دہلی، اپریل 1996 میں ایک مضمون قلم بند کیا۔ صاحب طرز ادیب اور معروف انشائیہ نگار خواجہ حسن نظامی کی بیگم لیلیٰ خواجہ بانو سے زخ ش کی طویل خط و کتابت رہی۔ ان مکاتیب میں زخ ش کی پسند و ناپسند کے علاوہ قوم وملت کے تئیں ان کی ہمدردی، خلوص اور ان کے دلی اضطراب کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

زخ ش کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو ملت کی بہتری کے لیے دھڑکتا تھا۔ قوم کے درد پر وہ تڑپ اٹھتیں، اور اس کے ازالے کی تدبیروں پر غور وفکر کرتی۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ کے زوال سے پوری قوم ایک ذہنی اضطراب میں مبتلا تھی۔ حد درجہ حساس طبیعت رکھنے والی زخ ش بھلا اس قومی اور ملی سانحے سے خود کو بھلا کیسے دور رکھتی۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن اس حوالے سے لکھتی ہیں۔ ''زاہدہ خاتون خود بھی غیر معمولی سیاسی اور سماجی شعور رکھتی تھیں اور اردگرد کے حالات سے شدید متاثر ہوتی تھیں۔ ان کی زود رنج طبیعت دنیا کے تمام انسان خصوصاً مسلمانوں کے دکھ کو اس طرح محسوس کرتی تھی کہ وہ ان کا ذاتی غم بن جاتا۔ خصوصاً ترکی کے حالات نے اس وقت برصغیر کے تمام مسلمانوں کو مضطرب کیا ہوا تھا۔ زاہدہ خاتون اپنے اضطراب کا اظہار شاعری اور مضامین میں کرتی رہیں۔''

زخ ش کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے، اس کی تاریخ کی کڑی ابراہیم لودھی سے ملتی ہے۔ اس کے آباد ہونے کی تاریخ پر ڈاکٹر انیس فاطمہ کچھ اس طرح روشنی ڈالتی ہیں۔ 'لودھی خاندان کے اعلیٰ فرمانروا ابراہیم لودھی نے عیسیٰ خاں شروانی کو آگرے کا حاکم مقرر کیا اور عمر خاں کے منجھلے فرزند محمد خاں شروانی کو کول کی حکومت سپرد کی۔ کول آنے پر محمد خاں نے محسوس کیا کہ شہر کا پرانا قلعہ اب اس قابل نہیں رہا کہ اس سے ایسے اہم علاقے کی حفاظت ہو سکے اور اس چاروں اطرف آبادی کے پھیل جانے کی وجہ سے استحکام کی بجائے انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس نے 1554 میں ایک بڑا اور مستحکم قلعہ شہر سے دو میل شمال کی طرف تعمیر کیا اور اس کا نام محمد گڑھ رکھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جس کا نام مغلوں کے آخری عہد میں ثابت خاں نے ثابت گڑھ رکھا اور جس کی وجہ سے صرف شہر کول بلکہ پورا نواح علی گڑھ کہلایا۔'

ہندوستان میں شروانی خاندان کا شمار ہمیشہ سے معزز اور باوقار خاندان میں ہوتا رہا ہے، چونکہ منصب اور امارت کے ساتھ ساتھ علم وادب میں بھی اس خاندان کے افراد پیش پیش رہے ہیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں نواب صدر یار جنگ کا تعلق اسی شروانی خاندان سے ہے۔ ان کی علمیت ولیاقت سے بیشتر لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف وتالیف کیں، وہ 'الندوہ' کے مدیر بھی رہے۔ نظام دکن نے ان کی ملی خدمات، علمی استعداد اور انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں انھیں 1918 میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز کیا اور 1922 میں نواب صدر یار جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے اولین وائس چانسلر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انھیں مولانا ابوالکلام آزاد کی قربت بھی حاصل رہی، ایام اسیری کے دوران مولانا آزاد نے ان کو جو خطوط لکھے، وہ 'غبار خاطر' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں اور وہ اردو میں ادب العالیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

زخ ش کے والد نواب مزمل اللہ خاں کا شمار بھی شروانی خاندان کے سرکردہ افراد میں ہوتا ہے۔ نواب مزمل اللہ خاں ذاتی حوالے سے بھی معروف اور ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ 1820 میں بھیکم پور علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ سرسید کا قائم کردہ ادارہ 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں عربی، فارسی اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سرسید سے قربت کی وجہ سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں حصہ لیا اور 1886 میں ایم اے او کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے۔ 1910 سے 1913 تک کالج کے سکریٹری کے طور پر خدمات انجام دیں، جبکہ 1918 میں آپ کو بورڈ آف ٹرسٹیز کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ 1904 میں انھیں 'خان بہادر' 1910 میں 'نواب' اور پھر 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا۔ زندگی بھر قومی اور ملی خدمات انجام دینے کے بعد 28 ستمبر 1938 کو اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔

زخ ش کی والدہ حجازی بیگم کا تعلق بھی ایک صاحب ثروت اور متمول خاندان سے تھا۔ علی گڑھ کے مضافات میں واقع بوڑھ گاؤں کے رئیس حاجی کریم اللہ کی وہ صاحبزادی اور عنایت اللہ خاں کی نواسی تھیں۔ محمد عنایت اللہ خاں رشتے میں مزمل اللہ خاں کے حقیقی چچا بھی تھے۔ حجازی بیگم ان کی عم زاد بہن تھیں۔ محمد عنایت اللہ خاں خود بھی علم دوست انسان تھے اور سرسید کے قریبی حلقہ احباب میں تھے اور ان کی اعانت میں پیش پیش رہتے۔ یونیورسٹی میں ان کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ پکی بیرک کے کئی کمروں کے علاوہ اسٹریچی ہال میں ان کے نام کی تختی نصب ہے۔ کالج میں ایک بڑا کنواں اور ایک فوارہ ان کی یادگار ہے۔

■

Dr. Noman Qaisar
C-66, First Floor, Back Side
Shaheen Bagh, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 8130646324

اقبال عظمتِ انسانی کا حدی خواں

جمال رضوی

علامہ اقبال کا شمار ان برگزیدہ شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے انسانی معاشرے کو کئی سطحوں پر متاثر کیا ہے۔ اقبال کے سلسلے میں ایک بدیہی حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی معنویت کو کسی مخصوص عہد یا حالات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال کی شاعری کی نمود میں بعض مخصوص حالات و واقعات سے اثر پذیری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے تاہم اقبال نے ان مخصوص حالات و واقعات کی شعری تعبیر کچھ اس انداز میں کی ہے کہ ہر دور کا انسانی سماج اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اردو ادب میں اقبال کی شناخت ایک ایسے شاعر کے طور پر ہے جو حیات و کائنات کے متعلق ایک واضح فکری نظام کے تحت شعر کے تخلیقی مراحل کو طے کرتا ہے۔ اس نظام فکر کی بنیاد بلاشبہ وہ اسلامی تعلیمات ہیں جن سے اقبال کو عبد و معبود شناسی کا ایسا ادراک حاصل ہوا جس نے انھیں اس روئے زمین کی زیب و زینت کے امین حضرت انسان کی عظمت و رفعت کی آگہی عطا کی۔ اقبال کی شاعری کا کل سرمایہ ان کی فکر و نظر کے ارتقا کی روداد ہے۔ اس روداد میں کئی ایسے مراحل آتے ہیں جو بعض امور میں اقبال کے زاویہ نظر سے اختلاف کی گنجائش پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوصف اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ان کی شاعری میں سماجی و سیاسی انسلاکات کی متغیر کیفیت کے باوجود عظمت انسانی کی نقش گری کا رجحان ہر دور میں تقریباً یکساں نظر آتا ہے۔

اقبال کی 61 سالہ زندگی (پیدائش 9 نومبر 1877، وفات 21 اپریل 1938) میں مذہب، ادب اور سیاست کے مثلث نے انھیں فکری بالیدگی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 61 سال کا یہ دورانیہ نہ صرف برصغیر کی تاریخ بلکہ اسلامی تاریخ میں ایسے تغیر پذیر حالات کا مظہر ہے جس کے سبب اقبال کے افکار و نظریات میں تبدیلی کا وہ عمل نظر آتا ہے جو ان کی فکر کی ہمہ گیریت کو ایک مخصوص سیاسی و سماجی دائرے سے آزاد کر کے اسے عرصہ کائنات پر محیط کر دیتا ہے۔ یورپ کے سفر سے قبل اقبال کی شاعری کا انداز اور اس سفر سے واپسی کے بعد ان کی شاعری کے موضوعات اور ایک حد تک طرز بیان میں تبدیلی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں اس تبدیلی پر بعض ارباب نقد و نظر اس لیے معترض ہیں کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں جیسی نظم کا خالق اپنی فکر کو ایک مخصوص دائرے میں اس قدر محصور کر لیتا ہے کہ اسے اسلام اور مسلمان کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اعتراض کرنے والوں کے نزدیک یہ اقبال کی فکری محدودیت کی علامت ہے جبکہ بڑھتی عمر کے ساتھ ان کے اندر ایسی فکری پختگی پیدا ہونی چاہیے جو ترانۂ ہندی سے بھی بہتر نظم کی تخلیق کا سبب بنتی۔ اقبال نے اپنے افکار و نظریات میں پیدا ہوئی اس تبدیلی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے سبب کی وضاحت بھی کی ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے عالمی انسانی معاشرہ میں رائج وطن پرستی اور قوم پرستی کے اس تصور کو اس کا سبب قرار دیا ہے جو جغرافیائی حدود کا اس قدر پابند ہے کہ اس کے باہر کی دنیا سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ جب ان کی فکر نوع انساں کی عظمت کے نشانات تلاش کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو اقوام عالم کے مابین مختلف قسم کے امتیازات کی ایسی غمگین شکل نظر آتی ہے جو اس عظمت کو پاش پاش کر دینے کے درپے ہے۔ حیات اقبال سے وابستہ اس دور کی ایک دلچسپ سچائی یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں دنیا میں امن و آشتی کے قیام کی پائیداری کو یقینی بنانے کی جس قدر کوشش ہو رہی تھی جنگ اور غارت گری کا عفریت اسی قدر انسانی معاشرہ کو اپنے مہیب سایہ میں لے رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہ سایہ دراز ہوتا جا رہا تھا جس کا ایک بڑا سبب مختلف قسم کے امتیازات کے سبب انسانی برادری کے درمیان تفریق و انتشار کی وہ کیفیت تھی جسے نام نہاد ترقی پذیر دنیا کے فرمانروا سیاست اور سماج اور بعض اوقات مذہب کی وہ ترقی یافتہ صورت قرار دے رہے تھے جو انسانی ارتقا کے سفر کی ضامن ہے۔ قومیت اور وطنیت کا یہ تصور حب جاہ کے خواہاں افراد کے لیے وہ نسخۂ کیمیا تھا جو ان کی خواہش کی تکمیل کی راہ کو قدرے آسان بنا دیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اتحاد انسانی کے لیے ایسا خطرہ ہے جس سے انسانی عظمت کے زائل ہونے کا اندیشہ قوی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں اقبال عظمت انسانی کی بقا کے لیے اسلام کے اس نظام حیات کی تائید کو ضروری قرار دیتے ہیں جو حریت و مساوات کی راہ میں رنگ و نسل کے امتیازات سے ماورا نوع انساں کو ایک مرکز اتحاد پر مجتمع کرنے کا ذریعہ ہے۔

وہ اسلامی تعلیمات کی اساس پر استوار اپنے فکری نظام کو نوع انساں کے درمیان اتحاد کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں اور اس کے ذریعے ہی وہ عظمت انسانی کے اس صور کو آشکار کرنے کی سعی کرتے ہیں جو خلقت کائنات کا سبب ہے۔ اقبال کی شاعری میں موضوعی سطح پر اس طرز فکر میں ان کے اس خاندانی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ان کی ذہنی تربیت میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اسلامی تعلیمات سے رچے بسے گھریلو ماحول سے باہر نکل کر جب وہ تعلیمی مراحل بتدریج طے کرتے ہیں تو یہاں ایک بالکل مختلف بلکہ گھریلو ماحول سے متضاد صورت حال ان کے سامنے ہوتی ہے۔ مابعد الطبعیات فلسفے کا ارتقا کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے باوصف وہ مذہب کے تئیں اپنے پختہ افکار میں کسی قسم کی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ مذہب اور فلسفہ کے درمیان تفاوت تو جیسی یقینی امر ہے۔ اگرچہ دونوں حیات و کائنات کے اسرار ہائے سربستہ کی گرہ کشائی کا کام انجام دیتے ہیں تاہم عملی و عقلی استنباط دونوں کے مابین ایک واضح فرق قائم کرتا ہے۔ اقبال کے افکار میں مذہب اور فلسفہ سے استفادہ کی وہ شکل نظر آتی ہے جو حیات و کائنات کی ماہیت و افادیت کو دریافت کرنے کی ایسی راہ روشن کرتی ہے جو انسانی عظمت کے پرنور چراغوں سے منور ہے۔ وہ کائنات کی خلقت کے سبب کا سراغ پانے کی سعی کے عمل میں ان حقائق سے واقف ہوتے ہیں جو انھیں نوع انساں کی تخلیق کے راز سے متعارف کراتی ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

(نظم: فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں)

اس روئے زمین پر ورودِ آدم کے پس منظر میں لکھی گئی اس مختصر سی نظم میں اقبال نے انسانی عظمت کو اس انداز سے نمایاں کیا ہے کہ جنت سے اخراج اس کی فضیلت کا سبب ٹھہرتا ہے۔ اقبال عالم بے کاخ و کو سے عالم رنگ و بو میں آدم کی آمد کو کن فیکون کا حاصل تسلیم کرتے ہوئے نوع انسان سے اس بھرم کے باقی رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں جو تخلیق کائنات کے اہم مقصد کی بنیاد ہے۔ اقبال کی شاعری اسی نظام فکر کی ترجمان ہے جو اس بنیاد کے مستحکم کرنے کی تدبیر سے آشنا کرتی ہے اور اس کا مدار عرفانِ ذات کا وہ اہم نکتہ ہے جو نوع انساں کو دنیا و مافیہا کے ان اسرار و رموز کو دریافت کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن سے خود اسے اپنی حقیقت و رفعت کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس مقام تک رسائی کچھ ایسی آسان بھی نہیں کہ مدتوں ایک عمل پیہم کے بعد اس کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کی خواہش کی تکمیل میں کئی ایسے مراحل بھی آتے ہیں جو دلسوزی اور جاں سوزی کی سخت و دشوار گزار راہوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ ان راہوں پر ثبات قدم سے ہی عظمت انسانی کے امکان روشن ہوتے ہیں لیکن تاریخ انسانی میں کئی ایسے ابواب بھی نظر آتے ہیں جبکہ نوع انساں کے قدموں کی لغزش نہ صرف منزل سے اس کی محرومی کا سبب بنی بلکہ اس کی کوتاہی عزم و عمل نے اس راہ کو مزید پیچیدہ اور مشکل بنا دیا۔ اقبال اس سفر کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے انسان کے قلب و نظر کو حقیقت یزدانی کے نور سے معمور ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ ان برگزیدہ و بابرکت شخصیات کے کردار و عمل کو منبع فیضان قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنی حیات ارضی کو اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس مقام پر وہ اسلام کے عہد رفتہ کی درخشاں تاریخ کے صفحات پر ثبت ان جلیل القدر ناموں کے حوالے سے اپنے افکار کی ترجمانی کرتے ہیں جن کی زندگی حیات ارضی کی کامیابی و کامرانی کی ایک روشن مثال ہے۔

اقبال نے شاعری میں اپنی فکری جہت کی وضاحت کرتے ہوئے بارہا یہ کہا ہے کہ قرآن و احادیث ہی میری شاعری کے موضوعات کا ماخذ ہیں اور میں ان کے حوالے سے ہی عصر حاضر کے مسائل و معاملات کا تجزیہ کرتا ہوں۔ بیسویں صدی میں مادی ترقی کے ہوش ربا مظاہر سے مبہوت انسانی معاشرہ میں اس طرز فکر کو اگر اقبال کی قدامت پسندی اور ماضی پرستی سے تعبیر کیا گیا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ چونکہ اقبال نے اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی کے لیے ادب کو بطور وسیلہ اختیار کیا تھا لہٰذا اس ضمن میں اس دور کی ادبی صورتِ حال کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اس زمانے کا ادبی منظرنامہ تخلیق ادب کے نظریاتی و اصولی مباحث میں دو باہم متضاد رویے سے عبارت ہے۔ ایک ادب برائے زندگی کا قائل اور دوسرا ادب برائے ادب کا گرویدہ۔ ان حالات میں گرچہ معاصر سیاسی و سماجی حالات کے سبب ادب اور زندگی کے ربط باہم کو مستحکم بنانے کی شعوری کوشش اہل ادب کے یہاں نظر آتی ہے تاہم اس کوشش میں کئی سارے ایسے قدیم معاشرتی تصورات شکست و ریخت سے دوچار ہوئے جو ماقبل انسانی و سماجی اخلاقیات کی اساس تھے۔ اس کے علاوہ اہل ادب کے نزدیک مذہبی اقدار کی نوعیت اور اس کی افادیت کے تصورات پر بھی مادی ترقی کی سحر انگیزی اثر انداز ہوئی۔ اپنے گرد و اطراف میں افکار و افعال کی اس قدرے پیچیدہ صورتِ حال کے درمیان اقبال نے اپنے لیے ایسی شاہراہ کا انتخاب کیا جس نے دنیا و عقبیٰ کے متعلق ان کی فکر کو ایک واضح سمت عطا کی۔ ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کے مرکب سے جو قصر تعمیر ہوتا ہے اس کے ہر ستون پر عظمت انسانی کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ شاعری میں اپنے منفرد طرز بیان اور موضوعات کی تخصیص کے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

"الفاظ کے انتخاب میں لکھنے والا (شاعر) اپنی حسن موسیقیت سے کام لیتا ہے اور مضامین کے انتخاب میں اپنے فطری جذبات کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے۔ اس امر میں کسی دوسرے شخص کے مشورے پر خواہ وہ کتنا ہی نیک مشورہ کیوں نہ ہو، عمل نہیں کیا جا سکتا۔" (مکتوب بنام سید محمد سعید الدین جعفری مشمولہ خطوط اقبال ص 165، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی)

(خطوط اقبال)

اقبال کے اس بیان سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں جن موضوعات کو برتا ہے ان سے اقبال کا رابطہ صرف خارجی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ وہ موضوعات بجائے خود ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا خاص وصف غور و فکر کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں شاعری کے اس افادی پہلو پر ان کی بھرپور نگاہ تھی اسی لیے وہ شاعر کو محض تخیلات کا پابند تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک شاعر کا منصب اس قدر بلند و ارفع ہے جو اپنے کلام سے خوابیدہ سماج میں بیداری کی رمق پیدا کر سکتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جا بہ جا شاعر کی ذات سے منسوب اس قدر کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اس موقف کی وضاحت درج ذیل اس مختصر نظم سے ہو جاتی ہے جس کا عنوان ہی شاعر ہے۔

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

شاعر کی شخصیت کے لیے آنکھ کی یہ تمثیل معنویت کی کئی جہتوں کی حامل ہے۔ یہ جہات انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں تاہم اس کا محور و مرکز عظمت انسانی کے وہ مظاہر ہیں جو گردش ایام کے اثرات سے محفوظ رہتے ہوئے ابد تک کے لیے جاودانی حاصل کر لیتے ہیں۔ اقبال کے یہاں انسان کامل کے تصور کے ڈانڈے انھی مظاہر سے ملتے ہیں۔ یہ تصور ہی اقبال کو اس مشت خاک میں تسخیر کائنات کا ولولہ و جوش دکھاتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے توانا ہے

(نظم 'انسان')

چمنستاں کی ہیئت کو بدل ڈالنے کی توفیق اسی صورت میں اس مشت خاک کا مقدر بنتی ہے جبکہ وہ اپنی ذات میں پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مصروف عمل رہے۔ اقبال کی شاعری میں انسانی عظمت کا تصور ان کے نظام فکر کی اس فلسفیانہ تعبیر سے وابستہ ہے جس میں عمل پیہم اور یقین محکم کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کے نزدیک اگر انسان عمل کی قوت اور یقین کی دولت سے محروم ہے تو وہ زندگی کے ان تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکتا جن سے کامیابی و کامرانی کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔ اقبال انسان کی حیات ارضی کی کامیابی کا دار و مدار اس کے مسلسل سرگرم عمل رہنے میں دیکھتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی شاعری میں ان حوالوں سے بھی کام لیتے ہیں جو عقائد کی رو سے گرچہ ان کی فکر سے متضاد نظر آتے ہیں تاہم جہد و عمل کے ذریعے حصول مقصد کا ایک مثالی نمونہ

ہیں۔ فکر اقبال کا یہ اجتہادی انداز ابلیس کے کردار کو بھی ایک علامت کے طور پر پیش کر کے نوع انساں کو اس سے جہد وعمل کی تحریک حاصل کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے وہ تقدیر پر قانع رہنے کے بجائے تدبیر کے میدان میں زور آزمائی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ بارگاہِ ایزدی سے ابلیس کے نکالے جانے کو اس کی درماندگی کے بجائے اس کی بلند حوصلگی قرار دیتے ہیں اور اس جرات بیبا کانہ کو اس کے اندر پوشیدہ جہد وعمل کی قوت کو بروئے کار لانے کا وسیلہ تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنی کئی نظموں میں ابلیس کے کردار کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلے کی ان کی نظم 'مکالمہ جبریل و ابلیس' ایک شاہکار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے جہد وعمل کی قوت سے سرشار ابلیس کو اپنے مقصد کی حصول یابی میں اس قدر سرگرم عمل دکھایا ہے کہ وہ ہر مشکل اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اپنے مقصد سے روگردانی اسے کسی طور بھی قبول نہیں حتیٰ کہ وہ اپنے قدرے آسودہ و لذت بخش ماضی سے بھی اپنے حال کو بہتر قرار دیتا ہے۔ اس نظم کے ذریعے اقبال اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مسائل ومشکلات سے نبرد آزمائی میں ہی شخصیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ موضوع کی اس انفرادیت کے علاوہ اس نظم کا اسلوب بھی اقبال کے کمال شاعری کا بین ثبوت ہے۔ جبریل و ابلیس کے مکالموں سے اس نظم کے تار و پود کچھ اس انداز میں بنے گئے ہیں کہ اس کا آہنگ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس نظم کا آخری اقتباس جو ابلیس کے مکالمے کی صورت میں ہے اس میں اقبال نے شورشِ ابلیس کو دنیا کی حرکت وعمل کا سبب قرار دیا ہے گرچہ اس کا مقصد نیک نہ ہوتا ہم یہ ابلیس کو ہمہ وقت آمادۂ عمل رکھتا ہے۔ اس نظم کے ذریعے اقبال نے عزم وعمل کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے اس لطیف پہلو کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر دل جہد وعمل کی قوت سے تہی ہو تو کسی نیک مقصد سے وابستگی بھی اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ وہ جہد وعمل کی اس قوت کے نمو پانے کے لیے طوفان حوادث سے مقابلہ آرائی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اقبال نے اس نظم کے علاوہ اپنی دیگر تخلیقات میں بھی ابلیس کے کردار کو جہد وعمل کا ایک استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ اس کردار کے ذریعے نہ صرف نوع انساں کے دلوں میں جذبۂ عمل کی حرارت پیدا کرنے کے خواہاں ہیں بلکہ عصر حاضر کی انسانی تہذیب کی اس مصنوعی چکا چوند پر بھی طنز کرتے ہیں جو بنام ارتقا انسانوں کے طرز حیات میں ان مضرت رساں عوامل کی آمیزش کرتی ہے جن سے شیرازۂ حیات کے منتشر ہو جانے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں اقبال نے عہد نو کے انسانی معاشرے میں مذہب و سیاست پر مادہ پرستی کی اس ملمع کاری کو ہدف بنایا ہے جو درحقیقت ابلیسی منصوبے کو بتدریج کامیابی سے ہمکنار کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کی یہ نظم خصوصی طور پر ان کے سیاسی شعور کی پختگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں ابلیس کے مشیروں کی تعداد کا جو تعین کیا ہے وہ گرچہ ان کی شعری ضرورت کا تقاضا رہا ہو لیکن اس پہلو کو اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد بین الاقوامی سیاست کے بدلے ہوئے رنگ و آہنگ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی معنویت دو چند ہو جاتی ہے۔

اقبال از آدم تا ایندم انسانی تاریخ کو ارتقا کا ایک ایسا سلسلہ قرار دیتے ہیں جو بطن گیتی و افلاک میں پوشیدہ ان اسرار نہانی کی گرہ کشائی کرتا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنی عظمت و سربلندی کی تکمیل کرتا ہے لیکن اس مرتبہ تک پہنچنے کے لیے وہ راز ہستی سے شناسائی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عظمت انسانی کے متعلق فکر اقبال کی موثر ترجمانی کے طور پر ان کی نظم سرگزشت آدم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
الخ

اس نظم میں دور قدیم سے عصر حاضر تک کی انسانی تاریخ کے ہر وہ اہم حوالے آگئے ہیں جو انسانی تہذیب و ثقافت، مذہب و معاشرت کے مختلف مراحل کی وہ روداد بیان کرتے ہیں جن سے انسانی سفر ارتقا کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ یہ طرز فکر اقبال کی شاعری میں عمومی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ مختلف النوع موضوعات کے حوالے سے عظمت انسانی کی ترجمانی کا ایسا پہلو دریافت کر لیتے ہیں جو ان کے تصور حیات کی تائید کرتے ہوئے انسانی فضیلت کے نقوش اجاگر کرتا ہے۔ اقبال نے ان نقوش کی درخشندگی و تابندگی کے لیے ان اقدار حیات کی پابندی کو لازمی قرار دیا ہے جن سے معاشرے میں محبت، اخوت اور اتحاد و یگانگت کی روایت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ اقبال کا سرمایۂ کلام اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ اس روئے زمین پر آمد آدم کو اس عظیم مقصد کی تعبیر تصور کرتے تھے جو اس دنیا کی زینت و زیبائش سے وابستہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زینت و زیبائش کے لیے کارزار حیات کے ان دشوار گزار مرحلوں سے گزرنے کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں جن سے خود شناسی و خدا شناسی تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں خودی کے جس تصور کی ترجمانی کی ہے وہ دراصل ان دشوار گزار مرحلوں سے سرخرو گزرنے میں نوع انساں کی معاونت کرتا ہے اور اس سے حوصلہ و تقویت حاصل کرنے کے بعد انسان کی عظمت و رفعت اوج ثریا سے ہمکنار نظر آتی ہے۔ اقبال نے انسانی تہذیب و تمدن کا جو تصور اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اس میں ان عارضی مفاہمتوں اور سیاسی مصلحتوں کا گزر نہیں جو بنام ارتقا انسانوں کے ذریعے انسانوں کے ہی استحصال کو روا رکھنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید دنیا کے مسائل کی ایک وجہ وہ نام نہاد تہذیبی ارتقا کا مفروضہ ہے جس نے نوع انساں کے افکار و افعال میں انتشار و خلفشار برپا کر دیا ہے اور اس اضطراب آمیز کیفیت کو اس مادی ترقی نے دو چند کر دیا ہے جس کے سبب انسانی اخلاقیات سے صالح عناصر عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال کی انسان شناسی ان کے اس مخصوص نظام فکر کی مرہون ہے جس کی اساس اسلام کی انسانیت نواز تعلیمات ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور کے مسائل و معاملات پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ہی آئندہ کے انسانی سماج کو درپیش ممکنہ مسائل سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ چونکہ ان کی شخصیت شاعر اور مفکر کے مرکب سے تعمیر ہوئی تھی لہٰذا ان کی فکر میں ایسی آفاقیت و ہمہ گیریت کا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

■

Dr. Jamal Rizvi
Dept. of Urdu, University of Mumbai
Mumbai- 400043 (MS)
Mob. No: 09920529631

اقبال کی ایک مغالطہ آمیز تلمیح

جمال عبدالواجد

جوابِ 'خضرِ راہ' میں ذیلی عنوان 'سرمایہ اور محنت' میں حسبِ ذیل شعر ہے:

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو، اے بے خبر، سمجھا اسے شاخِ نبات

'مطالعۂ تلمیحات واشارات اقبال'[1] میں اس کی تشریح میں زیرِ عبارت ہے:

''ساحر الموط سے مراد حسن بن صباح ہے۔ حسن بن صباح چوتھی صدی ہجری کے شہر طوس میں پیدا ہوا۔ خواجہ حسن نظام الملک، مشہور وزیر دربارِ سلجوق کا ہم مکتب اور دوست تھا۔ نظام الملک کی سفارش سے الپ ارسلان سلجوق کے دربار میں نقیب مقرر ہوگیا، لیکن بعد میں وہ خود اپنے محسن نظام الملک کا دشمن بن گیا اور دربار سے نکالا گیا۔ شام پہنچ کر اسمٰعیلیہ کے پیشوا کی ملازمت میں داخل ہوگیا، اور تمام عمر اس فرقے کے عقائد کی تلقین کرتا رہا۔ اس نے کوہ البرز کے شاداب علاقے میں دس ہزار فٹ کی بلندی پر قلعہ الموط[2] 'میں ایک جنت ارضی بنائی جس میں جارجیا اور کوہِ قاف کی حسین عورتیں جمع کی تھیں۔' اس کے عقیدت مند، جو دور دراز سے اس کے پاس آتے، یہ ان کو بھنگ کے نشے میں سرشار کرکے اس جنت ارضی کی سیر کراتا۔ اس کی جماعت کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی اور جب یہ تعداد کئی لاکھ تک پہنچ گئی تو اس نے اپنی نبوت کا دعوی کیا۔ 1089 میں ایک مضبوط و ناقابلِ تسخیر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ جو لوگ اس کے مرید تھے، وہ باطنی یا فدائی کہلاتے تھے اور بھیس بدل کر اپنے مخالفین کو کسی نہ کسی طرح قتل کردیتے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنا یہ کام ایک جماعت کے سپرد کردیا تھا۔ اس جماعت نے اس کام کو جاری رکھا۔ ظاہر ہے اس کی مخالفت اسلام کی ہی طرف سے ہوسکتی تھی، اس لیے اسلام کو حسن بن صباح کی ذات سے بہت نقصان پہنچا۔ 1124 میں اس کا انتقال ہوا۔''

'تلمیحات'[3] میں اس روایت کو اور زیادہ دلچسپ اور واقعاتی بنا کر یوں بیان کیا ہے:

''ساحرالموت حسن بن صباح کا لقب ہے۔ گیارہویں صدی کے اخیر میں باطنی فرقے کو جس شخص نے ترقی دی وہ یہی شخص تھا۔ اس کے احکام اس کے متبعین پر خوب چلتے تھے۔ اگر وہ کسی شخص کو ان میں سے قتل کا حکم دیتا تو وہ شخص خود بخود اپنے آپ کو برچھوں یا خنجر سے ہلاک کرلیتا تھا، یا کسی پہاڑ سے خود کو گرا کر ختم ہوجاتا تھا۔ اسی طرح اگر کسی غیر کو مار ڈالنے کا حکم دیتا تو فدائی لوگ فوراً اس پر عمل کرتے اور یہ نہ دیکھتے کہ وہ شخص وزیر ہے یا بادشاہ یا خلیفۂ عباسی۔ حسن کا ہر حکم ان کے لیے سحر کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لیے اسے 'ساحرالموت' کہتے ہیں۔ 'موت' مارزندران کے ایک قلعے کا نام تھا، جس پر حسن نے زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ اس قلعے میں اس نے ایک مصنوعی جنت بھی بنائی تھی اور اس میں جنت کے تمام لوازم مہیا کیے تھے۔ خوبصورت باغات، دودھ اور شہد کی نہریں، گانے والے پرند، حوروش عورتیں، کمسن اور حسین غلام..... انتہا یہ ہے تجلی باری تعالی کا انتظام بھی سائنٹفک طریقے سے کیا گیا تھا۔ آئینے کی تیز روشنی سے وہ یہ کام لیتا تھا۔ اس کے پیرو اس جنت میں آکر یہ سمجھتے تھے کہ جیسے سچ مچ کی جنت میں آگئے ہیں۔ جنت کی ایک جھلک دکھا کر اور آئندہ دائمی قیام کے وعدہ پر ان لوگوں سے بد سے بدتر گناہوں کا ارتکاب کرایا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو بھنگ (حشیش) بھی استعمال کرائی جاتی تھی اس کے نشے میں مست ہوکر وہ حسن کے ہر حکم کی تعمیل بے چوں و چرا کرتے تھے۔ غرضیکہ ایک عجیب طلسمی کارخانہ قائم تھا جو ہلاکو کے ہاتھوں درہم برہم ہوا۔''

مندرجہ بالا اقتباسات میں سے موخرالذکر 'تلمیحات' سے اقتباس کے بارے میں کچھ کہنا بے کار ہے، کیونکہ مذکورہ کتاب کو ایک حوالہ جاتی کتاب کے طور پر پیش کی گئی، تاہم افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حوالہ جاتی کتاب سے زیادہ داستانی کتاب ہے۔ اس میں جگہ جگہ بے لگام تخیل سے کام لیا گیا ہے اور بعید از عقل بیانات کو حقیقی واقعات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر زیرِغور اندراج کے مطابق نام نہاد 'ارضی جنت' میں 'دودھ اور شہد کی نہریں' (خیال رہے: الموط کا قلعہ ایک نہایت دشوار گزار پہاڑ کی چھوٹی پر تھا) اور وہاں ''تجلی باری کا انتظام سائنٹفک طریقے سے کیا گیا تھا'' (یہ آج سے تقریباً دو سال پہلے اور وہ بھی ایک پس ماندہ علاقے میں)۔ بھلا اسے کوئی بھی ذی عقل انسان کیسے قبول کرسکتا ہے؟ اسی طرح مرتب کے بقول ''یہ طلسمی کارخانہ..... ہلاکو کے ہاتھوں درہم برہم ہوا۔'' حسن بن صباح کا قلعہ الموط پر

قبضہ 1089 میں ہوا۔ اور ہلاکو کی موت 1266 میں ہوئی۔ گویا یہ 'جنتِ ارضی' اپنے تمام لوازمات..... دودھ شہد کی انہار، تجلی باری کے سائنٹفک انتظام، وغیرہم..... کے ساتھ پونے دوسو سال سے زیادہ (177 سال) کاملاً محفوظ رہی! ظاہر ہے، ایسے بیانات کی سند میں حوالہ جات کی حاجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔[4]

'مطالعہ تلمیحات و اشارات' کا معاملہ مختلف ہے۔ اوّل تو یہ 1986 میں مرتب ہوئی۔ جب تک حوالہ جاتی کتب کی تدوین کے اصول عام ہو چکے تھے۔ دوسرے، اس کی ایک پی ایچ ڈی کے مقالے کی حیثیت سے ترتیب دی گئی، اور وہ بھی جناب رشید احمد صدیقی جیسے عالم کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے نامی ادارے میں۔ لہٰذا، اس میں جائز طور پر واقعات کے معتبر اور حوالوں کی صحت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ تاہم افسوس..... کم از کم موجودہ اندراج میں..... ان دونوں کا فقدان ہے۔ آیئے اندراج کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ اندراج کے بقول:

1۔ حسن بن صباح نے ''قلعۂ الموت میں ایک جنتِ ارضی بنائی، جس میں جار جیا اور کوہ قاف کی حسین عورتیں جمع کی گئی تھیں۔'

2۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کو ''بھنگ کے نشے میں سرشار کر کے اس جنتِ ارضی کی سیر کراتا [تھا]۔''

3۔ ''اس نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا۔''

4۔ ''اس کے مرید..... باطنی یا فدائی کہلاتے تھے.....''

5۔ ''اسلام کو حسن بن صباح کی ذات سے بہت نقصان پہنچا۔''

اندراج میں 'انسائیکلو پیڈیا آف اسلام' کا حوالہ دیا گیا ہے، جس سے تاثر یہ ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا بیانات محولہ کتاب پر مبنی ہیں۔ راقم نے 'انسائیکلو پیڈیا آف اسلام' اور 'شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام' متعلقہ اندراجات کو ایک نہیں، تین چار بار نہایت غور سے سطر بہ سطر پڑھا، لیکن شرم کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، دونوں میں کہیں 'جنت ارضی'، 'حسین عورتیں' یا 'بھنگ' کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ملا۔ 'اورینٹل بائیوگرافی'[5] (فارسی: مفتاح التواریخ)، مصنفہ طامس ولیم بیل میں 'حسن صباح' پر خاصا طویل اندراج ہے۔ یہاں بھی 'کوہ قاف اور جار جیا' کی حسینان کی کوئی جھلک نہیں ملی۔ اور ملتی بھی کیسے؟ یہ ذمے دار و معتبر حوالہ جاتی کتب ہیں، داستانوی ادب نہیں۔ یوں تو اس کے اشارے مشرقی اور مغربی ادب کی دوسری کتب میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن 'جنت ارضی' کی کہانی کو مار کو پولو کے افسانوی سفرنامہ نے سب سے زیادہ ترویج دی۔ اگر اس میں اصلیت کا کچھ شائبہ ہے تو بس قدر: اسمٰعیلیہ قرآن شریف اور احادیث کے ظاہری الفاظ کے بجائے 'باطنی' معنوں پر زور دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کو 'باطنیہ' بھی کہا جاتا ہے۔ نزاری اسمٰعیلیہ کی ایک شق ہیں۔ حسن بن صباح..... جو نزاریوں کا سربراہ تھا..... ظاہری عبادت کی اہمیت کم کر دی اور باطنی عبادت فرض کر دی۔ اس کا موقف تھا کہ نجات یافتہ اشخاص کے، جو روحانی جنت میں داخل ہو چکے ہیں، عبادت کی یہی شکل موزوں ہے۔ گویا مومنوں کے لیے یہ روحانی بہشت ہے۔ عام لوگ غیر مرئی کیفیات کو آسانی سے سمجھ نہیں پاتے۔ ان کو مرئی اشیا درکار ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک نہایت ہی ارفع ذہنی حالت کو جسمانی جامہ پہنا دیا اور ایک خالص داخلی روحانی کیفیت کو ارضی جنت (مع حور و قصور، اشجار و انہار) میں تبدیل کر دیا، اور اسے الموط کی بے نخل و گیاہ چٹانوں سے تعمیر کر ڈالا۔

اندراج کے بقول ''اس [حسن بن صباح] نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا۔'' یہ سراسر جھوٹ ہے۔ موضوع سے متعلق حوالہ جاتی کتب یا مصادر میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا جس سے اس کی توثیق ہو سکتی بلکہ حسن بن صباح نے کبھی امامت تک کا دعویٰ نہیں کیا۔ بے شک ''نزار کی وفات کے بعد وہ 'حجۃ' متوفی امام کا زندہ ثبوت، اور اماموں کے سلسلے میں مختار کڑی[7]'' مانا جاتا تھا۔ اس کے متبعین اسے 'سیدنا' ('ہمارا آقا') کہتے تھے، لیکن اسے 'امام' بھی نہیں کہا گیا۔ نبی کہنا تو دور کی بات ہے۔ عقائد سے اختلاف کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا، حقیقت میں حسن بن صباح نے ''خلوت اور زہد کی زندگی بسر کی..... اخلاقی معاملات میں اس کا ایک سخت گیرانہ رویہ تھا۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو سزائے موت دی..... ایک کو قتل کے جرم میں اور دوسرے کو شراب نوشی کی وجہ سے[7]۔ وہ فلسفیانہ طبیعت رکھتا تھا اس نے بڑی معقولیت سے تصنیف کا کام کیا۔''[8] اس کی اکثر تصانیف قلعۂ الموت پر منگول قبضے کے بعد نذر آتش کر دی گئیں۔ بس اس کی خود نوشت کا ایک جزو دستیاب ہے۔

اسی طرح اسمٰعیلیوں..... نزاری جن کی ایک شق تھے..... اور فاطمیوں کی جنگ کو اسلام اور کفر کی جنگ سے تعبیر کرنا، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصلی مضمرات سیاسی و معاشی تھے۔ بے شک انھیں مذہبی رنگ دے دیا گیا..... بالکل ایسے ہی جیسے آجکل جنگوں کو قومی رنگ دے دیا جاتا ہے.....

حسن بن صباح کے تعلق سے، چند سطور 'فدائین'[9] کے متعلق ضروری ہیں، کیونکہ اس بارے میں بہت سی غلط روایات مشہور ہیں۔ خفیہ دستے کے طور پر فدائین کا استعمال

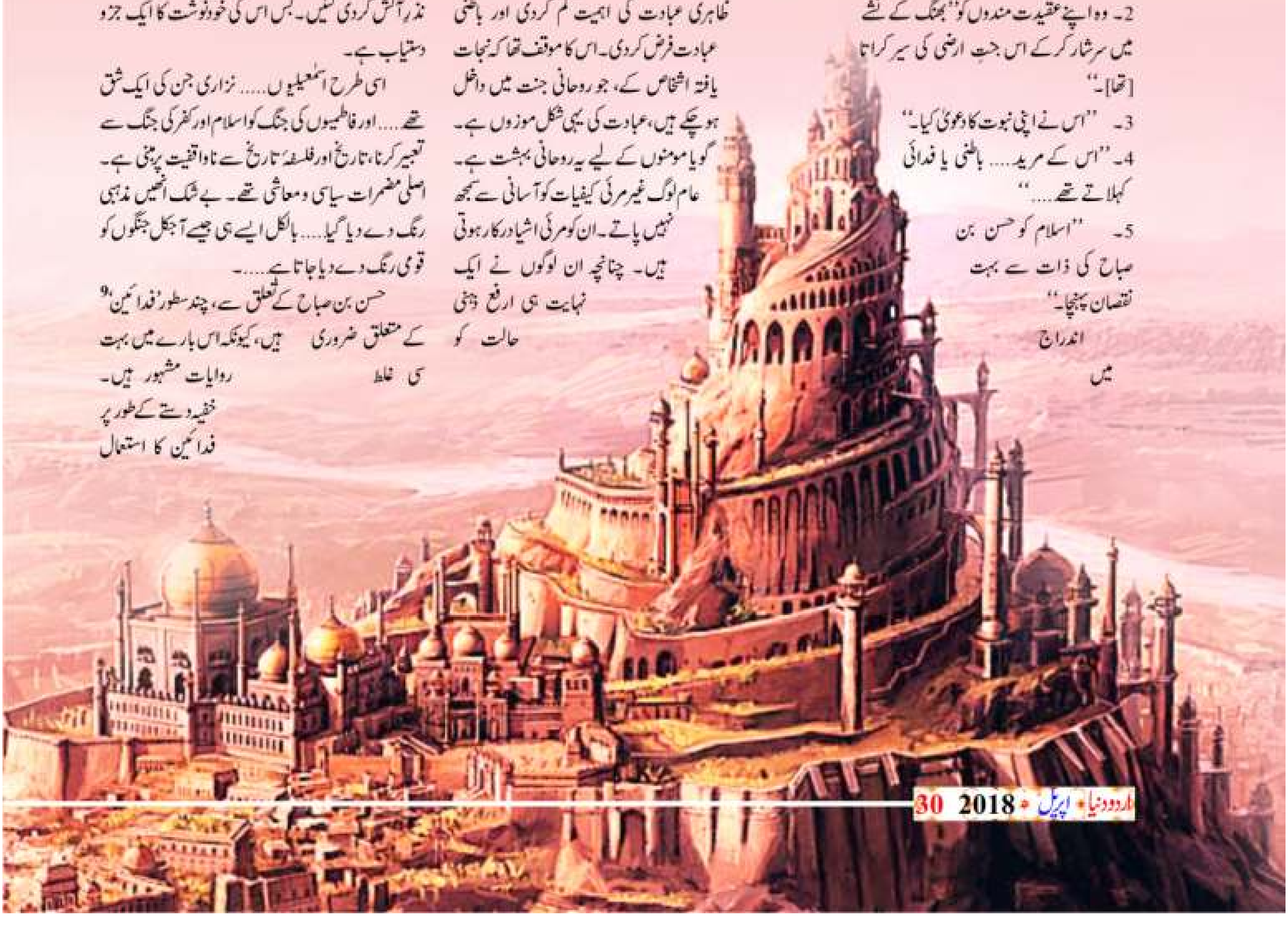

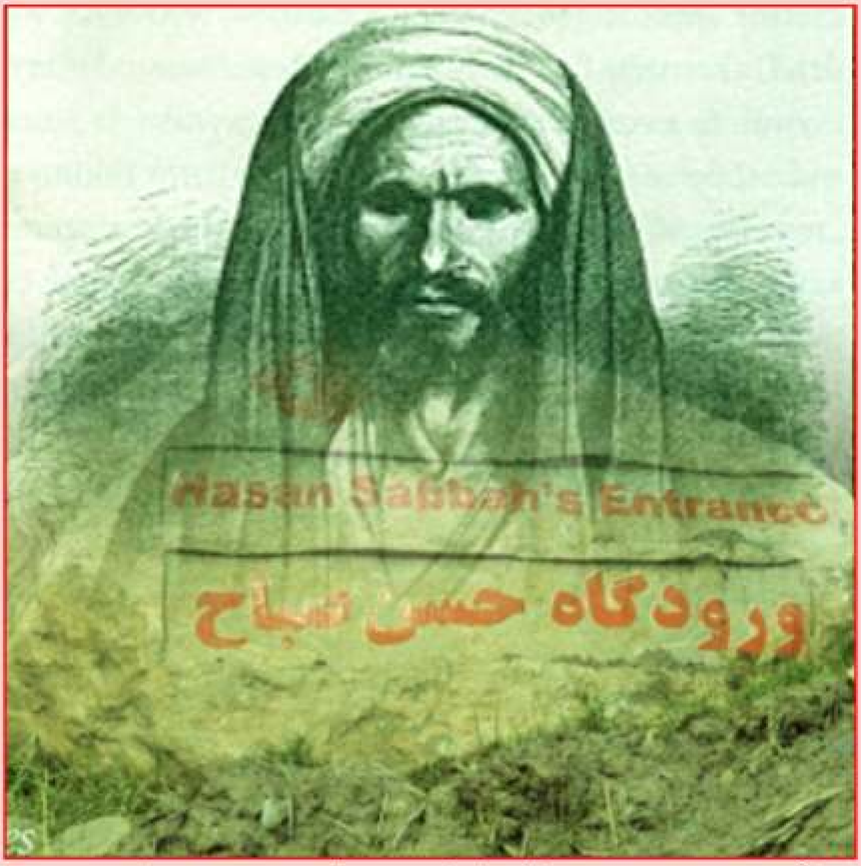

عسکری نظام کا باضابطہ حصہ رہا ہے۔[10] آج کل بھی عسکری طاقتیں 'اسپیشل آپریشن'، 'سیکریٹ ایجنسیز' کا استعمال مخالفین کو اغوا کرنے، قتل کرنے اور دشمن کے یہاں توڑ پھوڑ کرنے کے لیے کرتے ہیں۔[11] چنانچہ یہ سمجھنا کہ 'فدائین' کی ایجاد حسن بن صباح نے کی (یا یہ کہ سب باطنی فدائین ہوتے تھے، یا اس کے برعکس) صحیح نہیں۔ اغلباً حسن بن صباح نے اس تنظیم کا زیادہ موثر استعمال کیا۔ لیکن ''یہ سوچنا کہ اس نے اس دستے کا استعمال اپنے ذاتی مقاصد کے لیے کیا، یا یہ کہ اس نے دستے کے کچھ قابل نفریں طریقوں کی حمایت کی قطعی غلط ہوگا۔''[12] جہاں تک جنگ کے استعمال کا تعلق ہے، وہ عرب (بلکہ اور بہت سے دیگر ممالک) میں عام تھا۔ لیکن لفظ 'Assassin' کا حشیش سے اشتقاق درست نہیں۔[13]
اسی طرح فدائین کو 'خنجر' سپرد کرنے کا رواج (اس میں کلی پھندنے کتنے ہیں ان کا ذکر نہیں) بھی چنداں متعجب کن نہیں۔ فوجی دستوں میں اس قسم کی رسومات عام ہیں اور چونکہ فدائین ایک نہایت پرخطر مہم پر بھیجے جاتے تھے، ایسی رسوم میں احترام، جذب اور صراحت کا التزام متوقع ہی ہے۔[14]

آخر میں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے: ملحوظ رہے ایک تلمیح...... یا محاورے...... کا بیچ اور اس کا تلمیحاتی...... یا محاوراتی...... معنی میں ایک اور ایک رشتہ نہیں ہوتا۔ کسی تلمیح کے پیچھے کہانی بے بنیاد ہو سکتی ہے، لیکن اس سے اس کے تلمیحاتی معنی اور استعمال لازمی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ اردو میں اس کی ایک دلچسپ مثال 'تاناشاہ' اور کثیرالاستعمال 'تاناشاہی' ہے۔[15]

حواشی:

1۔ اکبر حسین قریشی: مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال، لاہور، اقبال اکادمی، 1986، ص229

2۔ قلعۂ الموط (یا الموت) کی وجہ تسمیہ اور دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے: دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد 2

3۔ محمود نیازی: تلمیحات، لکھنؤ نسیم بک ڈپو، 1964، ص202

4۔ اس غیر ذمے دارانہ رویہ کی ایک اور زیادہ واضح مثال 'تاناشاہ، تاناشاہی' کے ذیل اندراج ہے ص 100۔ ویسے منصفانہ طور پر اول تو کتاب 1964 میں لکھی گئی جب اردو میں حوالہ جاتی کتب کی تدوین کی کوئی روایت نہیں تھی۔ دوسرے، مرتب کی اس کی کوئی تعلیم یا تربیت کا بھی موقعہ نہیں ملا تھا۔ کتاب کے مقدمہ نگار، شمیم انہونوی، نے اپنے مقدمہ میں غیر معمولی صاف گوئی سے کتاب کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے، جو قابل تعریف ہے۔ دراصل، ایک بڑا مسئلہ یہ ہے، اردو میں ابھی تک کوئی جامع و مستند فرہنگ تلمیحات نہیں مرتب کی گئی ہے۔ حال میں...... 2011...... میں ثوبان سعید نے ایک 'فرہنگ تلمیحات' شائع کی حالانکہ فاضل مرتب نے مواد جمع کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے، لیکن اس میں حوالہ جاتی کتب کی ترتیب اصولوں کی...... مثلاً فہرست مضامین، ترتیب متن اور اشاریہ کا باہمی رشتہ...... مکمل نظرانداز کی گئی ہے، جس نے کتاب کا استعمال حد درجہ دشوار بنا دیا ہے۔ بہرحال، مذکورہ فرہنگ میں 'ساحر الموط'، 'حسن بن صباح' یا 'الموط' کے تحت کوئی اندراج نہیں ہے۔

5۔ An Oriental Biographical Dictionary. Revised & enlarged by Henry George Keene. Ph 153

6۔ 'باطنی تفسیر' کے نمونے کچھ سنی مفسرین کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ اس کی ایک قریب ترین مثال سرسید کی تفسیر القرآن کہی جا سکتی ہے۔ لفظی و تاویلی تفسیر کا تنازعہ بائبل کے معاملے میں امریکہ میں خاص گرماگرمی کا موضوع رہا ہے۔

7۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ لوگوں کو بھنگ کا نشہ کراتا تھا، محض تعصب اور جہالت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ شرر کی فردوس بریں کی تمام تر بنیاد ایسا ہی تعصب اور ناواقفیت ہے۔

8۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد 8، ص248

9۔ ایضاً، جلد 15، ص206 میں اس لفظ کے اصل، مختلف معنی اور استعمال کے بارے میں دلچسپ معلومات ہیں۔

10۔ پانچواں رکن Fifth Column کی اصطلاح سے سب واقف ہیں۔

11۔ جاسوسی ناولیں اس کی مثالوں سے پر ہیں۔

12۔ شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص136، کالم 2۔

13۔ دیکھیے: دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد 8، ص 354، آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس اشتقاق کو صلیبی جنگوں کے زمانے کا بتایا ہے، جن سے حسن بن صباح کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

14۔ سننے میں آیا ہے کہ گورکھا جب مہم کے لیے کھوکری اٹھاتے ہیں تو اس کی باقاعدہ پوجا کرتے ہیں۔ سکھوں کی رسوم کیپٹن (بعدازاں کرنل) سلیمین نے 'رام سینا' (ترجمہ: لغات ٹھگی، مرتبہ: رشید حسن خاں) میں تفصیلاً درج ہیں۔

15۔ اردو میں اس کی دوسری مثال 'بزانخفش' ہے۔ انگریزی میں اس کی دو مثال: To eat a humble pie اور To wear a Dunce Cap ہیں۔ اول مبنی تلفظ پر مبنی ہے اور دوسری خالص تعصب پر۔ دیکھیے: Brewer's Dictionary of Phrase and Fable۔

■

Jamal Abdul Wajid
40 D, Mayur Vihar
Pocket 4, Phas 1
Delhi - 110091
Mob.:9013770775
E-mail.: jamalwajid818@gmail.com

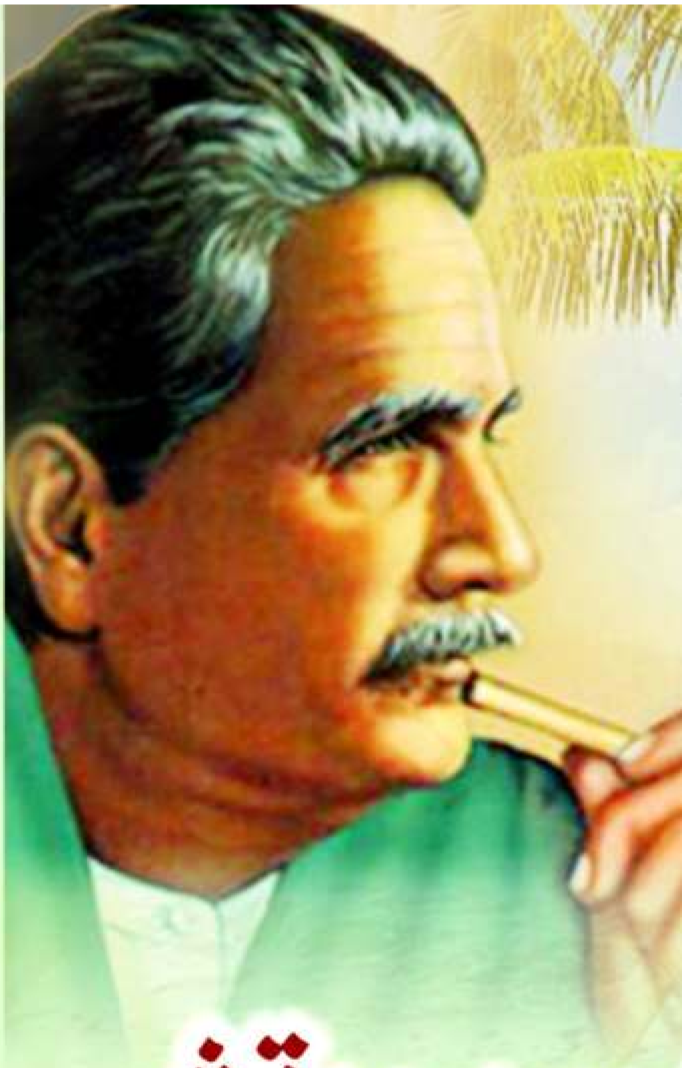

سمی اقبال

اقبال کا ماحولیاتی شعور

علامہ اقبال کی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کی شاعری کو اسلامی وقرآنی، قومی وملی، اصلاحی اور مشرقی و مغربی فکر وفلسفے کی روشنی میں پرکھا جاتا رہا ہے۔ حکیمانہ و فلسفیانہ نکات کی تلاش میں کبھی خودی اور بے خودی، مرد مومن یا مرد کامل، عشق وعقل اور حرکت وعمل پر بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ تصوف اور اس سے منسلک چند نکات پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ کچھ دانشوروں نے ان کے کلام کو مارکسی نظریے سے بھی دیکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ناقدین نے غالب اور شاد جیسے عظیم شعرا کے ساتھ عظیم شاعر فلسفی اقبآل کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی شاعری میں کوئی نیا پہلو یا نیا گوشہ تلاش کرنا اب آسان نہیں رہا۔ کافی غور وخوض کے بعد میں نے ماحولیات کے تناظر میں کلام اقبال کا مطالعہ شروع کیا۔ اس امر میں ذاتی طور پر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ دوسرے مفکرین اور دانشوروں کی طرح اقبال جیسے اسلامی مفکر اور فلسفی بھی ماحولیات یعنی ماحول کا شعور رکھتے تھے۔ 'ماحول' ہمارے اطراف کی جاندار اور غیر جاندار چیزوں کے علاوہ طبعی عوامل مثلاً روشنی، درجۂ حرارت، رطوبت، ہوا، بارش اور موسم وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمارے گردو اطراف میں نباتات، حیوانات اور جمادات سے متعلق جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب مجموعی طور پر ماحول (Environment) کہلاتی ہیں۔

علامہ اقبال فطرت سے بہت قریب اور ماحولیات کے تئیں بیدار تھے۔ فطرت سے محبت کرتے تھے اس لیے اس کا تحفظ ضروری سمجھتے تھے۔ اُس زمانے کے دیگر ادبا وشعرا کا بھی یہی شغل تھا یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں ماحولیات کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ مگر آج ماحولیاتی کثافت پوری دنیا کے لیے ایک تشویشناک مسئلہ بن چکی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اقبال کی شاعری میں ماحولیات اور اس سے وابستہ عوامل کی خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔ ان عوامل کو ہم قدرت کی منظر نگاری میں بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی

(جگنو)

ان اشعار کو اقبال کے ماحولیاتی شعور کی کلید کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اگر چہ اقبال کی شاعری کے بیشتر حصے پر حکیمانہ افکار غالب ہیں، لیکن کائنات کے راز سربستہ کو جاننے کا شوق انھیں فطرت کے مطالعے میں غرق کر دیتا ہے۔ مطالعے کے بعد انھیں ہر شے میں حسن کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ کلام اقبال کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ معاشرے کے تکلف اور تصنع سے بیزار ہیں اور وادیِ قدرت میں پناہ لینا پسند کرتے ہیں۔ انھیں فطرت کی سادگی لبھاتی ہے کیوں کہ اس میں انھیں بے پناہ حسن نظر آتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن

(نظم بچہ اور شمع)

شاعر کے نزدیک حسنِ فطرت انسان کے لیے بصیرت افروز اور حوصلہ افزا ہے۔ فطرت کا حسن انسان کے سامنے قدرت کے راز وا کرتا ہے اور انسان کے ادراک و ذہن کو حقیقت کی جستجو کے لیے مائل کرتا ہے۔ اقبال کا ذہن حسن فطرت سے مسرت اندوز بھی ہوتا ہے اور کائنات کے اسرار ورموز کے انکشاف کی طرف رجوع بھی ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کی نظموں میں تلاش، تحقیق اور تجسس کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے ہمالہ، گلِ رنگیں، ابر کوہسار، ایک آرزو، انسان اور بزم قدرت، رخصت اے بزم جہاں، جگنو، پرندے کی فریاد، ایک گائے اور بکری، ابر، آفتاب، ماہِ نو، چاند، اخترِ صبح، صبح کا ستارہ، نوید صبح، شبنم اور ستارے، جیسی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال حقیقت کی جستجو میں منہمک تھے۔ خاص طور سے یورپ سے واپسی کے بعد ان کی شاعری میں فطرت سے والہانہ جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ اس زمانے میں اقبال پر مناظر فطرت کے مطالعے کا شوق بہت غالب تھا۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اقبال کو مغرب کے فطرت پرست شعرا نے بہت متاثر کیا تھا۔ بعد کے ادوار میں بھی اس طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ فطرت کے حسن کو اپنی نظموں میں بطور پس منظر یا موضوع کی تمہید کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

اس دور میں وہ مظاہر فطرت کو کسی خاص زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھتے اور وہ ورڈس ورتھ کی طرح فطرت کی فلسفیانہ تعبیر نہیں کرتے۔ بلکہ فطرت کی آغوش میں سکون کی تلاش کرتے ہیں اور ان کی فکر حسین لمحوں کو چھو لیتی ہے۔ وہ سوچ میں بھی پڑ جاتے ہیں اور فطرت کے اسرار و رموز کے انکشاف اور انسان اور فطرت کے باہمی تعلق کو چھو لینے کی ٹوہ سی محسوس کرتے ہیں۔ فطرت کے ان لمحوں میں وہ مغرب کے کئی فطرت پرست شعرا کی طرح مسرت انگیزی پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ خارجی مظاہر کی خوبصورتی کا مشاہدہ کرتے ہوئے انھیں اپنی داخلی بے چینی اور اضطراب کا بھی خیال آ جاتا ہے اور ان کا حساس ذہن انسان، فطرت ان کے آغاز اور انجام، ان کے باہمی رشتوں اور اس نوع کے دوسرے مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ (جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ حامدی کاشمیری، ص 336)

اردو کے ادبا و شعرا نے ہر زمانے میں عصری تقاضوں کو پورا کیا ہے اور بدلتے حالات میں بدلتے ہوئے مسائل کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ بڑھتا ہوا درجۂ حرارت یا گلوبل وارمنگ ہے، جو پورے کرۂ ارض کو اپنے حصار میں لے چکا ہے۔ زمین کی بڑھتی ہوئی گرمی نے ماحولیاتی نظام کو منفی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس امر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کے دور تک یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ تھا جیسا کہ آج ہے۔ دور حاضر میں یہ مسئلہ ہنگامی صورت اختیار کر چکا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں قدرتی مناظر کی سچی اور خوبصورت عکاسی کی ہے۔ کلام اقبال کے قدرتی مناظر کا جب ہم دور حاضر کے قدرتی مناظر سے موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنی دنیا کی دلکشی گھٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سبزہ زاروں کی شادابی کمہلانے لگی ہے۔ کوہساروں کی رنگت پھیکی پڑ گئی ہے۔ گھنے جنگلوں کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی ہے۔ ندیوں کی روانی اور پانی کی شفافیت میں کمی آئی ہے۔ بڑھتی ہوئی انسانی مداخلت سے سمندروں اور ساگروں کی صحت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ندیوں اور سمندروں کے کناروں پر عمارتوں کی شکل میں کنکریٹ کے گھنے ہوتے ہوئے جنگل حسین اور دلکش وادیوں میں قدرتی آفت کو مدعو کرتے ہیں۔ سمندری جہازوں اور بندرگاہوں سے بہنے والے تیل اور تحقیقاتی تجربات نے سمندر کے پانی کو کثیف کر دیا ہے جو ہر ذی روح کے لیے موذی ہے۔ تیزابی بارش بھی اس روئے زمین پر سانس لیتی زندگیوں کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوئی ہے۔ صنعتی اور دیگر ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد ہونے سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہوا ہے۔ کیوں کہ کرۂ باد میں گرین ہاؤس گیسوں (کاربن ڈائی آکسائڈ، میتھین، کلورو فلورو کاربن وغیرہ) کا توازن بگڑ جانے سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے، جس کے سبب گرمی کی شدت نا قابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ جنگل یا پیڑ پودے ہوا کی آلودگی کو کم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ لیکن انسان نے اپنی طماع اور خود غرضی میں قدرت کی ان خوبصورت سوغاتوں کو بھی نوچ کھسوٹ کر کنگال بنا دیا ہے۔ ایسے سنگین حالات میں ہمیں فطرت سے محبت کرنا اور اس کی قدر کرنا سیکھنا ہوگا۔ اقبال کے کلام ہمیں قدرت سے قربت حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اگر ہم ابھی بھی ہوشیار اور سنجیدہ ہو جائیں اور ماحولیات کے تحفظ کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھیں تو سانس لینے کے لیے صاف ہوا مل سکتی ہے۔ نمونہ کلام نقل کرتی ہوں تا کہ فطرت سے شاعر کی قربت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

(ایک آرزو)

بظاہر تو یہ اشعار حسن فطرت کی توصیف محض معلوم ہوتے ہیں مگر ہمارے خیال میں شاعر کا مقصد محض توصیف نگاری نہیں ہے۔ توصیف کے پردے میں وہ فطرت کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے نظم 'ابر کوہسار' میں بادل اور بارش کی اہمیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے۔

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

قدرتی آفات بڑے پیمانے پر جان و مال کے نقصان کے ساتھ سماجی زندگی میں ابتری پیدا کر دیتی ہیں جن پر انسانوں کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گزشتہ برسوں میں قدرتی حادثات کثرت سے وقوع پذیر ہوئے ہیں اور اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوا ہے کیوں کہ قدرت کے کارخانے میں تکنیکی اور مشینی وسائل کی مداخلت بڑھ گئی ہے۔

ہم نے درختوں اور جانوروں کا حد درجہ استحصال کیا ہے۔ پودوں اور جانوروں کی معدومی ماحول کی پستی یا انحطاط کی وجہ بنتی ہے جو انسانوں کی بقا کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ لہٰذا لوگوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ ماحول کے موافق معمول اپنائیں۔ اردو کے نظم نگار شعرا نے اپنی نظموں میں مختلف انواع و اقسام کے پرندوں اور پھولوں کو شامل کیا ہے جس سے معاشرے میں ان کی اہمیت کا پتہ ملتا ہے۔ آج فلورا اور فاؤنا کو تحفظ دینے کے لیے بیداری مہم چلائی جا رہی ہے اور پرندوں کو تحفظ دینے کے لیے برڈ سینکچریز بنائے جا رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے شعرا ہمیشہ سے ہی فلورا اور فاؤنا کی اہمیت سے واقف تھے اور انھیں انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ گردانتے تھے۔ اسی لیے نظموں میں انھیں کثرت سے جگہ ملتی رہی ہے۔ کلام اقبال سے مثالیں نقل کرتی ہوں۔

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات

(نوید صبح)

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

(جگنو)

علامہ اقبال نے نظم 'جگنو' لکھ کر ایک ایسے پتنگا / کیڑا کو تحفظ عطا کیا ہے جو راتوں کو اب کم ہی نظر آتا ہے۔ اقبال نے قدرت کی زمینی، آسمانی اور فضائی کرشمہ سازی کو اپنی نظموں میں شجر و حجر، ندی و نالے، موسم، چرند و پرند، صبح و شام، چاند و تارے اور کوہ و صحرا کے توسط سے پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

(بال جبریل کی غزلوں سے ماخوذ)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
(ساقی نامہ)

ہمارے ملک میں کئی جھیلیں، ندی، نالے، ساحل اور سمندر بھی اتنے آلودہ ہو چکے ہیں کہ وہاں حیاتیاتی زندگی ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ اقبال نے انسانوں کی بقا کے لیے ماحولیاتی نظام کی اہمیت کو سمجھا ہے اور حیاتیاتی تنوع کو انسانی زندگی کے ارتقا کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ مذکورہ اشعار میں پرندے و پھول وغیرہ حیاتیاتی تنوع کی مثالیں ہیں جن کے لیے شمسی توانائی اور پانی کی درآمد ناگزیر ہے۔ تمام پودے اور جانور باہمی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں اور مل کر ماحولیاتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔

پہاڑ کو قدرت نے انسان اور اس کی تہذیب کا محافظ بنایا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے جسے گلیشیر کہتے ہیں۔ یہاں سے نکلنے والی ندیوں کا پانی میٹھا اور شفاف ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہمالیہ سے نکلنے والی ندیاں دوامی نوعیت کی ہیں کیوں کہ گلیشیر کا برف پگھل کر انھیں پانی بھیجتا رہتا ہے۔ برسات میں بارش کا پانی بھی انھیں ملتا ہے۔ لہٰذا یہ ندیاں پورے سال رواں دواں رہتی ہیں۔ اشعار نقل کرتی ہوں:

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
(ہمالہ)

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اُٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اُٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل
(ابر)

اقبال کے یہاں ندی زندگی کی علامت ہے اور بارش اللہ کی رحمت ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو خشک گھاس ہری ہو جاتی ہے اور غنچے شگفتہ ہو کر پھول بن جاتے ہیں۔ جب بادل زمین پر برستا ہے تو سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور زمین خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ پہاڑوں کی

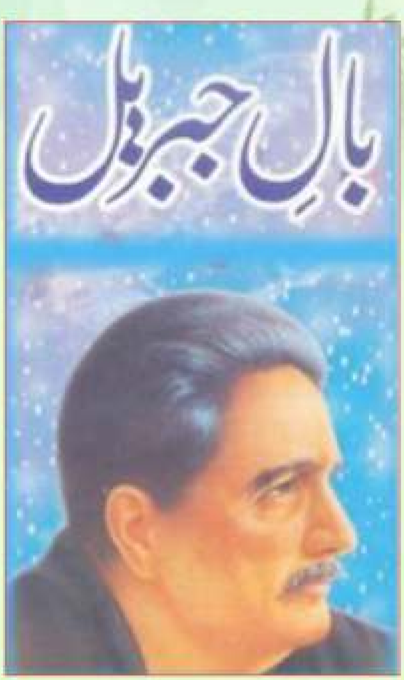

وادیوں میں صدہا اقسام کے پھول لہلہاتے ہیں۔ کلامِ اقبال میں کوہستان کے حسین سے حسین تر مناظر کا عکس نظر آتا ہے۔ اقبال دنیا کے ہنگاموں سے گھبرا کر سکون اور فرحت کی تلاش میں ان دلکش اور دل فزا وادیوں کی جانب عود کر جاتے ہیں۔ اپنی اضطرابی اور بے چینی کا اظہار وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔ اشعار دیکھیں:

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو!
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
(ایک آرزو)

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں مَیں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں مَیں
(رخصت اے بزمِ جہاں)

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ شاعر ہمارے دور میں موجود ہے اور ہماری بے کلی و اضطراب کو وہ بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح دنیا سے بیزار ہے اور سکون و خاموشی کا متلاشی ہے کیوں کہ دنیا کی جس بستی میں ہم رہتے ہیں وہاں ترقی کے نام پر اتنے ہنگامے اور شور شرابے ہیں کہ باشندوں کا دم گھٹنے لگا ہے۔ علامہ اقبال نے قدرتی مناظر کو موضوع بنا کر اردو طبقے کو ماحولیات کے تئیں ذمے داریوں کا احساس دلایا ہے تاکہ باہمی اتحاد و اتفاق سے ماحولیاتی مسائل کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ کوششوں کو جاری رکھا جا سکے۔ نمونۂ کلام پیش کرتی ہوں:

کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو
(ابرِ کوہسار)

تبدیلی قدرت کا قانون ہے۔ کئی ارضیاتی ثبوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی زمین کا ایک بڑا حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن انسانی سرگرمیوں نے زمین کی گرمی کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ گلیشیر کے پگھلنے کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اگر برف کے پگھلنے کی رفتار میں کمی نہیں آئی تو اس سے ساحلی اور جزائری علاقوں کے بیشتر حصوں کے تہہ آب ہونے کا اندیشہ بنا رہے گا۔ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج پر قابو پانے اور زمین کی گرمی کے بڑھتے رجحان کو روکنے کے لیے کوششیں پہلے ہی شروع کی جا چکی ہیں مگر کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ عالمی برادری کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ اقبال نے ماحولیات کے تئیں پورے سماج کو بیدار کر کے اپنی ذمے داریوں کو بخوبی پورا کیا ہے اور ماحولیات کو بچانے کی جدو جہد میں اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف لیا ہے۔ دورِ حاضر میں بھی فن کاروں اور تخلیق کاروں کو اپنی فنی صلاحیتوں سے عوامی شعور کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھانا چاہیے تاکہ ماحولیاتی توازن کو قائم رکھا جا سکے۔ ماحولیات کا تحفظ کامیاب اور خوشحال زندگی کا ضامن ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسے طرزِ زندگی کو اختیار کرنا ہوگا جس سے دنیا ہمارے لیے اور آنے والی نئی نسلوں کے لیے بھی قابلِ رہائش بنی رہے، اور موسمِ بہار انھیں بھی وہی شفافیت، مزہ، سکون اور سرور دے جو ہمیں اقبال کے ان اشعار کے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں۔

کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں
(ایک گائے اور بکری)

■

Dr. Simmi Iqbal, C/o Mehar Wafa
226, Chandrabhaga Hostel, JNU
New Delhi - 110067

سلیمان اریب اور ان کے چار درویش

سید معظم راز

اچھی کتابیں بھلے ہی کسی موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہوں، بہر حال روح کی غذا کا کام انجام دیا کرتی ہیں، 96-1995 کے چھ ماہی سروے فیلڈ سیزن کے دوران جو کتابیں راقم کے سامان میں موجود ہیں حسن اتفاق سے ان میں سے دو کتابوں کے مصنفوں کے نام یکساں یعنی 'سلیمان' تھے۔ ایک کتاب 'کڑوی خوشبو' تھی جس کے مصنف، ابتداً ترقی پسند اور بعد ازاں جدیدیت کے ترجمان ماہنامہ 'صبا' کے مدیر سلیمان اریب تھے تو دوسری کتاب تھی 'کیوڑے کا بن' جس کے مصنف دکنی زبان کے امام، سلیمان خطیب ہیں۔ یہاں مرکزِ گفتگو سلیمان اریب ہیں اس لیے بات ان کے حوالے سے ہی ہوگی۔

آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی کے تحت ستمبر 1973 میں شائع شدہ سلیمان اریب کے مجموعہ کلام 'کڑوی خوشبو' میں پیش لفظ کے بطور 'شاعر کے بارے میں' عنوان کے تحت عابد علی خان، رکن کمیٹی، ساہتیہ اکیڈمی نے لکھا تھا:

'سلیمان اریب کا پہلا مجموعہ کلام 'پاس گریباں' 1961 میں انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ زیر نظر مجموعہ 'کڑوی خوشبو' میں اریب کا تمام کلام شریک ہے۔ 'پاس گریباں' کی تمام تخلیقات اس میں شامل ہیں۔'

آخر میں مزید لکھا:

''اس مجموعہ کلام کو کسی مقدمے کے بغیر پیش کیا جارہا ہے۔ اریب کا یہ بعد از مرگ شائع ہونے والا مجموعہ، شاعر کے ذہن، پیام اور کلام کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ امید ہے کہ قارئین مقدمہ کی روایت کی کمی کو اس جواں مرگ شاعر کے کلام اور اس کے ذہن اور اس عہد کی تحریکات کے پس منظر میں کلام کے جائزے سے پورا کریں گے۔''

عابد علی خان کے اس فقرے نے راقم کو فرصت کے لمحات میں اس مجموعے کے سیر حاصل مطالعے کی جانب ترغیب اس لیے بھی دلائی کہ ایک ہی کتاب میں اریب کا مکمل کلام دستیاب تھا۔

سلیمان اریب نے 1955 میں ماہنامہ 'صبا' کا اجراء کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق غالباً اسی زمانے میں بتدریج ترقی پسندی سے جدیدیت کے کارواں میں شمولیت دراصل ان کی زمانہ شناسی کے لازوال ہنر کی بدولت ممکن رہی ہے۔ اپنے رسالے 'صبا' کے ذریعے ادب کو بدلتے وقت کے ساتھ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اک نئی جہت کا زور شور سے آغاز کے بطور ابتدا ہی سے انھوں نے وحید اختر، عزیز قیسی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی جیسے جید شعراء و نقادوں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی خوب پذیرائی کی، گویا 'جدید ادب' کو فروغ دینے کے ساتھ اس رجحان کے زیر اثر نئے لکھنے اور سوچنے والوں کو ایک مضبوط اور مستحکم پلیٹ فارم مہیا و عطا کرنے میں کامیاب رہے۔

ان کے مجموعہ کلام 'کڑوی خوشبو' کے مطالعے کے دوران ان کی شاعری میں رجعت پسندی اور ترقی پسند تحریک کے خیالات سے مبرا جدید رجحان کا حامل کلام جو محسوس کیا جاتا ہے، ان میں اولیت 'کڑوی خوشبو' کے عنوان سے ایک نظم مسلسل کو حاصل ہے جو سات علیحدہ بندوں میں کہی گئی ہے۔ نظم کے درمیانی یعنی چوتھے بند میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

رات چپکے سے مرے کمرے میں
چاند کی ایک کرن در آئی

اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا
آؤ ہم چاند تک ہو آئیں ذرا
چاند کی سیر سے جب میں لوٹا
گھر کی دہلیز پہ سورج تھا کھڑا!!

ایک اور مختصر سی نظم 'تمنائے ہم کلامی' میں وہ یوں گویا ہیں:

تمام عمر مری کٹ گئی ہے باتوں میں
مذاکرات و مباحث میں یا مجالس میں
زباں ہو منہ میں تو خاموش رہنا مشکل ہے
تمام عمر گنوا دی تو پتہ یہ چلا
ترس گیا ہوں میں خود سے کلام کرنے کو

سلیمان اریب بنیادی طور پر نظم کے شاعر رہے ہیں، ویسے 'کڑوی خوشبو' میں بڑی تعداد میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعہ کلام کے بالکل اخیر میں شامل غالب کی نذر کی گئی دو غزلیات کے مطلع و مقطع واقعی خوب ہیں، پہلی غزل کا مطلع و مقطع ملاحظہ ہو:

اک سایہ دوسرے کے مقابل نہیں رہا
یا درد اب رہا نہیں، یا دل نہیں رہا
کہنی پڑی زمینِ اسد میں غزل اریب
گو میں فلک پہ کہنے کا قائل نہیں رہا

دوسری غزل کا مطلع و مقطع یوں ہے:

پل بھر تری نگاہ جو ہم پر ٹھہر گئی
آیت ہمارے سینے میں جیسے اتر گئی
پوچھیں اریب ہی سے کہ ویرانی جہاں
نکلی ہمارے گھر سے تو پھر کس کے گھر گئی

اریب کے ہاں خودداری یعنی 'انا' کو اک الگ ہی معنوں میں برتا گیا ہے جسے ان کی نظم بعنوان 'تسکینِ انا' کی متاثر کن آخری تین سطریں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

میں اسے دیکھ کے چپکے سے گذر جاتا ہوں
یہ تو میں خود ہوں وہ احمق جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے !!

آیئے نفسِ مضمون کے عنوان کے دوسرے حصے کی جانب بڑھیں۔ کہتے ہیں کہ جدیدیت اور جدت پسندی کی اصطلاحیں عموماً ترقی پسند ادب کے مقابل نئے لب و لہجے و نئے موضوعات کے طور پر رائج رہی ہیں۔ جہاں ترقی پسند ادب کا غالب رجحان عوام کے مسائل کو ادب میں جگہ دینا رہا ہے وہیں جدیدیت کے رجحان نے اس کے مقابل شخصی و نجی مسائل کو جگہ دی اور محبت و عاشقی کے فرسودہ موضوعات کو بدلتے ہوئے ایسے احساسات اور رجحانات کو جو جدید معاشرے میں پیدا ہو رہے تھے، ادب کا موضوع بنایا۔ سلیمان اریب کے رسالے 'صبا' کے علاوہ حیدرآباد دکن سے باصلاحیت تخلیق کاروں اور تازہ کار و فعال نوجوان نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ممتاز صحافی، افسانہ نگار و شاعر اعظم راہی نے 1958 میں ماہنامہ 'پیکر' کا اجرا کیا تھا۔ 'ادارہ پیکر' سے وابستہ ادیبوں و شاعروں پر مشتمل گروپ ہی آگے چل کر 1975 میں حیدرآباد لٹریری فورم 'حلقہ' کی شکل میں تبدیل ہوا۔

سلیمان اریب کا یوں تو 1970 میں انتقال ہوا لیکن اپنے خاندان کے بڑے بزرگوں سے میں سنا ہے کہ وہ چند ایک مرتبہ ہمارے بنگلے 'داؤد منزل' واقع جدید ملک پیٹ، حیدرآباد بھی تشریف لائے۔ 'داؤد منزل' کی میرے نزدیک تاریخی حیثیت اس سبب بھی ہے کہ میرے دادا سید داؤد صاحب مرحوم، گتہ دار تعمیرات، سابق ریاست حیدرآباد دکن نے اس بنگلے کو نواب میر بہبود علی سے جنوری 1951 میں خریدا تھا۔ اس دور میں جدید ملک پیٹ کا یہ علاقہ نواب اشرف نواز جنگ کے باغات کے نام سے مشہور تھا۔ اس بنگلے کا نام 'داؤد منزل' راقم کے تیسرے چچا سید منیر نے جو خاصی ادب نواز شخصیت رہے ہیں، نے رکھا تھا۔ اس بنگلے کے در و دیوار، گذشتہ صدی کے آخری تین دہوں کے دوران جدید لب و لہجے کی مشہور و معروف ادبی شخصیات کی آمد و رفت کے گواہ رہے ہیں جن میں مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، عالم خوندمیری، محترمہ خدیجہ عالم خوندمیری، مجتبیٰ حسین، انور معظم، محترمہ جیلانی بانو، عاتق شاہ، غیاث صدیقی، وحید اختر، مغنی تبسم، محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ، تاج مہجور، احمد جلیس، مصطفیٰ علی بیگ، راشد آزر، قدیر زماں، مضطر مجاز، محمود انصاری، صفدر حسین، مصحف اقبال توصیفی، مصطفیٰ کمال، یوسف کمال، ساجد اعظم، اعظم راہی، رؤف خلش، حسن فرخ، غیاث متین، مسعود عابد، صلاح الدین نیر، علی الدین نوید، علی ظہیر، مظہر مہدی، طالب خوندمیری، یوسف اعظمی، ناصر کرنولی، بیگ احساس، مظہر الزماں خان، محسن جلگانوی، رؤف خیر، اعتماد صدیقی، حکیم یوسف حسین خاں، رضا وصفی، رفعت صدیقی، نصرت محی الدین وغیرہ شامل ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی کم سنی، لڑکپن، نوعمری میں ان نامور ادبی شخصیات کو 'داؤد منزل' ہی میں قریب سے دیکھا۔

1960 کے اوائل میں رؤف خلش، حسن فرخ، غیاث متین اور مسعود عابد پر مشتمل چار شعرا کا ایک گروپ ہوا کرتا تھا۔ سلیمان اریب نے ایک محفل میں ان چار شعراء کا کلام سنا تو منتخب کلام اپنی تصویر کے ساتھ لانے کی ہدایت کی۔ بعد ازاں 'صبا' کے شماروں میں ان چار شعرا کا کلام شائع ہونے لگا اور ادبی دنیا میں ان چاروں کی جدید لب و لہجے کے حوالے سے پہچان بنی۔ سلیمان اریب، ان چار شعرا کو ازراہ تفننِ طبع 'چار درویش' کہا کرتے تھے۔ راقم کی عمر کا مکمل دور، ان چار شعراء کے نہ صرف قریب بسر ہوا بلکہ ان کی بھی تخلیقات کے علاوہ تمام مجموعہ کلام سے استفادے کا موقع بھی بہرحال نصیب رہا۔ راقم کی یادداشت کے مطابق غالباً 1988 میں حسن فرخ نے حیدرآباد لٹریری فورم 'حلقہ' کے زیر اہتمام رؤف خلش کے تیسرے مجموعہ کلام 'صحرا صحرا اجنبی' کی رونمائی کے موقع پر ان چار شعرا پر اپنا تفصیلی مضمون بعنوان 'جدید قصہ چار درویش' پیش کیا تھا۔

متذکرہ چاروں شعرا کے تفصیلی تعارف اور ان کے

کلام کے سیر حاصل مطالعے پر مبنی تاثرات کو کسی اور علیحدہ موقع پر اٹھائے رکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ ان کی تخلیقات میں مستعمل چند ایک شاعرانہ رویوں اور برتی گئی علامتوں و استعاروں کو مثالوں سے پیش کرنا بہتر سمجھوں گا۔ چاروں شعراء کو نظم و غزل دونوں میں عبور حاصل ہے۔ نظموں میں برتا گیا 'صوتی آہنگ' ان سبھی کے ہاں متاثر کن رہا ہے۔ رؤف خلش کے ہاں اسے ان کی نظم 'شہر جدہ کے لیے' میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے:

لکیریں جدولوں کی پہلے بیضوی بنیں
بلندیوں سے دھیرے دھیرے نیچے کو اتر گئیں
پانیوں نے خشکیوں کے بال،
مٹھیوں میں پھر جکڑ لیے
مرکزوں سے نقطے ہٹ گئے
مدوری خطوط... چھوٹے چھوٹے محوروں میں بٹ گئے
حساب داں عرق عرق... مہندسوں کے چہرے فق
رمق رمق پہ چل گیا ہے سامری کا سحر
شفق شفق... انڈیلتی ہے شام روشنی کا زہر!
طبق طبق... زمیں میں دھنس رہا ہے شہر!!
خبر نہیں یہ جبر ہے یا قدر ہے یا قہر!!!

حسن فرخ کے ہاں 'صوتی آہنگ' ان کی ایک نظم 'فنا ہی بقا ہے' میں در آیا ہے:

فنا ہی فنا ہے، بقا ہی بقا ہے، بقا ہی بقا ہے
میں مظہر ہوں اس کا کہ اس جسم خاکی میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے
بس اک ارتباط رو ضبط ترسیل سے منعکس بس وہی ہے، وہی ہے
مری انتہا، ابتداء، بس یہی ہے، یہی ہے شہادت، یہی ہے شہادت!
یہی ہے فنا بھی، یہی ہے بقاء بھی، فناء ہی بقاء ہے، بقاء ہی بقا ہے!!

غیاث متین کے ہاں یہی 'صوتی آہنگ' پاکستانی ادیبوں و دوستوں کی نذر کی گئی نظم 'سفر بے شرط' کے آخری دو بند میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

میں جب ملوں، تو یوں ملوں
وہ جب ملیں تو یوں ملیں
کہ جیسے صبح، شام سے/کوئی خود اپنے نام سے
کہ جیسے دھوپ، چھاؤں سے/غریب شہر گاؤں سے
کہ جیسے لب، دعاؤں سے
وہ یوں ملیں / میں یوں ملوں
میرے خدا! / ہے یہ دعا
یہی دعا!!

مسعود عابد کے ہاں 'صوتی آہنگ' ان کی نظم 'نئے سال کی بچی نظم' کے آخری بند میں اتر آیا ہے:

پھر نئے سال پر دہراتا ہوں اپنا وہ عمل
ہے دعا میرے خدا اب کے برس!
امن کے خواب کی تعبیر بھیانک نہ بنا
میرے گیتوں کو فقط گیت ہی رکھ
ان کو نوحہ نہ بنا!
ہے دعا میرے خدا اب کے برس!
مجھ کو جھوٹا نہ بنا!!

جدید شاعری میں برتی گئی کئی علامتوں جیسے 'تتلی، سمندر، چاند، سورج، دروازے، کھڑکی، دھوپ، آئینہ' وغیرہ کو ان چاروں ہی شعرا کے ہاں منفرد انداز میں استعمال کیا گیا بلکہ بہترین و جداگانہ طرز اظہار میں ان سے پیکر تراشی کی گئی ہے، رؤف خلش کے ہاں ذیل اشعار میں انھیں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

ان رتوں میں گھل جائیں، تتلی بن کے اڑ جائیں
ہے دھلا دھلا منظر، ہے کھلی کھلی کھڑکی
جذب کر کے رکھ لینا، دھڑکنیں ہتھیلی میں!

جب سے میں سفر میں ہوں، ہم سفر ہیں دروازے
نہ آئے شہر میں سورج کے، منہ چھپائے چاند
ہمیشہ مملکت شب میں سر اٹھائے چاند
وہاں سنا تھا سمندر کی پیاس بجھتی ہے
جو لوٹ آیا تو ہوں پیاس کا سمندر میں
چھپنے کو شہر ذات بچا تھا مرے لیے
اس شہر میں بھی چاروں طرف آئینے لگے

'تتلی' کی علامت کو حسن فرخ نے اپنی نظم 'دل و ذہن کا رشتہ' کی ابتدائی سطروں میں یوں برتا ہے:

یادیں: بچپن سے اب تک کی
جو تتلیوں کی طرح انگلیوں میں
مسک کے گلے شکوے کرتی ہیں

یادوں کے چاند دل میں اترنے لگے ہیں اب
آنکھوں میں جگمگانے لگا سرمئی گلاب
ہمارے ذہن کی کھڑکی سے اڑ چکی ہے وفا
ترے خلوص کی دوشیزگی بھی کم کم ہے
ڈوبتی شام کا منظر، کبھی ایسا تو نہ تھا
جتنا پیاسا ہے سمندر، کبھی ایسا تو نہ تھا
آئینہ ٹوٹ کے سو شکلیں دکھاتا کب ہے
بات کہہ کہہ کے بدلنا نہیں آتا ہم کو

غیاث متین کے ہاں جدید علامتوں اور پیکر تراشی کے عمل کو ان اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

تتلیوں کے پر جیسے، خواب ہیں متین اپنے
ہاتھ بھی نہیں آتے، سلسلہ بناتے ہیں
اپنے لہجے کی یہی پہچان ہے
دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ
مجھے ماضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں
جب پہاڑوں سے ملی داد ہنر کی اپنے
داستاں ہم بھی سمندر کو سنانے نکلے
عکس جس کو تم سمجھتے ہو متین
آئینے کے بھی ہے اندر آئینہ

مسعود عابد کے ہاں بھی جدید علامتیں اور پیکر سازی یوں مستعمل ہے:

راستے ہیں کہ رنگوں میں لپٹے ہوئے
ہم قدم، ہم نفس، ہم سفر تتلیاں
ہزاروں سوئے جذبوں کو ہوا دیتی ہیں دیواریں
نیا اک زندگی کا فلسفہ دیتی ہیں دیواریں
ڈوبتا ہوا سورج سینۂ سمندر پر
لکھ رہا ہے لہروں سے، بلبلوں کی تحریریں
ڈوبتے سورج میں میرا آج گم ہونے لگا
آنکھ کی پتلی میں آنے والا کل محفوظ ہے

'انا' کسی بھی خوددار شخص کے لیے اس کا اپنا نجی سرمایہ ہوتا ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے لٹانے کو آمادہ نہیں ہوگا۔ رؤف خلش نے 'انا' کے اس مخصوص فلسفے کی یوں ترجمانی کی ہے:

اتنے اُڑے کہ دور اُڑا لے گئی ہوا
اتنے جھکے کہ سانس انا کی اُکھڑ گئی

جبکہ حسن فرخ نے روح کے لیے 'انا' کی موجودگی کو سب سے اہم قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کاسۂ روح کھنک جائے تو حیران ہو کیوں
اس میں کچھ بھی نہ سہی ایک انا ہے تو سہی

مسعود عابد کے ہاں خودداری یعنی 'انا' کی موجودگی کے باوجود محض مصلحت کی بنا پر کسی کو بھی نظر سے گرا دینے کی منظرکشی کی گئی ہے:

اک مصلحت نے ان کی نظر سے گرا دیا
ورنہ انا کی ایک علامت رہے ہیں ہم

■

Syed Moazzam Raaz
Dawood Manzil
Malik Pet Jadeed
Hyderabad - 24 (Telangana)
Mob.:09849881011

ندیم راہی مراد آبادی

جگر کا سدا بہار غزلیہ سفر

جگر مراد آبادی سرزمین مراد آباد میں پیدا ہوئے جو ایک صنعتی شہر ہے جسے مغل شہنشاہ شاہجہاں کے ایک سپہ سالار رستم مراد نے بسایا تھا جو آج شہر جگر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں کی خاک نے جگر کے قدم چومے جس کی فضاؤں میں سانس لی، اردو عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور یہاں کی ایک دوشیزہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ چشمہ فروشی کے کاروبار سے وابستگی کی۔ آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تو ضرور تھی لیکن آپ کے کلام میں وہ تغزل وہ بانکپن، سلاست روانی نہیں تھی جو ایک شاعر کو شاعر بناتی ہے۔

ایک سیاہ دن ایسا بھی آیا جب جگر صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کی شریک حیات جسے وہ بے پناہ چاہتے ہیں بے وفا ہے.. دل تڑپ گیا، کلیجہ منھ کو آ گیا، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔ جگر کا جگر پھٹ گیا.... پہلے اپنی بیوی کو طلاق دی بعدہ اپنے پیشے سے سبکدوش ہو کر شراب کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی شخص علی سکندر، غیر معمولی شہنشاہ تغزل جگر مراد آبادی بن گیا:

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں
اے محتسب نہ پھینک میرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب

اس دیرینہ دور میں بھی جسے بعد میں جگر صاحب خود بھی دور معصیت کہہ کر یاد کرتے تھے۔ ان کی مزاجی کیفیت کتنی شریفانہ اور معصومانہ رہیں...؟ اس ضمن میں رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں:

''میں نے جگر صاحب کو ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت، نوجوان، آزاد منش عورتوں میں، ماں بہن، بیٹیوں میں، عمائد اور اکابرین کی موجودگی میں، طلبا، اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں، گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابل گرفت نہیں پایا۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلتی تھی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے حجاب نہ ہوتی تھی۔''

جگر صاحب اصغر گونڈوی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کا حکم ہوا کہ ان کی چھوٹی سالی محترمہ نسیم سے وہ نکاح کر لیں تو انھوں نے نکاح کر لیا پھر انھوں نے کہا کہ وہ (جگر مراد آبادی) مسلسل چھ چھ ماہ گھر سے باہر مشاعروں میں رہتے ہیں۔ فرضِ ازدواج نبھانے سے قاصر ہیں لہٰذا اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو انھوں نے طلاق دے دی۔ جگر صاحب اپنی دوسری بیوی محترمہ نسیم کو بھی بے حد چاہتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد شعروں میں کیا ہے:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
اُف وہ روئے تابناک چشم تر میرے لیے
ہائے وہ زلفِ پریشاں، تاسحر میرے لیے
اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں

یہ پہلے زخم پر دوسرا زخم تھا جو بے حد شدید و کاری تھا جس کی شدت نے جگر صاحب کو غم کے اتھاہ ساگر میں ڈبو دیا۔ شراب کو اپنی محبوبہ بنا لیا اور ایسی ایسی اعلیٰ غزلیں کہیں اور انھیں اپنی نغمگی و درد بھری آواز دی کہ لوگ دیوانے ہو گئے۔

جب وہ شعر پڑھتے تو ان کے کلام میں اتنا درد اور آواز میں اتنا سوز ہوتا کہ ان کے اشعار سننے کے بعد لوگ دل پکڑ کر رہ جاتے۔ یہ تاثیر کلام ہی تھی جس نے ان جیسے رندلا ابالی کو مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ عبدالغنی منگلوری اور دوسرے ثقہ و بزرگ ترین افراد کو ہم نشیں بنا لیا تھا اور یہ پاک باز لوگ ان کے کلام سے لطف لینے پر مجبور ہوتے:

یاد ہیں اب تک جگر وہ بے قراری کے مزے
درد پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے
بیٹھے ہی بیٹھے آگیا، کیا جانے کیا خیال
پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم
حسنِ کافر شباب کا عالم
سر سے پا تک شراب کا عالم
دل میں کسی کی راہ کیے جارہا ہوں میں
کتنا حسین گناہ کیے جارہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں
کہاں تک عذاب محبت اٹھائیں
بس اب وہ ہمیں، ہم انھیں بھول جائیں

جمیل مہدی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''جگر صاحب دہلی کے ایک مشاعرے میں جب غزل پڑھنے بیٹھے تو نشہ میں اس قدر دھت تھے تقریباً بیس منٹ تک جھوم جھوم کر صرف ایک ہی مصرع پڑھتے رہے:

دل کو جلا کے داغ تمنا دیا مجھے

مشاعروں میں انھیں دیکھنے سننے والے سیلاب کی طرح امڈ پڑتے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے اٹھاتے اور برداشت کرتے لیکن لوگوں میں ہمت نہیں تھی کہ دم مار سکیں۔ چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ بیس منٹ کے بعد دوسرا مصرع یاد آیا تو آنکھیں نیم وا کر کے اس انداز میں سنایا کہ سامعین کلیجہ پکڑ کر رہ گئے:

اے عشق تیری خیر ہو یہ کیا دیا مجھے

یہ مصرع تقریباً دس منٹ تک گنگنانے کے بعد مقطع پڑھ دیا:

دعویٰ کیا تھا ضبط محبت کا اے جگر
ظالم نے بات بات پہ تڑپا دیا مجھے

جگر ایک بیدار انسان تھے۔ وطن پرستی وطن دوستی ان کے ریشے ریشے میں سمائی تھی۔ ان کے پیکر میں ایک عجیب و غریب انسان ملتا ہے۔ جو محبت ہی محبت شرافت ہی شرافت تھے عالم سرمستی میں بھی کبھی وہ انسانیت سے گرتے نظر نہ آئے بعض اوقات وہ اس اچانک طریقے پر خطرناک سے خطرناک سچ بول جاتے ہیں کہ حاضرین پر سناٹا چھا جاتا

مقطع پڑھنا تھا کہ مشاعرے میں جیسے رقت طاری ہوگئی، کئی طرف سے سسکیاں سنائی دیں اور جگر صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت لے کر صرف چار مصرع وہی سنا سکتے تھے اور ان ہی سے سنے جاسکتے ہیں۔''

جگر ایک بیدار انسان تھے۔ وطن پرستی وطن دوستی ان کے ریشے ریشے میں سمائی تھی۔ ان کے پیکر میں ایک عجیب و غریب انسان ملتا ہے۔ جو محبت ہی محبت شرافت ہی شرافت تھے عالم سرمستی میں بھی کبھی وہ انسانیت سے گرتے نظر نہ آئے بعض اوقات وہ اس اچانک طریقے پر خطرناک سے خطرناک سچ بول جاتے ہیں کہ حاضرین پر سناٹا چھا جاتا:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
کوچے کوچے گوشے گوشے لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل بستی بستی آگ لگی ہے آگ

محترم قمر گونڈوی کے مطابق ''ملک کے معروف و مقبول شعرا جگر صاحب سے ان کی رہائش گاہ گونڈہ ملنے آتے جن میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا، نزالہ صاحب، شعری بھوپالی، گہر گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ہندی گورکھپوری، شمیم جے پوری، فنا نظامی، مجروح سلطان پوری، نیاز فتح پوری، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا، عارف عباسی، قمر مرادآبادی سرفہرست ہیں۔ قمر مرادآبادی نہایت ہی خموش طبیعت انسان تھے۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جاتے تھے۔ جگر صاحب تمام ملنے جلنے والوں سے ملاقاتیں کرتے رہتے نہ تو قمر صاحب ان کو اپنی طرف مخاطب کرتے اور نہ ہی جگر صاحب ان سے کچھ

''آخر وقت تک جگر کی شاعری میں پھیکہ پن نہیں آیا ان کی آواز دوسرے شعرا کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی وہ ستر کی عمر کو پہنچ کر بھی ہمارے لیے تبرک نہیں بنے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانۂ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے۔ ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔''

کہتے تاہم فرصت ملتے ہی اب صرف اور صرف قمر صاحب سے محو گفتگو ہو جاتے۔ اب چاہے آپ کے دیرینہ دوست مجسٹریٹ عبدالحمید آئیں یا پھر آپ کے رازدار ہم نوالہ ہم پیالہ گونڈہ کے تحصیل دار جناب قیس الہدیٰ فاروقی ہی کیوں نہ ہوں اس وقت کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ جگر صاحب کا کہنا کہ اب وہ اپنے گھر کی بات کر رہے ہیں۔ اپنی سرزمین مرادآباد کے افراد کا حال چال پوچھنے میں محو ہیں....''

9 ستمبر 1960 کی علی الصبح جگر مرادآبادی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مشاعرے سونے پڑ گئے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ اردو ادب کا ایک شہنشاہ پرستان اردو کو روتا بلکتا چھوڑ گیا۔ ادبی آسمان گہن آلود ہو گیا۔ آپ کے جنازے میں قرب و جوار اور دور دراز سے لوگوں کے آنے کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ نماز جنازہ آٹھ بار پڑھائی گئی۔ شعرا، ادبا، علما، فلاسفر، سیاست داں، اہل اقتدار، تجار و دیگر ہزاروں افراد نے جنازے میں شرکت کی۔

گونڈہ وبسا بسایا ادبی شہر قصہ پارینہ ہو گیا:

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جگر صاحب کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار جن لفظوں میں کیا تھا وہ آج بھی اتنے ہی سچے ہیں۔ ''آخر وقت تک جگر کی شاعری میں پھیکہ پن نہیں آیا ان کی آواز دوسرے شعرا کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی وہ ستر کی عمر کو پہنچ کر بھی ہمارے لیے تبرک نہیں بنے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانہ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے۔ ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔''

■

Mr. Nadeem Raayee Moradabadi
198, Chaudhry House, Galshaheel
Muradabad - 244001 (UP)

جدید لب و لہجہ کا شاعر
محمد علوی

محمد یوسف رضا

اردو کے جدید لب و لہجے کے شاعر محمد علوی نے نظم اور غزل کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ وہ اردو کے نمائندہ شاعر شمار کیے جاتے تھے۔ محمد علوی 10 اپریل 1927 کو احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ محمد علوی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ حالانکہ ابھی اس تحریک کو باقاعدہ شروع ہونے میں کچھ سال باقی تھے لیکن ترقی پسند رجحان پہلے سے ہی نمودار ہو رہے تھے۔ نوعمری سے ہی انھیں شعر کہنے کا ہنر آ گیا تھا۔ ابتداء میں انھوں نے بہت کم اشعار کہے۔ اردو اور فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کا مطالعہ بہت کم کیا۔ ان کی شعری کائنات میں چار شعری مجموعے ہیں جن میں پہلا 'خالی مکان' ہے جو 1963 میں اور دوسرا شعری مجموعہ 'آخری دن کی تلاش' ہے جو کہ 1968 میں شائع ہوا اسی طرح تیسرا اور چوتھا مجموعہ بالترتیب 'تیسری کتاب' 1978 میں اور 'چوتھا آسمان' 1991 میں شائع ہوئی۔ اسی چوتھے شعری مجموعے پر 1992 میں انھیں ساہتیہ اکادمی انعام بھی ملا، اور انھیں غالب انعام سے بھی نوازا گیا۔ 29 جنوری 2018 کو احمد آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔

محمد علوی کی نظموں میں ان کے عہد کی عکاسی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے بھی اپنی نظموں میں اس دور کے پیدا شدہ مسائل کو پیش کیا ہے اور ایک تخلیق کار ہونے کا فرض بھی ادا کیا ہے۔ 1995 میں 'رات ادھر ادھر روشن' کے نام سے ان کا کلیات شائع ہوا۔ 'خالی مکان' کے پیش لفظ میں محمود ایاز نے ان کی نظموں سے متعلق لکھا ہے کہ:

''میں نے جب بھی ان کی نظمیں پڑھیں مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ ایک بچے کی طرح شاعری کرتے ہیں۔ ان کا چیزوں کو دیکھنے کا انداز ایسا ہے جیسے ہر چیز پہلی بار دیکھ رہے ہوں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مشاہدے کی تازگی اور احساس کی سادگی، ایک تحیر کی کیفیت بھی ملتی ہے۔''

محمد علوی نظم اور غزل دونوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے دونوں پر ہی یکساں عبور حاصل کیا ہے۔ اگر ان کی کل شعری تخلیقات یعنی 'خالی مکان'، 'آخری دن کی تلاش' 'تیسری کتاب' اور 'چوتھا آسمان' کو دیکھا جائے تو ان میں نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے زیادہ ہے۔ انھوں نے اکثر نظموں کے عنوانات سے نظموں میں تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔ دیگر شعراء کی طرح محمد علوی نے بھی فسادات سے متعلق نظمیں لکھی ہیں لیکن اس طرح کی نظمیں کم ہی ہیں۔ یوں تو بہت سے شعراء نے اس طرف اتنا دھیان دیا ہے کہ ان کی شاعری میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات یا فرقہ وارانہ حالات کا عکس زیادہ ہے اور کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان حادثات کا اپنی شاعری پر ذرا بھی اثر پڑنے نہیں دیا۔

موجودہ دور میں جو بھی حالات ہمارے سامنے ہیں ان کی عکاسی محمد علوی کے یہاں ملاحظہ کیجیے:

وقت یہ کیسا آن پڑا ہے
خطرے میں انسان پڑا ہے
بھوکا ننگا مر رہنے کو
سارا ہندوستان پڑا ہے

محمد علوی نے فرقہ وارانہ فسادات کو اپنی شاعری میں جگہ تو دی ہے لیکن ہلکے انداز میں فسادات سے متعلق ان کے کلیات میں دو چار نظمیں ہی ہیں جیسے خوف، ویل کم، فالج زدہ شہر، ڈپریشن اور جنگ جاری ہے۔ ان کی نظم 'خوف' پیش ہے۔

یہ سب دکانیں
یہ راستے
یہ ہجوم لوگوں کا
رکشے، چلتی بسیں، یہ کاریں
یہ سب کا سب بتا رہا ہے
کہ شہر اچھا بھلا رہا ہے
مگر ابھی اک دکاں جلے گی

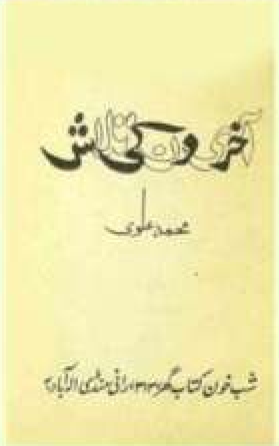

مگر ابھی اک چھری چلے گی
یہ خوف سر کیوں اٹھا رہا ہے

اس نظم میں انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے جو کل بھی جاری تھی اور آج بھی جاری ہے۔ مذکورہ نظم میں ابھی شہر کی فضا پُر سکوں ہے سبھی لوگ اپنے اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہیں۔ یہ ساری باتیں چین وسکون کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ لیکن نظم میں اگلے تین مصرعوں میں شاعر نے واضح کردیا ہے کہ یہ پُر سکوں فضا اس حادثے کی غماز ہے جس میں دکانیں، مکانات یہاں تک کہ انسان بھی جل جائیں گے اور چاروں طرف چھری خنجر ہی نظر آئیں گے۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہوجائے گا۔ محمد علوی نے اپنے خیال کے اظہار کے لیے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ روز مرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔ انھیں الفاظ کے تانے بانے سے انھوں نے نظم میں تاثیر پیدا کردی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور نظم میں 'ویلکم' ملاحظہ ہو:

تو اک گدھ اڑا
اور پورب میں پچھم میں
چاروں دشاؤں میں جاکر
ہر اک دوست کو
اس نے کل صبح کھانے پہ مدعو کیا
اور پھر شام کو
شہر میں آکے آرام سے سو گیا!
صبح مہمان آئے تو ان کے لیے
شہر کی سونی سڑکوں پہ لاشیں سجی تھیں
اور گدھ چوک میں
آئے مہمان کو
دونوں پر کھول کے
ویلکم کررہا تھا!!

اس نظم میں بھی انھوں نے جنگ اور فسادات کی عکاسی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو بے شمار انسان مرتے ہیں، ان کی لاشیں سڑکوں پر یونہی کئی روز تک پڑی رہتی ہیں جو جانوروں اور پرندوں کا نوالہ بنتی ہیں۔ گدھ جو کہ گلے سڑے ہوئے گوشت کھاتا ہے محمد علوی نے گدھ کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ سیاست میں بھی بہت برے برے کام ہوتے ہیں۔ سیاسی لوگ اپنے مفاد کے لیے انسانوں کو موت کے منہ میں ڈالنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ یہاں پر گدھوں اور سیاسی لوگوں میں یکسانیت دکھائی گئی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ان کی یہ نظم علامت نگاری کی ایک بہترین مثال ہے اور عالمی یا قومی پیمانے پر رونما ہونے والے حالات سے ان کے جذبات کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہے۔ معروف ناقد وارث علوی نے ان کی شاعری سے متعلق ایک جگہ لکھا تھا کہ علوی کے یہاں انسان کھلونوں میں اور کھلونے جانداروں میں بدل جاتے ہیں، پوری کائنات ایک نرسری بن جاتی ہے جس میں نیل کنٹھ ایک بچے کی طرح کھیلتا ہے۔

محمد علوی کی اکثر نظمیں مختصر ہیں۔ ان کی نظم نگاری کو سمجھنے کے لیے انہی کی ایک مختصر سی نظم پیش کی جاتی ہے جس کا عنوان 'پیش لفظ' ہے:

یہ جو ہم تم
روز بولتے رہتے ہیں
ان لفظوں کی
مدھم مدھم روشنیوں میں
میں نے اپنے
آس پاس کی چیزوں کو
اور پاس سے
دیکھنے کی کوشش کی ہے!

اس نظم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مشکل پسندی اختیار کرنے کے بجائے روز مرہ کے الفاظ میں اپنے احساسات وجذبات پیش کیے ہیں۔ محمد علوی نظم جدید کے شاعر ہیں، لیکن دوسرے جدید شعرا کی طرح ان کی نظموں میں ابہام نہیں ملتا۔ اس سے یہ بات تو واضح ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں ابہام کو جگہ نہ دے کر جدید نظم نگاری میں مثبت کردار ادا کیا ہے اور جدید نظم کو صحت کے ساتھ ساتھ ایک معیار بھی عطا کیا ہے۔

جیسا کہ شروع سے ہی اردو شاعری (چاہے وہ غزل ہو یا نظم) میں عشق ومحبت کو پیش کیا گیا ہے، محمد علوی نے بھی اپنی نظموں میں کہیں کہیں عشق ومحبت سے متعلق اپنے احساسات وجذبات پیش کیے ہیں۔ بہت سے شعرا تو عشق ومحبت ہی کی شاعری کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں۔ لیکن محمد علوی کے یہاں اس سے متعلق کچھ ہی نظمیں ہیں۔ جیسے تلاش، قرب و بعد، رات آرہی ہے، التجا اور الھڑ لڑکی، نظم 'التجا' ملاحظہ ہو:

چاند، مہرباں چاند
رات کو روشن رکھ
اپنی نورانی بانہوں میں
چوک، گلی، گھر، آنگن رکھ
ان کو آنے میں کوئی تکلیف نہ ہو
تیری انگلی تھام کے گھر تک آجائیں
پھر چاہے تو گھور اندھیرے چھاجائیں
آج کی رات میرا من رکھ
چاند مہرباں چاند
رات کو روشن رکھ

اس نظم میں عاشق کو معشوق کا انتظار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ چاند سے التجا کرکے کہتا ہے کہ اے چاند مجھ پہ یہ مہربانی کر کہ ابھی جب تک 'وہ' نہ آجائیں تو اپنی چاندنی سے چوک، گلی، گھر آنگن روشن رکھ۔ انھیں یہاں تک آنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ان کے آنے کے بعد پھر چاہے تو چلے جانا کتنا بھی اندھیرا کرنا لیکن میری اس التجا کو سن کر میرا من رکھ لے۔ اس نظم میں ہجر کی حالت میں وصل کی امید کو آسان اور سادہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

محمد علوی کے یہاں موضوع اور اسلوب کے تجربوں کا خاص رجحان نظر آتا ہے جو چاروں طرف کی خبر رکھتا ہے، ان کی نظموں میں احساس کی ندرت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

■

Mohd Yusuf Raza
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9990778665

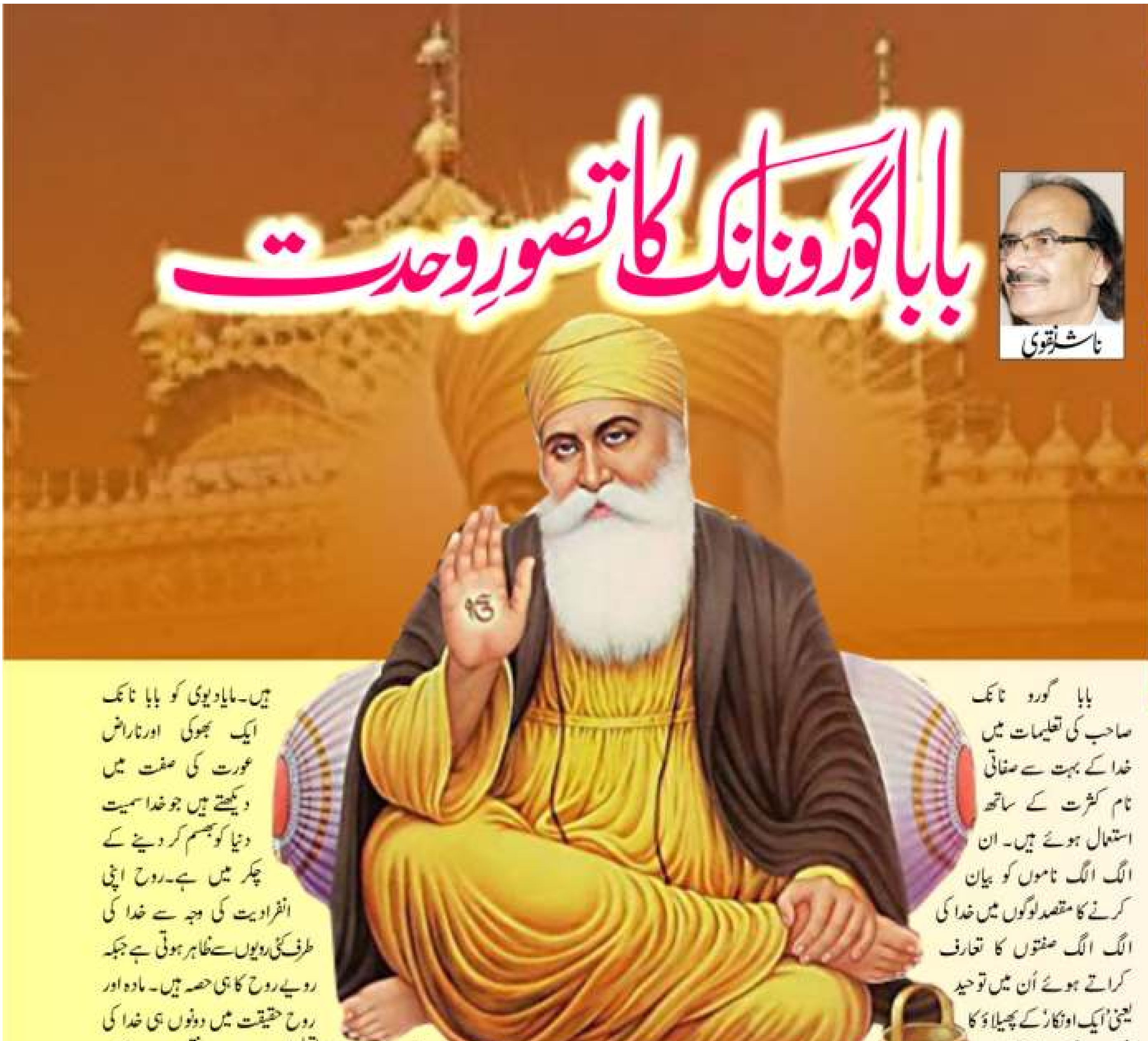

بابا گورو نانک کا تصورِ وحدت

ناشر نقوی

بابا گورو نانک صاحب کی تعلیمات میں خدا کے بہت سے صفاتی نام کثرت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ان الگ الگ ناموں کو بیان کرنے کا مقصد لوگوں میں خدا کی الگ الگ صفتوں کا تعارف کراتے ہوئے اُن میں توحید یعنی 'ایک اونکار' کے پھیلاؤ کا شعور پیدا کرنا تھا۔ قرآن شریف نے دنیا کے روحانی ادب میں خدا کی قدرت، تخلیقی قوت اور الگ الگ صفات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دے کر انسان کی فکری ترقی کی راہ ہموار کی ہے۔ بابا نانک کے یہاں خدا کا اہم ترین نام 'ست' یعنی مطلق سچائی ہے جس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ ہی بنیادی ذریعہ ہے۔ 'اونکار ست گرو پرساد' کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی خدا لاشریک، گورو کے وسیلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ وہ ایک ہے، یکتائی اور کثرت دونوں اُس کے لیے سچائی ہیں۔ کیونکہ وہ جب چاہتا ہے ایک ہو جاتا ہے اور جب چاہتا ہے 'کثرت' میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ ہر شے کا جوہر اور لافانی ہے۔ اپنی ذات میں اکیلا اور تمام مخلوقات کا حاکم ہے۔ وہ خوف اور نفرت سے ماورا ہے یعنی 'نربھو' اور 'نرویر' ہے۔

بابا نانک نے خدا کی خوبیوں کا موازنہ، انجیر کے درخت سے کیا ہے جس کی جڑیں اوپر کی طرف پرورش پاتی ہیں اور شاخیں نیچے کی طرف۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانی جسم خدا کا شہر ہے اور خدا اس کے قلب میں رہتا ہے۔ وہ ساری دنیا کا خالق اور تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس ساری کائنات کو وہ اکیلا چلاتا ہے۔ اُسی نے کسی سہارے کے بغیر آسمان کو قائم کیا۔ سب کچھ اسی نے پیدا کیا اور بالآخر ہر چیز اسی میں مل جائے گی۔

بابا نانک نے تخلیق کے لیے 'قدرت' لفظ کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا 'یہ دنیا خدا کی لیلا یعنی اسٹیج ڈرامہ ہے جو رات کے اندھیرے میں کھیلا جاتا ہے۔ دنیا کی تخلیق سے پہلے خدا غیر موجود تھا لیکن اس کی تخلیق کے بعد اس سے متعلق ہو گیا۔ یہاں لامحدود خطے اور کائناتیں ہیں۔ مایا دیوی کو بابا نانک ایک بھوکی اور ناراض عورت کی صفت میں دیکھتے ہیں جو خدا سمیت دنیا کو بھسم کر دینے کے چکر میں ہے۔ روح اپنی انفرادیت کی وجہ سے خدا کی طرف کئی رویوں سے ظاہر ہوتی ہے جبکہ رویے روح کا ہی حصہ ہیں۔ مادہ اور روح حقیقت میں دونوں ہی خدا کی فطرت کا تسلسل ہیں۔ خدا ہر نقص سے پاک ہے اور ہر طرح سے مکمل ہے۔ بابا نانک کے مطابق خدا ایک ضرور ہے لیکن اس کے دو رخ ہیں ایک 'نرگن' یعنی صفت کے بغیر، دوسرا 'سرگن' یعنی صفت کے ساتھ۔ بابا نانک نے اِن دونوں پہلوؤں کو اپنی نظم 'آرتی' میں پیش کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

''تیری ہزار آنکھیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کائنات میں آنکھوں کے بغیر ہے تو وہ صرف تو ہے۔ تیرے ہزاروں پاؤں ہیں لیکن اگر کوئی بن پیروں کے کھڑا ہے تو وہ تُو ہے۔ تیرا ہی کمال مجھے متاثر اور حیران کرتا ہے۔''

خدا کی کوئی شکل وصورت نہیں اور نہ کوئی روپ ہے۔ وہ ہی سب سے بڑا ہے لیکن اس کے نام، صورت اور رنگ کے مختلف پہلو اُن تھک عبادت سے جانے جاتے ہیں۔ بقول جی سی نارنگ 'خدا کو گورو نانک نے جینئس ماسٹر مائنڈ کے طور پر پیش کیا ہے۔ بابا گورو نانک

ایک ایسے دور اندیش بزرگ ہیں جنھوں نے ایک عام آدمی کے شب و روز کو دیکھا، پرکھا اور اپنے تجربے کی روشنی میں اتارا۔ اپنے زمانے کے لوگوں کی مصیبتوں کی وجوہات پر غور کرنے کے بعد بابا نانک نے توحید کے تصور سے عوام کو وابستہ ہونے کا نسخہ دیا۔ بابا نانک سے پہلے صوفی بزرگوں نے اسی قسم کی صورت حال کا ادراک کیا تھا۔ بابا فریدؒ ڈھائی سو برس پہلے پنجاب میں روحانی جمہوریت کی تحریک کو پروان چڑھا چکے تھے۔ وہ پہلی تاریخ ساز شخصیت تھے جنھوں نے اپنے جماعت خانے کے ذریعے مختلف تہذیبوں کے درمیان ڈائیلاگ یعنی مکالمے کی بنیاد رکھی تھی اور اپنی شاعری کے ذریعے بتایا تھا کہ ایک ہی راستہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔ بابا فریدؒ کی اس تحریک کو بابا نانک نے یہ کہتے ہوئے عروج پر پہنچایا۔

ست نام۔ کرتا پرکھ، نربھو، نرویر، اکال مورت، اجونی سے بھنگ گر پرشاد

ایک خدا جو سچ ہے، قادر مطلق ہے، لافانی ہے، بے خوف ہے

آگے فرماتے ہیں، ویدامبہ نام اُتم سو، یعنی ویدوں میں ایک آواز ہو کر کہا گیا ہے کہ خدا لامحدود ہے۔ وید اور پران کے تمام دیوتا برہما، اندر، سیولا اور سادھو بدھ سب ایک ہی خدا کی بات کرتے ہیں۔ بابا نانک کے نزدیک خدا سے قربت حاصل کرنے کا براہِ راست طریقہ صاف نیت سے اسے یاد کرنے میں ہے۔ مذہبی طور طریقوں کی پیچیدگی نے لوگوں کو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ خدا کے جلال پر زور دیتے ہیں تو کچھ جمال کے شیدائی ہیں۔ جبکہ خدا صرف ایک سچ ہے جو سب کے لیے روشنی کی مانند ہے۔

بابا نانک کا خیال ہے کہ خدا کو اپنے اختیارات اور قوت کے اظہار کے لیے مندر مسجد کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اللہ الکھ اگم قادر کرنہار کریم
سبھ دُنی آون جاونی مقام اک رحیم
مقام تِس نوں آکھیے جس سِس نہ ہووی لیک
اسمان دھرتی چلسی مقام اوہی ایک

گورو صاحب فرماتے ہیں وہ خدا ہے جس نے زمین پانی اور خلا بنائے اس لیے نانک دعا مانگ، وہ خدا ہے سب جاننے والا سب کا خالق، وہ ہی وجہ ہے، وہ ہی سبب ہے۔ یہ دنیا اسی کے حکم سے کھڑی ہے۔ وہ، وہ ہے جس کے سر پر موت کا سایا نہیں جب یہ زمین و آسمان ختم ہو جائیں گے وہ تب بھی اکیلا باقی رہے گا، سورج، چاند، دن رات ان سب کو ایک دن ختم ہونا ہے۔

بابا گورو نانک کا روحانی کلام 'جپ جی صاحب' حمدِ کبریائی کی نمایاں اور اخلاص پر مبنی نئی منظوم صورت ہے۔ بابا نانک نے خدا کے وجود کو 'سچ' کے ایک لفظ میں سمیٹ کر سب سے بلند مقام پر رکھا ہے مسلمانوں میں خدا کے ننانوے ناموں کا ورد ہوتا ہے جب کہ سب لفظ صفات ہیں۔ مولانا رومی کا خیال ہے کہ خدا خود کو بصیر کہتا ہے تا کہ ہمارے الفاظ فضول گوئی سے بچ جائیں۔ صفات بھی خود خدا کی طرح لامحدود ہیں۔

اکھریں نام اکھریں صالاح
اکھریں گیان گیت گن گاہ
اکھریں لکھن بولن بان
اکھراں سر سنجوگ وکھان
جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
تُو سدا سلامت نرنکار

اے مالک تیرے نام اور مقام بے شمار ہیں جو سوچوں سے ماورا ہیں تیری حمد و تعریف کے لیے ہم اپنی کم علمی میں کچھ لفظ جو بولتے ہیں ان کو چن لیتے ہیں اور تیرے ساتھ ان کا الحاق ہو جاتا ہے۔ تو لفظوں کا موضوع نہیں ہے کیونکہ یہ بھی تو نے ہی پیدا کیے ہیں۔ بابا صاحب آگے فرماتے ہیں کہ

یہاں عبادت کے لیے کوئی نہیں آتا جب تک وہ گناہ گار نہ ہو۔ تُو ہمیں گناہوں سے بچا کر اپنی پناہوں میں جگہ دے دے۔ کائنات کے راز کو تیرے سچ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی تخلیق کب، کس دن، کس مہینے ہوئی۔ یہ پنڈت اور قاضی اپنی تشریحات کتنی ہی کرتے رہیں لیکن جو سچ ہے وہ سچ ہے کہ سب کا تنہا خالق تو ہے۔ تو ہی علیم بھی، کریم بھی، رحیم بھی اور عظیم بھی۔

بابا گورو نانک کے نزدیک تخلیق خود خالق کا آئینہ ہے جو خود اس نے اپنی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے بنایا ہے۔ جپ جی صاحب کے علاوہ گورو گرنتھ صاحب میں شامل مارو سولہے مہلہ 1 میں جو انھوں نے تخلیق خدا کی وضاحت کی ہے نہایت جامع ہے۔

وہاں (یعنی خدا کے نزدیک) رنگ اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں نہ برہمن اور کھتری ہیں
نہ وہاں دیوتا اور مندر کی تمیز ہے
حج ہے نہ عبادت
وہاں نہ کوئی ملّا نہ قاضی
نہ شیخ نہ حاجی
نہ بادشاہ نہ رعایا، نہ انا کی دنیا، نہ کوئی قابل سزا
نہ شعور ہے نہ لاشعور
نہ دوست نہ ساتھی۔ نہ وید نہ سامی متن
نہ طلوع نہ غروب
وہاں صرف خدا ہے، تنہا خدا جو صرف اپنے آپ کو جانتا ہے
جب اس کی مرضی ہوئی اس نے کائنات کا آغاز کیا۔ بغیر کسی منصوبے کے پھیلایا اور انسان کے ساتھ خواہشات کو جوڑ دیا
سوائے گورو کے کوئی اس کے فرمانوں کا مطلب نہیں سمجھتا
وہ خدا ہے جو اپنی ہی مطلق خودی سے خود آشکار ہے
اس کی وسعتوں کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ گورو تو حوالہ ہے جس کے ذریعے ہم اس کے نور کو محسوس کر لیتے ہیں

بابا گورو نانک دیو نے اپنے تصور وحدت کو عوام کی عملی زندگی، سوجھ بوجھ اور اخلاقیات سے جوڑا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو انھیں ممتاز بناتا ہے۔ وہ عام زندگی میں راستی اور حلیمی کی حمایت کرتے ہیں اور وجود مطلق کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کا طریقہ دلپذیر اور انقلابی ہے۔ بابا صاحب نے بنیادی سماجی مسائل پر غور و فکر کے بعد جو حل تلاش کیے وہ بہتر زندگی گزارنے کی ضمانت ہیں۔ ان کی 'جنم ساکھی' ایک مکمل آدمی کو پیش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ بابا نانک سے بلا امتیاز مذہب و ملت اس وقت کے لوگ بھی فیضیاب ہوتے رہے جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ بابا نانک نے کبھی کسی کو اپنا مذہب ترک کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اپنی مشہور زمانہ کتاب 'دبستان مذاہب' میں محسن فانی نے بابا نانک کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ گورو نانک صاحب کی شخصیت سکھوں کے ساتھ ساتھ دوسرے عقیدے کے لوگوں میں بھی محترم ترین ہے۔ آج بھی پنجاب کے مسلمانوں میں یہ شعر عام ہے۔

بابا نانک شاہ فقیر
سکھاں دا گورو مسلماں دا پیر

بابا نانک کے زمانے میں ہندوستان کا ہر مذہب ایک ذاتی معاملہ بن چکا تھا اس لیے انھوں نے ایک ایسا فلسفۂ حیات پیش کیا جو براہِ راست خدا اور بندے کے تعلق پر زور دیتا ہے۔ یہی تصور قرآن پیش کرتا ہے جسے اس زمانے کا مسلمان پیش نہیں کر رہا تھا۔ گورو صاحب نے جدید دنیا کو ایمان کی ایسی تعریف پیش کی جو جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق تھی۔ سچ کو قبول کرنا، سچ کی حفاظت کرنا ان کا پیغام بنا جو مذہب کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ قرار پایا۔ ظاہر ہے کہ خدا سے ذاتی تعلق اور لگاؤ ہی

میں نجات کا راستہ ہے۔ مذہب کا خدا کی طرح خالص ہونا اور سیکولر ہونا سکھ مذہب کی روح ہے۔

بابا نانک کا تصورِ خدا 'جپ جی صاحب' کے حوالے کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ اپنے ذاتی وجدان اور عرفان کی آگہی نے بابا نانک کو توحید کے صحیح اور وسیع تصور سے روشناس کرایا تھا۔ اس تصور وحدت نے پندرہویں صدی عیسوی کے انسان کی آنکھ کھولی اور اسے بتایا کہ اب اسے کسی کے آگے جھکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عبادت اور پرستش کے لائق صرف وحدہٗ لاشریک یعنی ایک اونکار ہی کی ذات پاک ہے۔

بابا نانک کے ہم عصر کچھ صوفی،
جوگی اور سادھو ایسے بھی تھے جو خدا کی عظمت تو بتا رہے تھے لیکن دنیا کو مایا جال نام دے کر گوشہ نشینی میں رہنا پسند کررہے تھے۔ بابا نانک نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کے تصور کی مکمل طور پر مخالفت کی کیونکہ یہ فرائض سے فرار ہے انھوں نے فرمایا

جوگ نَ کنتھا جوگ نہ ڈنڈے جوگ ن بھسم چڑائیے
جوگ نَ مُنڈی موںڈ منڈائے جوگ ن سنگی وائیے

جوگ نہ تو کملی اوڑھنے میں ہے نہ ہاتھ میں عصا لینے سے ہے اور نہ ہی جسم پر راکھ ملنے سے جوگ ملتا ہے۔ وصلِ خدا تو عوام کے ساتھ رابطے میں رہنے سے ہے عبد اور معبود کے رشتے کو سچ سے استوار کرو۔ ایک جوگی نے ایک بار بابا نانک سے کہا تھا 'تم نے چاہی دودھ میں پھینک دی اب یہ دودھ پھٹ چکا ہے اس سے مکھن نہیں بن سکتا۔ یعنی تم نے خود کو دنیا کے حوالے کیوں کیا ہوا ہے۔ تو اس کے جواب میں بابا نانک کا فرمان ہوا۔ بھنگڑا ناتھ۔ تمہاری ماں بے وقوف تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ برتن کو کیسے صاف کرنا چاہیے۔ دودھ پھٹنے سے بچایا جا سکتا تھا مگر تم نے خود کو گھرداری سے الگ کرلیا اور اب در در بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ گوشہ نشینی یا سنیاس کا عمل سماج میں تبدیلی لانے میں کوئی رول ادا نہیں کرتا۔

کسی انسان میں یہ قوت ہے کہ اس کی قدرت بیان کرسکے خدا کی بخششیں لامحدود ہیں۔ اس کی صفات اس کا علم سوچ سے بالاتر ہے۔ اس کا ذکر نہ ختم ہونے والا اس کی تعریفیں بے کنار ہیں۔

اَنت نہ صفتی کہن نہ اَنت	اَنت نہ کرنے دین نہ اَنت
اَنت نہ ویکھن سنن نہ اَنت	اَنت نہ جاپے کیا من منت
اَنت نہ جاپے کیتا آکار	اَنت نہ جاپے پارا وار
وڈّا صاحب اوچا تھاؤ	اوچے اوپر اوچا ناؤ
جے وڈّ آپ جانے آپ آپ	نانک ندریں کرنی دات

عورت کی محبت کو گورو نانک نے خدا کے اخلاص سے مثال دی ہے۔ یعنی خدا کو انسان اور سماج سے جدا کرکے گورو نانک دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ عبد اور معبود کا رشتہ جسم و روح کا ہے۔ اس خالص سچ کو حق بنا کر گورو نانک نے پیش کیا ہے۔ جپ جی صاحب کی 24 ویں پوڑی میں انہوں نے خدا کے سچ کو جس نچوڑ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہی خدا کائنات کا خدا ہے۔ کسی مذہب کا ہے یا نہیں اس سے گورو نانک کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

نہ صفات کی حد نہ تعریف کہیں رکے، قدرت اور عطا بھی لافانی، بار اور وار بھی نہ ختم ہونے والے۔ ہر بڑے کے بڑے سے بڑا نام اے خدا تیرا ہے۔ نانک تجھ سے ہی کرم اور عنایت کا طلبگار ہے۔ یہ ہر بڑے سے بڑا کہہ کر خدا کو بڑا اور عظیم کہنے کا حلیم لہجہ ہے جو بابا نانک نے اپنے رب کو پہچوانے کے لیے اختیار کیا۔ اسلام کا کلمۂ توحید بھی اسی لہجے کو ایمان کا فرمان قرار دیتا ہے لاالہٰ الااللہ۔ نہیں ہے کوئی الہٰ سوائے اللہ کے۔

بابا نانک نے اپنے زمانے میں مذہبی رہنماؤں کے اس طرزِ عبادت کو ترک کرنے کی ترغیب دی جو خدا کے نہیں بلکہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی تحریک چلا رہے تھے مذہبی ڈھانچوں میں کھوکھلا پن ابھر رہا تھا۔ تمام مذہبوں کی یگانگت اور عبادتوں کی رسومات کی کھوکھلی ادائیگی سے بچنے کے لیے بابا نانک نے ایک طرف آسام و بنگال اور دوسری طرف کون کا نا مالابار عرب میں مکہ اور عراق کے سفر طے کیے۔ گورو صاحب کا پیغام کسی مذہب کے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کے لیے ہے۔

تمام مذہبی رسمیں اس وقت تک بے کار ہیں جب تک خدا کی عنایت نہ ہو جائے تمام خوبیاں خدا کی ہیں کوئی ایک بھی نیکی میری ذاتی نہیں ہے سوائے یہ کہ اس میں کتنا خلوص ہے۔ خیر اسے ہی عطا کی گئی ہے جس نے خیر کے لیے جدوجہد کی ہے

گورو نانک صاحب کی پوری زندگی ایک 'سچے سودے' میں ڈھلی ہوئی حمدِ کبریائی ہے۔ ان کے زمانے میں یعنی نچلی ذاتوں میں جو سب سے نچلا آدمی ہے نانک کہتے ہیں میں اس کے ساتھ چلوں گا میں بڑا بن کر کیا کروں خدا کی نظر کرم ان پر پڑتی ہے جو اپنے سے نیچے والوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

بابا نانک کا کنات اور انسانی وجود کے روحانی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے اس قاضی کو قاضی نہیں مانا جس نے رشوت لے کر نا انصافی کی۔ جپ جی صاحب میں فرماتے ہیں:

قاضی انصاف کی عدالت میں بیٹھا ہے اور تسبیح پر خدا کا ذکر کررہا ہے لیکن رشوت بھی قبول کرلیتا ہے اور انصاف کی پرواہ نہیں کرتا۔

گورو نانک صاحب کا تصور خدا صرف روحانیت ہی نہیں ہے بلکہ در و انسانیت بھی ہے وہ اپنے گردو پیش کے دکھ درد اور سماجی بے راہ رویوں کے بیچ سے گزر کر خدا کو پہچانتے اور پہچواتے ہیں۔

بھنڈ جمے بھنڈ نمے بھنڈ منگن ویاہ

آسا دی وار میں فرماتے ہیں۔

عورت ہی جنم دیتی ہے۔ عورت کے ساتھ ہی مرد کی منگنی ہوتی ہے۔ عورت کا رفیق مرد ہے۔ عورت سے نئی نسل جنم لیتی ہے۔ عورت مر جائے تو دوسری کی طلب ہوتی ہے۔ عورت ہی مرد کو قابو میں رکھتی ہے اسے کیوں برا کہو جو ہمارے حاکموں اور دانشوروں کو جنم دیتی ہے۔ عورت سے صرف اللہ ہی بے نیاز ہے۔

عورت کی محبت کو گورو نانک نے خدا کے اخلاص سے مثال دی ہے۔ یعنی خدا کو انسان اور سماج سے جدا کرکے گورو نانک دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ عبد اور معبود کا رشتہ جسم و روح کا ہے۔ اس خالص سچ کو حق بنا کر گورو نانک نے پیش کیا ہے۔ جپ جی صاحب کی 24 ویں پوڑی میں انھوں نے خدا کے سچ کو جس نچوڑ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہی خدا کائنات کا خدا ہے۔ کسی مذہب کا ہے یا نہیں اس سے گورو نانک کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

اس کی خدائی لامحدود ہے اس کی ثنا لامحدود ہے اس کی تخلیقیت کی کوئی حد نہیں اس کی لامحدودیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کو تلاش کرنے والے کو پتہ ہے کہ وہ کوئی حد تلاش نہیں کرسکتا۔ جتنا ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں اتنا ہی کہنے سے رہ جاتا ہے۔ عظیم ہے ہمارا رب ہمارا پروردگار اس کا منصب اس کا پاک نام تمام بلندیوں سے بلند ہے۔

تصورِ توحیدِ خدا اور تصورِ نانک کو مختصر لفظوں میں بیان کرنے کے لیے علامہ اقبال کا ہی شعر سہارا دے سکتا ہے۔

پھر اٹھی توحید کی آخر صدا پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

■

Prof. Nashir Naqvi
Mahal, Darbar Kalan
Amroha (UP)

یوسف صابر

اردو ادب میں سنت کبیر کا مقام

سنت کبیر کو بھکتی تحریک کا سب سے اہم علم بردار مانا جاتا ہے۔ سنت کبیر کے دوہے آج بھی سارے ہندوستان میں گونجتے ہیں۔ سنت کبیر ایک ایسے شاعر تھے جنھیں ہندو بھی بے حد پسند کرتے تھے اور مسلمان بھی۔ سارے ہندوستان میں ان کے عقیدت مند موجود تھے اور آج بھی ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد محبت، اور بھائی چارہ پیدا کرنے کے لیے انھوں نے جگہ جگہ تمام ہندوستانیوں کو انسانیت کا درس دیا۔ رام اور رحیم کی بحث کو ختم کرنے کے لیے سنت کبیر نے دونوں کو ایک خدا کے دو الگ الگ نام بتائے۔ سنت کبیر کسی بھی قسم کی تفریق کے خلاف تھے۔ انھوں نے تمام انسانوں کو ہمیشہ مساوات کی تعلیم دی۔ سنت کبیر ایک خدا کے قائل تھے۔ موصوف نے تمام عمر ہندوستانیوں کو یکجہتی کی تعلیم دی۔ کبیر کی نظر میں سب سے اہم انسان کا دل تھا انھوں نے انسانی دل کو خدا کا گھر کہا ہے۔ سنت کبیر کا ماننا تھا کہ ہر انسان کے دل میں خدا رہتا ہے جسے خدا مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ عشق کے ذریعے خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔ پیار لافانی ہے، اگر انسان کے دل میں پیار نہیں تو انسان انسان نہیں۔ کبیر نے دنیا کو مایا جال کہا ہے، بے ثباتی دہر اُن کا ہمیشہ محبوب موضوع رہا۔ سنت کبیر نے خدا کو منزل مانا ہے اور مذہب کو خدا تک پہنچنے کا راستہ۔ اپنے ایسے ہی خیالات کو سنت کبیر نے اشعار میں ڈھال کر اتنے پرکشش انداز میں پیش کیا ہے کہ آج بھی ان کا کلام دلوں میں ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

صداقت، خلوص اور محبت نے سنت کبیر کی شاعری کو لافانی بنا دیا ہے۔ سنت کبیر کے کئی اشعار آج ادب کی دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ بے شمار انسانوں کے دلوں میں سنت کبیر کے اشعار بسے ہوئے ہوئے ہیں جو بے اختیار موقع کے اعتبار سے ہونٹوں پر مچل جاتے ہیں۔

سنت کبیر کے حالات اُن کی شخصیت اور ان کے فن پر مختلف زبانوں میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مختلف زبانوں کے مورخوں، دانشوروں اور محققوں نے اپنے خیالات کو قلمبند کر کے سنت کبیر کی ادبی حیثیت طے کرنے کی کوشش کی۔ اردو زبان و ادب میں بھی سنت کبیر کے بلند مقام کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، جس پر روشنی ڈالی جائے گی مگر پہلے ان کی زندگی کے حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

ڈاکٹر رام کمار ورما کی تصنیف 'کبیر ایک انوشیلن' سے اخذ کی گئیں معلومات کے مطابق سنت کبیر نے اپنی رچناؤں میں اپنی پیدائش کی تاریخ کا کہیں پر بھی ذکر نہیں کیا۔ مختلف دانشوروں نے اپنی تحقیق اور سمجھ کی بنا پر الگ الگ تاریخ پیدائش بتائی۔ کبیر پنتھیوں نے سنت کبیر کی تاریخ پیدائش 1367 بتائی ہے۔ سنت کبیر کی سوانح نگاری لکھنے والوں کے مطابق سنت کبیر کسی بیوہ برہمن خاتون کے بیٹے تھے لیکن ان کی پرورش نیرو نام کے جولاہا اور اس کی بیوی نیما نے کی۔

سنت کبیر کا پیدائشی مقام بنارس بتایا جاتا ہے۔ کبیر کے بچپن کا زمانہ مگہر میں گزرا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی زندگی بڑھاپے تک کاشی میں گزاری۔ تیس سال کی عمر میں سنت کبیر نے سنتوں کی سنگت اختیار کی۔ سنت کبیر نے خود کو کاشی کا جولاہا بتایا ہے۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں سکھ نہیں تھا، ان کی بیوی جس کا نام لوئی تھا ہمیشہ ان سے روٹھی رہتی تھی۔ کیوں کہ سنت کبیر کا وقت سنتوں کی سنگت میں گزرتا تھا، اس لیے بیوی بچوں کی پرورش کی ذمے داری وہ ٹھیک طرح سے نہیں اٹھا پا رہے تھے اور یہ بات ان کی بیوی کو پسند نہیں تھی۔ اکثر اوقات سنت کبیر کی اپنی بیوی سے اَن بن ہوتی رہتی تھی۔ اپنی پہلی بیوی سے سکھ نہیں ملا اس لیے سنت کبیر نے دوسری شادی کی تھی۔ لڑکے اور لڑکیوں کے روپ میں ان کے کئی بچے تھے مگر صرف ایک لڑکے کا ذکر ملتا ہے جس کا نام کمال تھا۔ سنت کبیر کی پرورش مسلمان جولاہا کے گھر ہوئی۔ وہ بچپن میں رسمی تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ سنتوں کی صحبت میں سنت کبیر نے کئی مقدس مقامات کی یاترائیں کیں۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے انھوں نے حج کا سفر بھی کیا۔ زندگی کے آخری وقتوں میں وہ واپس مگہر آگئے جہاں ان کا انتقال ہوگیا سنت کبیر کی وفات کا سال 1467 مانا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انھوں نے سو سال کی عمر پائی۔

سنت کبیر کے فن پر اردو ادب میں کئی قلمکاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند مستند و مقبول ادیبوں کے بیانات کی روشنی میں اردو ادب میں سنت کبیر کے مقام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سنت کبیر کے بارے میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''ہندو شاعروں کے دوہے برج بھاشا میں ہیں مگر عہد بعہد کی زبان کا پتا بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں اُن پڑھ تھے۔ گرو رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ تصانیف اگر جمع ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ ان کے دوہوں میں فارسی و عربی الفاظ ملاحظہ ہوں:

''دین گو ایودنی نہ آیو ساتھ
پیر کہاڑی ماریوگا پھل اپنے ہاتھ
کبیر سر پر سرائے ہے کیوں سوئے چکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین''

(آب حیات ص نمبر 12)

دونوں شعروں میں فارسی و عربی کے الفاظ کے علاوہ آخرت سنوارنے کا پیغام ہے۔ انسانی جسم کو کبیر نے روح کے لیے سرائے کہا ہے اور سانسوں کو کوچ کا نقارہ زندگی کی حقیقت کو دو مصرعوں میں اتنے پر اثر انداز سے بیان کر کے سنت کبیر نے اپنے خیال کو انسانوں کے دلوں میں اتار دیا ہے۔ زندگی کے ایک ایک دن سے ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسان کو انھوں نے اچھے کام کرنے کی تلقین کی ہے۔

مسعود حسین خان صاحب سنت کبیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پورب میں یہی زمانہ کبیر داس کا (1440-1515) ہر چند کبیر نے کہا ہے:

میری بولی پوربی تا ہے نہ چینے کوئے
میری بولی سو لکھے جو پورب کا ہوئے

لیکن کبیر کے کلام بالخصوص ساکھی کے دوہوں میں ایک ملی جلی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی کے روپ جھلکتے ہیں۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص 83)

مسعود حسین خان صاحب نے جن دوہوں کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

کبیر لوٹنا ہے لوٹ لے رام نام ہے لوٹ
پھر پاچھے پچھتا ہوگے پران جائیں گے چھوٹ

کبیر نے اس دوہے میں زندگی کا مقصد بیان کیا ہے۔ انھوں نے بندوں کو خدا کی عبادت کرنے کی تلقین کی اور انسانوں کو احساس دلایا ہے کہ بعد میں پچھتانے سے کچھ نہیں ہونے والا جو کچھ کرنا ہے اسی زندگی میں کرنا ہے۔ زندگی انسان کو اس دنیا میں صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔ اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت کریں۔

سنت کبیر بھکتی تحریک کے ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے 'کبیر پنتھی' کے نام سے اپنا ایک الگ مت نکالا تھا اور بہت دور دور تک انھوں نے اپنے شاگرد بنائے۔ تمام کبیر پنتھی انسانیت، اتحاد اور اہنسا کے پجاری تھے۔ یہ لوگ سنت کبیر کے عقیدت مند تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سنت کبیر کو بھکتی تحریک کا سب سے بڑا شاعر لکھتے ہیں اور کبیر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کبیر (1518) بنارس کے رہنے والے اور ذات کے جولاہے تھے۔ وہ مذہب و ملت اور ذات پات کی تفریق کو برا سمجھتے تھے۔ توحید کی تلقین ان کی شیوہ اور بت پرستی و شرک کی مخالفت ان کا ایمان تھا۔ سنت کبیر نے اپنے کلام کے ذریعے ان ہی خیالات کو طرح طرح سے پیش کیا اور اسی بات پر زور دیا کہ عشق ہی عرفان ذات کا ذریعہ ہے۔ اسی سے آتما کو شانتی ملتی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اوّل (قدیم دور)، ص 43)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں سنت کبیر کے چوبیس دوہے نقل کیے ہیں جن میں یہ بھی شامل ہیں:

نہائے دھوئے کیا بھیا جو من میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

(یعنی اگر من میں میل ہو تو نہانے دھونے سے کیا حاصل، کیونکہ مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے اس کے باوجود دھونے پر بھی اس کی بدبو نہیں جاتی۔ انسان کا باطن بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے صرف ظاہر نہیں۔)

دوئی جگدیش کہاں تے آئے کہو کون بھرمایا
اللہ رام کریم کیشو ہری حضرت نام دھرایا

(خدا دو نہیں ہیں، خدا ایک ہی ہے، کوئی اللہ پکارتا ہے، کوئی رام، کوئی کریم تو کوئی کیشو اور کوئی ہری، لوگ الگ الگ ناموں سے ایک ہی خدا کو پکارتے ہیں)۔

وہی مہادیو وہی محمدؐ برہما آدم کہیے
کوئی ہندو کوئی ترک کہاوے ایک جمی پر رہیے

(خدا کی بنائی ہوئی ایک ہی زمین پر تمام انسان مل کر رہتے ہیں، کوئی ہندو کہلاتا ہے کوئی مسلمان، مگر سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔

جیوں تل ماہیں تیل ہے جیوں چقمک میں آگ
تیرا سائیں تجھ میں ہے جاگ سکے تو جاگ

(جس طرح تل کے اندر تیل ہوتا ہے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے اسی طرح اے انسان تیرا خدا بھی تجھ میں بسا ہوا ہے خود کو بیدار کر اور خدا سے مل)۔

ست نام کڑوا لاگے میٹھا لاگے دام
دُبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام

(سچی باتیں کڑوی لگتی ہیں اور دنیوی عیش و آرام اچھے لگتے ہیں۔ دونوں کی کشمکش میں انسانوں کے ہاتھ نہ دنیا لگتی ہے نہ اس کی آخرت سنورتی ہے)۔

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

(چلتی چکی دیکھ کر سنت کبیر کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آکر کوئی ثابت نہیں رہتا، سب پس جاتے ہیں۔ اس لیے شرک سے بچنا چاہیے اور ایک ہی خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس شعر میں وحدانیت کو تسلیم کرنے کا درس ہے۔)

ماٹی کہے کمہار سے تو کیا روندے موئھ
اک دن ایسا ہوئے گا میں روندوں گی توہ

کمہار کو مٹی کے برتن بناتے دیکھ کر سنت کبیر کے دل میں خیال آیا جسے انھوں نے دوہے میں ڈھال کر پیش کیا کہ مٹی کمہار سے کہہ رہی ہے تو، کیا مجھے روند رہا ہے اور برتنوں میں ڈھال رہا ہے، ایک دن وہ بھی آئے گا جب میں تجھے روندوں گی۔ یعنی انسان کا جسم خاک سے بنا ہے اور آخر میں خاک میں ملیں مل کر خاک ہو جاتا ہے۔ زندگی اور موت کے فلسفے کو سنت کبیر نے جتنے موثر انداز سے سمجھایا ہے اس کی مثال کہیں اور بڑے مشکل سے ملے گی۔

کال کرے سو آج کر آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی بہور کرے گا کب

(یہ دوہا ادب کی دنیا میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ کسی بھی کام کو وقت پر انجام دینے کے لیے اتنی بہترین نصیحت اتنے بہترین طریقے سے بیان کرنا سنت کبیر ہی کا حصہ تھا)۔

سنت کبیر کے کلام میں صداقت، سادگی اور معنی خیزی ملتی ہے۔ ان کا ہر دوہا انسانوں کے لیے ایک سبق ہے۔ مذہبوں نے انسانوں میں تفریق پیدا کردی، ورنہ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ کبیر نے تمام عمر انسانیت، سکھ، شانتی اور محبت کی تعلیم دی مگر افسوس لوگوں نے ان کی تعلیمات کو اس وقت بے کار کردیا جب ان کا انتقال ہوگیا۔ ہندوؤں نے انھیں ہندو کہہ کر جلانا چاہا تو مسلمانوں نے مسلمان کہہ کر دفنانے کی کوشش کی۔ انسانیت کے اس علم بردار کو دو حصوں میں بانٹ کر وہی نفاق پیدا کردیا گیا جسے ختم کرنے کے لیے کبیر نے تمام عمر کوشش کی۔ کبیر کے دوہے آج بھی عوام کی زبان پر ہیں لیکن ضرورت ان دوہوں پر عمل کرنے کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سنت کبیر کے کلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''کبیر کے کلام میں عوامی زبان، لہجے، آہنگ اور ترنم کی وہ سادگی ہے جو فوراً دلوں میں اتر جاتی ہے، بڑے سے بڑا خیال وہ ایسے سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے پر قادر ہیں کہ صداقت بن کر وہ ہمارے اندر گھر کرلیتا ہے۔ یہ وہ آفاقی صداقتیں ہیں جو وقت کے ساتھ نہیں بدلتیں اور ان کا رنگ روپ ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ کبیر ساری عمر شاعری کے ذریعے اپنے خیالات کی تبلیغ کرتے رہے اور عشق و محبت کی گرمی سے عوام میں نئے شعور کی آگ روشن کرتے رہے اور جب وہ مرے تو برِاعظم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کی آواز پوری توجہ سے سنی جارہی تھی۔ اس میں ہندو بھی شریک تھے اور مسلمان بھی۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اوّل (قدیم دور) ص 46)

سنت کبیر کا شمار ہندی اور اردو ادب کے اہم اور گنے چنے شعرا میں ہوتا ہے۔ سنت کبیر نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے جسے سن کر ایسا لگتا ہے جیسے اردو اور ہندی کی ندیاں آپس میں مل گئیں اور دریا کی صورت اختیار کر مزید صاف و شفاف اور رواں ہوگئیں۔ دنیا کی ہر ادبی زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں لیکن اردو اور ہندی دو ایسی زبانیں ہیں جو سب سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب نظر آتی ہیں اور عام بول چال کا ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں یہ ایک ہو جاتی ہے۔ اسی زبان کو کبیر نے اپنی شاعری میں استعمال کیا اور اپنے انمول خیالات کو اتنے موثر انداز میں بیان کیا کہ گزرتے زمانے کے ساتھ ہیرے موتی اور سونے چاندی کی طرح ان کی قیمت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

■

Dr. Khan Yousuf Khan Jabbar (Sabir)
Lunar Housing Socitety
N-12, Plot No. 2616, CIDCO
Raoze Bagh, Aurangabad - 431001 (MS)

شجاع الدین شاہد

بیسویں صدی کا ناقابلِ فراموش شاعر
پنڈت رتن پنڈوری

ترویج زبان اور خدمت ادب کے لیے اردو زبان شمالی ہندوستان خصوصاً شعرائے پنجاب، بشمول ہریانہ، ہماچل پردیش کی ہمیشہ گراں بار منت رہے گی۔ آج بھی وہاں متعدد اہل فکر وسخن اس کام میں مصروف ہیں۔ اگر ہم پنجاب کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انکشاف ہوتا ہے کہ دل دادگانِ شعروسخن میں پنجاب کے شعرا وادبا کا اہم رول رہا ہے۔

تاریخ اردو ان ادیبوں کی محبت اور کو فراموش نہ کرپائے گی۔ یوں تو اردو کے سمندر نے کئی نایاب موتی ادبی دنیا کو دیے ہیں جن پر ہم ناز کرسکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نایاب رتن ابوالبلاغت جناب پنڈت رتن پنڈوری ہیں، جن کی ادبی چمک اردو دنیا کے منظرنامے پر جگمگاتی رہے گی۔

آزادی کے بعد اردو ادب کے ساتھ جو المیہ رہا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ بقول رفعت سروش:

"اردو کے کئی مشہور ادیبوں نے اردو سے منہ موڑ لیا ہے ایسے کئی ادیب ہیں جنھوں نے اردو کی گود میں آنکھ کھولی اور پھر غریب ماں کی گود چھوڑ کر امیر ماں کی شرن میں چلے گئے۔ اردو جو اپنی بقا اور استحکام کے لیے

تاریخ اردو ان ادیبوں کی محبت اور کو فراموش نہ کرپائے گی۔ یوں تو اردو کے سمندر نے کئی نایاب موتی ادبی دنیاکو دیے ہیں جن پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نایاب رتن ابوالبلاغت جناب پنڈت رتن پنڈوری ہیں، جن کی ادبی چمک اردو دنیا کے منظرنامے پر جگمگاتی رہے گی۔

دوسروں کا منہ تکتی ہے وہ بھلا دوسروں کو کیا دے سکتی ہے۔ مگر ہاں وہ اپنے ان مخلص ادیبوں اور شاعروں پر ناز کرسکتی ہے جو نامساعد حالات کے باوجود اپنی زبان سے وفاداری کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اردو میں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جیسا کہ محترم آنند نرائن ملا نے کہا تھا "اردو میری زبان ہی نہیں میرا مذہب ہے۔"

اردو زبان کے لیے یہی تڑپ اور مخلصانہ قربت پنڈت رتن پنڈوری میں تھی۔ دل و جان سے آپ نے اردو کی خدمت کی۔ اردو کے خلاف جب سازشیں شروع ہوئیں تو پنڈت رتن نے کتنا پردرد شعر کہا:

ہر شعر کیوں نہ یاس کا پیغام دے رتن
بیٹھی ہے میرے سامنے اردو زباں اداس

پنڈت رتن کا جنم 7 جولائی 1907 میں پنڈوری (پنجاب) میں ہوا۔ آپ کا اردو ادب سے لگاؤ جنون کی حد تک تھا۔ اردو کی اس صادقانہ محبت میں پنڈت رتن نے دنیا ومافیہا سے بے خبر ازدواجی زندگی کے بندھنوں سے آزاد سری ہرگوبند پور کے ایک غیرآباد مندر میں دریائے بیاس کے کنارے درویشانہ زندگی گزار دی اور ہر لمحہ اردو کی بقا اور ترویج واشاعت کے لیے سرگرم عمل رہے۔

اگر ہم کلام رتن کا بغور مطالعہ کریں تو ان کے یہاں صوفیانہ رنگ جابہ جا جھلکتا ہے رتن کے کلام میں تصوف کا رنگ در آجانا تعجب خیز نہیں..... چونکہ پنڈت رتن کی زندگی ایک تارک الدنیا خداپرست اور نیک نفس صاحب فن کی زندگی تھی۔ ان کا تمام کلام تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

سنتا ہوں چاند تاروں سے اک جلوہ گر کی بات
پہنچی ہے کس مقام پہ ذوق نظر کی بات

ایک جگہ کہتے ہیں:

نمونۂ کلام

موجوں نے ہاتھ دے کے ابھارا کبھی کبھی
پایا ہے ڈوب کر بھی کنارا کبھی کبھی
کرتی ہے تیغ یار اشارہ کبھی کبھی
ہوتا ہے امتحان ہمارا کبھی کبھی
چمکا ہے عشق کا بھی ستارا کبھی کبھی
مانگا ہے حسن نے بھی سہارا کبھی کبھی
طالب کی شکل میں ملی مطلوب کی جھلک
دیکھا ہے ہم نے یہ بھی نظارہ کبھی کبھی
فریادِ غم روا نہیں دستورِ عشق میں
پھر بھی لیا ہے اس کا سہارا کبھی کبھی
مشکل میں دے سکا نہ سہارا کوئی رتن
ہاں درد نے دیا ہے سہارا کبھی کبھی

رباعیات

چڑھتے ہوئے دریا کو اترتے دیکھا
جو ڈوب گیا اُس کو اترتے دیکھا
مجموعۂ اضداد ہے سارا عالم
جیتے جسے دیکھا اُسے مرتے دیکھا

دانے میں نہاں دام نظر آتا ہے
آزاد بھی ناکام نظر آتا ہے
یہ کون سا علم ہے کہ جس عالم میں
آغاز بھی انجام نظر آتا ہے

آنکھ جب روشن ہوئی تو دل بھی روشن ہوگیا
آج میرا تن مرے محبوب کا تن ہوگیا

پنڈت رتن کی شاعری میں تصوف، موضوعاتی اعتبار سے نہیں بلکہ داخلی کیفیات کے ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے:

گھر سے بے گھر ہوگیا میں جب تلاش یار میں
اس کا مسکن مجھ میں اس میں مرا مسکن ہوگیا
مرے حسن نظر کی دسترس دیکھو کہاں تک ہے
سراسر نور کا عالم مکاں سے لامکاں تک ہے

پنڈت رتن کا تصور ایک زاہد خشک کا نہیں بلکہ قوس قزح سی رنگینی لیے ہوئے ہے:

لطفِ خوشی یہی ہے کہ شان بقا رہوں
انسان کے لباس میں بن کر خدا رہوں
آئے ہیں ذوق نظر کی آخری منزل میں ہم
نور بن کر آپ ہی بیٹھے ہیں اپنے دل میں ہم

رتن کی شاعری میں ارضیت، مجازیت، مشاہدات، عوامی مسائل اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ بھرپور تغزل بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں شعروں میں معنویت، سنجیدگی، وفور جذبات، اور حسن وعشق کی کیفیتوں کا تجزیہ اور حیات و کائنات کے متعلق نئے اشارات جابجا نظر آتے ہیں:

تری محبت کی رہگزر میں وہ آگیا ہے مقام دلکش
مجھے ترا انتظار سا ہے تجھے مرا انتظار سا ہے
جو آئے آنکھ میں آنسو پلٹ گئے دل میں
خدا کا شکر ہے گھر کی یہ چیز گھر آئی
عمر بھر کی دشت پیمائی سے آخر یہ کھلا
اپنی ہی ہستی ہے محمل اور ہیں محمل میں ہم

ہر فن کار کا زندگی کے تعلق سے اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ رتن کے یہاں زندگی کا فلسفہ دیکھیے:

موت کیا ہے زندگی کی زندگی
زندگی کیا ہے نشانی موت کی
ملی حیات میں مرگ ناگہاں کی طرح
بہار آئی چمن میں مگر خزاں کی طرح
زندگی کی راہ میں راحت بھی ہے کلفت بھی ہے
کارگاہِ دہر میں عسرت بھی ہے عشرت بھی ہے

پنڈت رتن ایک مذہبی قسم کے آدمی تھے اور سناتن دھرمی ہندو تھے مگر تنگ نظری اور تعصب انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا، ایک طرف گائتری منتر کا ترجمہ کیا تو دوسری طرف پیغمبر اسلام پر نعتیہ کلام بھی لکھا۔ گائتری منتر میں اوم کی تشریح کتنے پراثر انداز میں کی ہے:

اے سراپا نور اے حسن ازل
خالقِ خلق اے خدائے عز و جل
لاشریک و لازوال ولا مکاں
بے عدیل و بے مثال و بے بدل

نعت شریف کے دو شعر دیکھیے۔ ہر حرف سے عقیدت و احترام نمایاں ہے:

آیا ہے لب پہ نام رسول کریم کا
جلوہ تڑپ اٹھا ہے ریاض نسیم کا
بحرِ عدن میں لاکھ ہوں لولوئے شاہوار
کچھ رنگ و روپ اور ہے درِّ یتیم کا

سلام کے دو شعر دیکھیے:

ننھے اصغر نے روتے ہوئے جو مانگا پانی
تیر بدخواہ نے کوثر کا پلایا پانی
تیغ قاسم نے بھی کیا خوب دکھائے جوہر
برق وش جس پہ گری اس نے نہ مانگا پانی

قوم پرستی کا رنگ دیکھیے نظم آزادی میں سناتے ہیں:

خلوص و اتحاد ایسا ہمارے دل میں پیدا ہو
کہ رخنہ موج مضطر سے دلِ ساحل میں پیدا ہو
ذرا سوچو تو آزادی کا ہے بار گراں کتنا
قفس سے چھوٹ کر مشکل ہے نظم آشیاں کتنا
دعا ہے اے رتن اہل وطن سب نیک ہوجائیں
جدا ہو شکل گو سب کی مگر دل ایک ہوجائیں

جناب رتن کو علم نجوم پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اکثر ان کی پیشن گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں اس تعلق سے ایک واقعہ مشہور ادیب راجندر ناتھ رہبر نے قلم بند کیا ہے۔

1972 میں جناب جوش ملسیانی شدید مرض میں مبتلا ہوگئے عزیز و اقارب کو گماں گزرا کہ جوش کا وقت آخر ہے مگر جناب رتن جوش کی عیادت کو آئے اور جوش کو دیکھا تو کہاں جوش صاحب کی زندگی کو اس وقت کوئی خطرہ نہیں ہے مگر 1976 ان کی زندگی کے لیے ناقص ہے چنانچہ اس وقت تو جوش صاحب صحت یاب ہوگئے لیکن 27 جنوری 1976 کو جوش کی وفات واقع ہوگئی اس طرح رتن صاحب کی پیشن گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی۔

پنڈت رتن کا جنم 7 جولائی 1907 میں پنڈوری (پنجاب) میں ہوا۔ آپ کا اردو ادب سے لگاؤ جنون کی حد تک تھا۔ اردو کی اس صادقانہ محبت میں پنڈت رتن نے دنیا ومافیہا سے بے خبر ازدواجی زندگی کے بندھنوں سے آزاد سری ہرگوندپور کے ایک غیرآباد مندر میں دریائے بیاس کے کنارے درویشانہ زندگی گزار دی اور ہر لمحہ اردو کی بقا اور ترویج و اشاعت کے لیے سرگرم عمل رہے۔

جناب رتن ہر فن مولا شخصیت کے حامل تھے۔ آپ نے 20 کتابیں تخلیق کیں ہیں جن میں 9 کتابیں شاعری اور 11 کتابیں نثر کی تھیں۔ رتن صاحب آنے والی نسلوں کے لیے اتنا کچھ سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں یقیناً زندہ وجاوید رہیں گے۔

■

Shujauddin Shahid
304, A. wing Mansarover Apt
Mahada, Malwani Malad (West)
Mumbai - 400095 (MS)

مسعود حسن رضوی ادیب کے تنقیدی نظریات

عبداللہ مدنی

مسعود حسن رضوی ادیب (1893-1975) نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے ربع اول میں کیا اس وقت شعروادب کی دنیا میں انتہائی اہم اور بلند پایہ شخصیتیں موجود تھیں۔ ان بڑے ادیبوں کے درمیان مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنا قلم سنبھالا اور نئے میدانوں کے ساتھ ان میدانوں میں بھی قدم رکھا جن میں ان کے اخلاف قدم رکھ چکے تھے۔ یہ بات رضوی ادیب جانتے تھے کہ ابھی ان میدانوں میں ایسا بہت کچھ ہے جس کی تلاش وتحقیق ضروری ہے اور جو کچھ سامنے آچکا ہے اس پر دوبارہ نظر ڈال کر اسے اور وسعت دی جا سکتی ہے۔ ایک طرف انھوں نے ایسے پسندیدہ موضوعات کا انتخاب کیا جن پر کسی اور نے خامہ فرسائی نہیں کی تھی۔ دوسری طرف انھوں نے پُرانے موضوعات پر قلم اٹھا کر اُن میں نئے رُخ اور نئے زاویے پیدا کیے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، جو رثائیات، لکھنویات، انیسیات، ڈرامہ، میریات اور غالبیات جیسے موضوعات کو محیط ہے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت انھوں نے نہ صرف تحقیق وتدوین کا صحیح معیار قائم کیا بلکہ اپنے عالمانہ مقدموں، دیباچوں اور حاشیوں کے ذریعے زیرِ تحقیق ادب پاروں کی متن شناسی اور قدر سنجی کا حق بھی ادا کیا۔

تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تفہیم شعر اور تنقید شعر کی روایت پر بھی نگاہ ڈالی۔ قدیم شاعری کے وسیع مطالعے نے رضوی ادیب میں شعرفہمی کا شعور پیدا کر دیا تھا اور وہ شاعری کے رُموز ونکات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ شاعری کی روایت اور شعر کے مسائل پر لکھی جانے والی اس وقت کی واحد کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' جب ان کے مطالعے میں آئی تو انھوں نے اس کتاب کے مسائل ومباحث کو تشنہ جانا اور محسوس کیا کہ اردو شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اپنی سب سے مشہور کتاب 'ہماری شاعری' (1928) تصنیف کی۔

مذکورہ دونوں تصانیف کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ 'مقدمہ شعروشاعری' کا بیشتر حصہ نظری بحثوں پر مشتمل ہے۔ لیکن 'ہماری شاعری' میں ہر مبحث کو مناسب ترین مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا اطلاق کن کن صورتوں میں کس کس طرح ہوتا ہے اور اس طرح 'ہماری شاعری' عملی تنقید کا عمدہ نمونہ بن گئی۔ کتاب کے پہلے حصے یعنی شعروشاعری کے معیار اور اس کی اہمیت وافادیت کے ذیل میں آنے والے مباحث کی ابتدائی گفتگو میں مصنف نے جذبات کی اہمیت اور افادیت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قوت متخیلہ کی ترقی اور جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں''۔[1] آگے چل کر وہ حالی کی طرح شاعری کو بڑے اخلاق کی نمائندہ بتانے کے بجائے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ'' انسانی اخلاق کی تکمیل کے لیے شعروشاعری کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اس حقیقت کا اقرار بھی ضروری ہے کہ جو شاعری بعض مخصوص جذبات کو ابھارے اور باقی کو دبائے اس کا اثر اخلاق پر کچھ اچھا نہ ہوگا، تمام انسانی جذبوں کو متحرک رکھنا چاہیے تاکہ پیکرِ جذبات کی نشوونما تناسب اعضا کے ساتھ ہو''[2]

مسعود حسن رضوی ادیب بھی حالی کی طرح شاعری کے مقصدی اور افادی پہلو کے قائل تو ہیں لیکن وہ شاعری میں ان جذبات کی ترجمانی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جو حالی کی مخصوص اخلاقیات کے منافی ہیں۔ 'وہ شاعری میں 'موزونیت اوراثر' کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔شاعری جس کا مقصد ہی جذبات واحساسات کا اظہار ہے،اس کے لیے کلام کا موزوں اور مؤثر ہونا ضروری ہے۔شعر کی حقیقت وماہیت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کچھ ایسے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے نفس شعر کی تعریف بخوبی سمجھ میں آتی ہے اورشعر میں موزونیت کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔موزونیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کلام میں ایک طرح کا خوبصورت تسلسل یا ترنم پیدا ہوجائے اوراس میں ایک مسرت آمیز تناسب اورتوازن بھی ہو۔جس کلام میں یہ خصوصیت ہوگی وہ یقیناً پُراثر اورموزوں ہوگا۔کامل شعر کی تعریف یا شعر کی کامل تعریف کے ضمن میں شعر کی عروضی اورمنطقی تعریفوں سے انھوں نے شعر کی ایک جامع تعریف کی طرف اشارہ کیا ہے،جس پر عروضی اور منطقی دونوں تعریفیں صادق آتی ہوں؛ کیوں کہ علم عروض کی اصطلاح میں صرف 'موزوں کلام' کو شعر کہتے ہیں اور علم منطق کی اصطلاح میں 'بااثر کلام' کو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"شعر کی منطقی اورعروضی تعریفوں کا اندازہ خود بتاتا ہے کہ منطق نے نفسِ شعر سے بحث کی ہے اور عروض نے صورت شعر سے لہٰذا جو کلام شعر کی منطقی تعریف پر ٹھیک اترے معروضی تعریف کے مطابق نہ ہواس پر شعر کا اطلاق اس کلام سے زیادہ صحیح ہے جو شعر کی عروضی تعریف پر ٹھیک اُترے مگر منطقی تعریف کے مطابق نہ ہو، یعنی موزوں اور بے اثر کلام کے مقابلے میں ناموزوں اور بااثر کلام کو شعر کہنا زیادہ صحیح ہے۔مگر کامل شعر وہی ہے،جس میں موزونیت بھی ہواوراثر بھی۔"[3]

اوپر کی عبارت سے معلوم ہوا کہ رضوی ادیب کے نزدیک سامعین یا قارئین کو متاثر اوران کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے کلام کا مؤثر اورموزوں ہونا ضروری ہے یعنی جو کلام مذکورہ صفت کا حامل ہوگا وہی نظم کہلائے گا یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک منظوم کلام کی بڑی اہمیت ہے۔ عام طور سے شاعرانہ خیالات کا اظہار یا خیالات کا شاعرانہ اسلوب نظم کا پیکر اختیار کرتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں بھی شعر نے نظم کا ہی لبادہ اوڑھا ہے؛ کیوں کہ منظوم کلام یا کوئی ایک شعر طویل سے طویل خیالات اور واقعات کو نہ صرف مختصر سے الفاظ میں سمیٹنے اور اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، بلکہ وہ انسان کے جذبات واحساسات کا سچا ترجمان بھی ہے۔وہ شعر کو موزوں اور بااثر بنانے اوراس کو خوبصورت پیکر میں ڈھالنے کے لیے جتنے بھی ضروری شعری لوازمات ہیں ان کو شاعری میں برتنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔مثلاً جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ردیف اور قافیے کی پابندی شاعر کے خیال کو پوری طرح منتقل نہیں ہونے دیتی اور مطالب کو ادا کرنے میں وہ ایک طرح سے رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے بالکل دوٹوک اورواضح انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

مسعود حسن رضوی ادیب بھی حالی کی طرح شاعری کے مقصدی اور افادی پہلو کے قائل تو ہیں لیکن وہ شاعری میں ان جذبات کی ترجمانی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جو حالی کی مخصوص اخلاقیات کے منافی ہیں۔ 'وہ شاعری میں 'موزونیت اوراثر' کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔شاعری جس کا مقصد ہی جذبات واحساسات کااظہار ہے ،اس کے لیے کلام کاموزوں اور مؤثر ہونا ضروری ہے۔شعر کی حقیقت وماہیئت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کچھ ایسے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے نفس شعرکی تعریف بخوبی سمجھ میں آتی ہے اورشعرمیں موزونیت کی اہمیت کااندازہ بھی ہوتاہے۔

"بعض لوگ انگریزی میں غیر مقفّٰی نظمیں دیکھ کر اور بعض غیر ملکی نقادوں کی رائیں پڑھ کر یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ قافیہ اور ردیف شاعرانہ تخیل کے پاؤں کی زنجیریں ہیں،اوراس لیے قابل ترک۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ان قیدوں سے اگرایک طرف تخیل کی آزادی میں کسی قدر فرق پڑتا ہے تو دوسری طرف کلام کے اثر میں بہت کچھ اضافہ بھی ہوجاتا ہے اوراثر یہ شعر کی جان ہے..... جو 'شاعر' ان قیدوں کے ساتھ اظہار مطالب میں عاجز ہوں وہ خود کو آزادی رکھیں۔مشاق سخنور کوان قیدوں سے الجھن نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انھیں سے اپنے کلام کو سجاتا اور اثر کے نشتر کو تیز کرتا چلا جاتا ہے۔"[4]

رضوی ادیب کا یہ خیال درست ہے کہ ردیف اور قافیے کی پابندی سے کلام بااثر ہوتا ہے۔ردیف اور قافیہ کی پابندی دراصل ان شاعروں کو اپنے خیالات نظم کرنے سے روکتی ہے جو صرف قافیہ پیمائی کرتے ہیں۔ایسے شاعر محض قافیے کو نظم کرنے کا فرض ادا کرتے ہیں قافیے کے وسیلے سے کسی خیال کو اپنی گرفت میں لاکر اسے اپنے خیال کی صورت میں نظم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔کلام کے اثر میں اضافے کے لیے موزونیت کے علاوہ اور بھی کئی خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ کہتے ہیں کہ"کلام دو عنصروں سے مرکب ہوتا ہے ایک خیال دوسرے الفاظ۔ لہٰذا کلام کے بااثر ہونے کے لیے کچھ خصوصیتیں خیال میں ہونا چاہئیں اور کچھ الفاظ اوران کی بندش یعنی طرز ادا میں۔"[5] ان خصوصیتوں کو انھوں نے معنوی اور لفظی خوبیوں سے تعبیر کیا ہے اورشعر کی معنوی خوبیوں کے ذیل میں کلام میں اصلیت، خیال کی سادگی، بلندی اور تڑپ کے مفہوم کو مختلف اشعار سے مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے جس کا ماحصل یہی ہے کہ خیال میں پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو،خیال میں ایسی بلندی ہو کہ کلام ابتذال اور رکاکت سے پاک ہو،لیکن اگرکسی رذیل اورنالائق نفس کی عکاسی کرنی ہوتو وہاں کلام میں عامیانہ پن اختیار کیا جاسکتا ہے۔خیال ایسا سطحی بھی نہ ہو جس سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہو بلکہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور وسیع مشاہدات کا ترجمان ہو۔کلام کو خلاف قیاس مبالغہ کے استعمال سے پاک رکھنا اور دورازکار تشبیہات واستعارات سے دور رکھنا یہ کلام کے حسن اورخیال کی باریکی میں شامل ہے۔شاعر کا کلام چاہے کتنا ہی سچا، سادہ، بلند اور باریک کیوں نہ ہو لیکن اگراس میں تڑپ اور جذبات شامل نہیں تو وہ محض واعظانہ اورحکیمانہ کلام ہوگا شاعرانہ نہ ہوگا۔حالی کے برخلاف ادیب اصلیت کے مفہوم پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔انھوں نے حالی کی بیان کردہ اصلیت کی تعریف سے اختلاف تو نہیں کیا ہے،لیکن رضوی ادیب کی وضاحتوں سے اصلیت کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی پیچ باقی نہیں رہتا،مزید یہ کہ وہ اس کی وضاحت میں کچھ ایسے نکتے بھی نمایاں کرتے ہیں جن پر حالی کی نگاہ نہیں تھی۔اصلیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

"شعر میں خیال کی اصلیت سے یہ مراد ہے کہ جس چیز سے وہ خیال متعلق ہے اس کا وجود حقیقت میں ہو یا عقل یا اعتقاد کی رو سے ممکن ہو یا مان لیا گیا ہو..... جذبات کے اظہار میں انسانی فطرت کا اتباع ضروری ہے اگر جذبات فطرت کے خلاف ہوں گے تو کلام میں اصلیت نہ رہے گی۔ اصلیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے

کہ کلام مقتضائے مقام کے موافق ہو اور اس کے اجزا میں تضاد نہ ہو..... اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ شاعرانہ اصلیت اور حکیمانہ حقیقت ایک چیز نہیں ہیں۔ حکیم ہر شے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ فی نفسہ کیا ہے اور شاعر اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ ہمیں کیا معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً چہرے کی شکنیں جب تک محض جھرّیاں ہیں اس وقت تک وہ حکیمانہ تحقیق کا موضوع ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ایک خاص حالت میں وہ عمر کے کاروانِ رفتہ کا نشان معلوم ہونے لگتی ہیں، تو شاعری کی حد میں آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کیے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
(صفی)[6]

درج بالا اقتباسات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود حسن رضوی ادیب نے 'اصلیت' کے مفہوم کے ہر پہلو کو نگاہ میں رکھ کر اس کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے مناسب مثالوں کے ذریعے اپنے بیانات کو اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔

معنوی خوبیوں کے بیان کے بعد شعر کی لفظی خوبیوں کے ذیل میں انھوں نے ہر نکتے کو نگاہ میں رکھا ہے۔ بیان کی سادگی اور اس کے لوازم یعنی سلاست و روانی، لفظی و معنوی تعقید، تشبیہ، استعارہ اور تلمیح کی وضاحت کے ساتھ ساتھ 'اختصار' اور اس کی مختلف تدبیروں کا بھی ذکر کیا ہے، نیز الفاظ کی مناسبتوں کی مختلف صورتیں بیان کرنے کے بعد صنعتوں اور ان کے حسنِ استعمال پر بھی مباحث قائم کیے ہیں۔ بیان میں سادگی کا مطلب یہ ہے کہ کلام مشکل الفاظ سے پاک ہو اور اس کو سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ویسے سادگی کا انحصار کئی چیزوں پر ہے یعنی کلام کے اندر سلاست و روانی ہو اور وہ کلام تعقید لفظی اور معنوی سے خالی ہو۔ شعر میں غیر ضروری تشبیہ و استعارہ کا استعمال نہ کیا جائے جس سے مفہوم گنجلک ہو اور ذہن کی رسائی اصل مفہوم تک مشکل ہو جائے۔ کلام مختصر ہو یعنی کم لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے اگر طوالت موقع اور محل کے حساب سے ہے تو وہ اختصار کے منافی نہیں۔ اختصارِ کلام کے ذیل میں رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ ''لفظوں کی زیادتی اگر مطلب کی توضیح، کلام کی تاثیر یا بیان کی تزئین کے لیے ضروری ٹھہرے تو وہ بھی اختصار کے اندر آجائے گی اور لفظوں کی کمی اگر خیال کے مکمل اور واضح اظہار میں حائل ہو تو یہ اختصار کا وصف نہیں اغلاق کا عیب ہوگا۔ یاد رہے کہ اختصار وہی پسندیدہ ہے جو کلام کو سادگی کی صفت سے محروم نہ کر دے۔''[7]

اسی باب کے تحت رضوی ادیب نے کلام کے اندر 'زور'، 'مناسبت الفاظ'، 'جدّت'، 'صنعتوں کا حسن استعمال' کے حوالے سے بالتفصیل مثالوں کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے جس سے ان کے تنقیدی افکار و خیالات کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے اور مستقبل کے شاعروں اور نقادوں کے لیے تفہیمِ شعر کے راستے مزید کھلتے ہیں۔ کلام میں 'زور' کا مطلب یہ ہے کہ شاعر جن جذبات و احساسات کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہے وہ پوری طرح آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جائے، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کلام میں بہت بھاری بھرکم اور دقیق الفاظ استعمال کیے جائیں بلکہ شعر کی بندش اور اس کے الفاظ ایسے ہوں جس سے شعر کی کیفیت مکمل واضح ہونے کے ساتھ شاعر کے جذبات کی پوری طرح ترجمانی ہو جائے۔ 'مناسبت الفاظ' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں جیسے لفظ کی مناسبت اگر خیال سے ہو تو وہ بلاغتِ کلام میں داخل ہے اور اگر لفظ کی مناسبت لفظ سے ہو تو وہ فصاحتِ کلام میں داخل ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ مناسبت الفاظ سے یہ مراد نہیں کہ شعر میں تلازمے کی رعایت کی جائے۔ یعنی ایک چیز کا ذکر کر کے اس سے متعلق چیزوں کا ذکر لازماً کیا جائے۔ جیسے مراعاۃ النظیر اور سیاقۃ الاعداد وغیرہ۔ فصاحت و بلاغت کے حوالے سے کتاب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کی گنجائش اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر ادیب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے شعر میں دو اہم عنصر مانتے ہیں۔ ایک 'موزونیت' اور دوسرا 'اثر' اور ان دونوں عناصر یعنی موزونیت اور اثر، کلام میں اسی وقت پائے جائیں گے جب کلام میں مذکورہ خصوصیات (سادگی، اختصار، زور، مناسبت الفاظ، جدت اور صنعتوں کا حسن استعمال) پائی جائیں، تب وہ کلام باثر اور موزوں شعر کہلائے گا۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''......اور چونکہ شعر کا اثر کلام کی مذکورہ بالا خصوصیات کا تابع ہے، اسی لیے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان خصوصیتوں میں سے جتنی اور جس مقدار میں کسی شعر میں جمع ہو جائیں گی اسی حد تک وہ شعر اچھا ٹھہرے گا اور اسی لیے شعری تنقید کرتے وقت ان سب خصوصیتوں پر نظر رکھنا ضروری ہے...... شعر

سے کیف وسرور حاصل کرنے کے لیے ان عناصر کو سمجھ لینا کافی نہیں ہے جن سے اثر کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ البتہ ان عناصر کو نظر میں رکھ کر اچھے اچھے شاعروں کے کلام کا ایک مدت تک مطالعہ کیا جائے تو شعر سے لطف اندوز ہونے کی فطری صلاحیت میں ترقی اور جلا ہوسکتی ہے۔''

مباحث کے اعتبار سے 'ہماری شاعری' کا دوسرا حصہ زیادہ اہم ہے۔ اس حصے میں رضوی ادیب نے شاعری کے مسائل پر نظری بحث کی ہے اور اپنی بحثوں کے اطلاقات کی عمدہ مثالیں بھی پیش کی ہیں، اردو شاعری پر ہونے والے اعتراضات کا مفصل جواب دینے اور تحقیقی نظر ڈال کر مع مثال اور مضبوط دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس حصے میں انھوں نے شاعری کے اسی پہلو پر گفتگو کی ہے جو حالی کے یہاں پوری طرح بحث کا موضوع نہیں بن سکا، یعنی ہماری غزلیہ شاعری کے مخصوص اور محدود مضامین کی ترجمانی کی وجہ سے حالی نے غزل کو محض ایک بے سود اور دور از کار صنف قرار دیا تھا اور غزل کو منفی پہلوؤں کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ''عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں، اب وہ وقت گیا، عیش وعشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔''[9] حالی کے اعتبار سے غزل موجودہ زمانے کی صنف نہیں رہی مگر مسعود حسن رضوی نے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے غزل کے مضامین کی وسعت اور ان کی ہمہ گیری پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''..... اگر غزل صرف عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص ہوتی تو بھی جو لوگ محبت کے مفہوم کی ہمہ گیری اور عشق کی دنیا کی وسعت سے واقف ہیں ان کی نگاہوں میں غزل کا دائرہ بہت تنگ نہ ٹھہرتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل میں عاشق ومعشوق کے تعلقات کے علاوہ ظالم ومظلوم، حاکم ومحکوم، خادم ومخدوم، مختار ومجبور، خالق ومخلوق، وغیرہ کے باہمی تعلقات بھی دکھائے گئے ہیں۔''[10]

غزل کی ہمہ گیری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد بظاہر عشقیہ مضامین سے متعلق مختلف شعروں کی تشریح کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ ان شعروں کے مفاہیم کس طرح مختلف صورتوں میں اور مختلف واقعوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ عشقیہ موضوعات سے متعلق نظر آنے والے شعر بھی فقط جذبہ عشق کے اظہار تک محدود نہیں رہتے ہیں۔ اردو شاعری پر ایک عام اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں گل وبلبل کے افسانوں کے سوا رکھا کیا ہے، ایسے لوگوں نے اردو شاعری میں 'گل وبلبل' کے مفہوم کو محدود نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری میں جہاں بھی 'گل وبلبل' کے الفاظ آئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی افسانے سناتے ہیں اور ایک ہی مفہوم کو الٹ پھیر کر بیان کرتے ہیں۔ ایسے نقادوں کی سخن فہمی پر حیرت کرتے ہوئے رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''کہاں یہ قول کہ اردو شاعری میں گل وبلبل کی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں، اور کہاں یہ حقیقت کہ انھیں کہانیوں میں سب کچھ ہے...... اردو کے شاعروں نے ......گل وبلبل کے پردے میں ہمیشہ انسانی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کیا ہے، یا انسانی فطرت کا راز کھولا ہے......گل وبلبل ان دو لفظوں سے شاعروں نے جو جو چیزیں مراد لی ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے اردو اور فارسی شاعری میں گل وبلبل کا قریب قریب وہی حال ہے جو یوروپی زبانوں کی شاعری میں یونانی دیومالا کی دیویوں اور دیوتاؤں کا ہے، اس لئے جتنے شعروں میں گل وبلبل کا ذکر آتا ہے ان سب کو یکساں سمجھنا غلطی ہے اور بہت بڑی غلطی ہے۔''[11]

درج بالا بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گل وبلبل کے علاوہ شمع، وپروانہ، سرو، قمری، صیاد، گلچیں، گلشن، آشیانہ، بجلی، ساقی، بادہ، شراب، ساغر، بجلی، شاہین، نشیمن، کافر، ظالم ومظلوم سیکڑوں ایسے الفاظ آتے ہیں جن کے ذریعے شاعر اپنا مطلب تمثیل کے پیرائے میں ادا کرتا ہے۔ ایسے اشعار محض بیانِ واقعہ تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے پردے میں دوسرے ان مفاہیم کی ترجمانی بھی کی جاتی ہے جو زندگی کے دیگر شعبوں سے متعلق ہیں لیکن مفہوم تک رسائی کے لیے ذہنِ رسا کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب نقاد کے اندر سخن فہمی اور شعر فہمی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہو، کیونکہ شعر سمجھنا شعر کہنے سے زیادہ مشکل عمل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'ہماری شاعری' رضوی ادیب کی ایسی تصنیف ہے جس نے 'مقدمہ شعروشاعری' کے بعد تنقید کے نئے تصورات اور جدید رجحانات کو پیش کیا ہے۔ مقدمہ شعروشاعری میں حالی نے اپنی روایت کا جائزہ جس طریقے سے لیا تھا اس نے اردو شاعری کے پورے سرمایے کی قدر وقیمت کو بہرحال کسی نہ کسی حد تک کم کر دیا تھا اور اس کی آفاقیت کو کافی حد تک محدود کر دیا تھا۔ بہت سے لوگ اساتذہ سخن کی سحرکاریوں اور معجز نگاریوں کو خرافات اور بے کار سمجھنے لگے تھے، ان ہی اسباب وعلل سے 'ہماری شاعری' جیسی شاہکار تصنیف وجود میں آئی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ 'مقدمہ شعروشاعری' کی اہمیت پہ کچھ آنچ آگئی یا اس کی قدر وقیمت میں کمی ہوگئی بلکہ اس میں جو بعض خامیاں اور کمیاں ادیب نے محسوس کیا اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جس کا اعتراف خود رضوی ادیب نے 'ہماری شاعری' کے مقدمہ میں کیا ہے کہ ''.....لیکن خواجہ حالی کی رایوں سے اختلاف کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ انھوں نے چھوڑ دیا تھا اسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی 'ہماری شاعری' 'شعروشاعری' کا جواب نہیں بلکہ اس کا تتمہ ہے۔''[12] انھوں نے 'ہماری شاعری' لکھ کر اردو شعروشاعری کی آفاقیت کو قائم کرنے کا کام کیا۔ اور جو شعروشاعری کی روایت کسی خاص احاطے میں محدود ہورہی تھی اس کو عالمی ادب کے روبرو کھڑا کر دیا۔ بعد کی شعری تنقیدات کی عمارت 'ہماری شاعری' کی بنیاد پر کافی حد تک تیار کی گئی ہے۔ ہم نے اس مختصر سے مضمون میں فن شاعری کے حوالے سے ادیب کے چند اہم خیالات وتصورات اور شاعری یا بعض لوازمات شاعری پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات جو انھوں نے پیش کیے ہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں پر ادیب کے مکمل تنقیدی افکار وخیالات کو سمیٹنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوزے میں دریا کو سمونا، لہٰذا ان کے تنقیدی تصورات کی کامل وضاحت کے لیے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ بہرحال 'ہماری شاعری' کے مطالعے کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسعود حسن رضوی ادیب کے نزدیک شاعری کے افادی پہلوؤں سے زیادہ اس کے تاثراتی، جمالیاتی اور جذباتی پہلوؤں کی اہمیت ہے لیکن وہ شاعری کے افادی پہلو کو یکسر نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ ''شاعری کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھنا بہ ذات خود تو برا نہیں لیکن اس کے جمالی پہلو کو نظر انداز کر دینا شاعری کی حقیقت کو بھول جانا ہے۔''[13]

حواشی:

(1) ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی ادیب، نول کشور پریس بکڈپو، لکھنؤ، 1953، ص14، (2) ایضاً، ص18-17، (3) ایضاً، صف:20، (4) ایضاً، صف 28-27، (5) ایضاً، ص30، (6) ایضاً، ص 31,32,25، (7) ایضاً، ص26، (8) ایضاً، ص990100، (9) مقدمہ شعروشاعری، الطاف حسین حالی، 1964، ناشر: مطبع انصاری، دہلی، ص: 266، (10) ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی ادیب، نول کشور پریس بکڈپو، لکھنؤ، 1953، ص160-159، (11) ایضاً، ص: 164,165,167، (12) ایضاً، ص4، (13) ایضاً، ص191

■

Abdullah Madni
Research Scholar, JNU
New Delhi - 110067
Mob.: 9990575118
Email: abdullahmadni1@gmail.com

اردو ناول کا سفر

محمد امان اللہ

ادب کا سالک ایک مکمل زمانے کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان منازل کو طے کرتا ہے جو حوادث کے تھپیڑوں کے نتیجے میں ہوا کا رخ متعین کرتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمانے کے رویوں سے سالک کے مزاج میں غیر معمولی تبدیلی بھی دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن جب منزل طے شدہ ہوتی ہے تو سفر آسان اور آرام دہ بھی بن جاتا ہے ورنہ بے جہتی سے انسان فاصلہ تو طے کرتا رہتا ہے مگر جس منزل کا وہ متلاشی ہوتا ہے اس سے دور رہتا ہے۔

اہل زمانہ ادب کے وہ طالب علم ہیں جو زمانے کی تحریروں سے ادب سیکھتے ہیں، سلیقہ سیکھتے ہیں، ہنر سیکھتے ہیں اور موج حوادث کے ساتھ کس طرح قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے یہ فن سیکھتے ہیں۔ گویا زمانے پر بالواسطہ ایک دہری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اسے نہ صرف منزل کی جانب بڑھنا ہے بلکہ اہل زمانہ کے لیے مشعل بھی بننا ہے۔

ماضی قریب اور بعید کے وہ تمام تحریری تجربات جو سالک ادب نے اہل زمانہ کے لیے قلمبند کردیے ہیں اُن کو ایک امانت کی شکل میں من وعن دوسرے عہد تک منتقل کرنا زمانے کی ذمے داری ہے کیونکہ آنے والا زمانہ نہ صرف اس کو پڑھے گا بلکہ ان تحریروں کو حوالوں کے لیے بھی منتخب کرے گا:

لوگ چن لیں جن کی تحریریں میں حوالوں کے لیے
زندگی کی وہ کتاب معتبر بن جایئے

تحریروں کی مختلف انواع ہیں: جیسے ناول، افسانہ، افسانچہ، ناولٹ، داستان، انشائیہ، خاکہ وغیرہ۔

سر دست میں اردو ناول کی روایت پر کچھ قلمبند کرنے کی سعی کررہا ہوں۔ اردو ناول کا آغاز صحیح معنوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے 'مراۃ العروس' سے ہوتا ہے اور آج ڈیڑھ سو سال کے عرصۂ دراز کے گزر جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اردو ناول کے مزاج اور معیار میں موضوع اسلوب، نظریہ، حیات، واقعات، کردار اور کہانی کی پیش کش کے طریقہ کار میں زمانے کے حساب سے تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ لیکن ہر دور میں اردو ناول نگاروں نے ویسا ہی لکھا جیسا وقت کا تقاضا تھا، اردو ناول نگاروں نے ماضی کی روایات اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے اپنے اپنے عہد کو ہمیشہ گویائی بخشی ہے۔ اردو ناول کے سفر کے ہر پڑاؤ سے الگ الگ ادوار کا شعور حاصل کرکے زندگی کو برتنے کا سلیقہ سیکھا جاتا ہے جو اہل زمانہ کے علاوہ بعد کے زمانے کے لوگ بھی سیکھتے رہتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال سے لے کر عبدالصمد، حسین الحق اور غضنفر تک اردو میں ناول کے فن کو ایک نیا موڑ اور ایک نئی زندگی ملتی گئی، ان سب نے وقت اور زمانے کو آئینہ دکھانے کا عمل بخوبی انجام دیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی حالات کو حقیقت پسندانہ انداز میں نہایت فن کاری کے ساتھ اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی۔

ناول اور داستان میں بہت قریبی رشتہ ہے مگر اردو میں داستان کس طرح بدلتے ہوئے حالات کے تحت ناول کے سانچے میں ڈھل گئی اس کی ایک الگ تفصیل ہے۔

اردو کے ابتدائی ناول میں داستانوں کے دیومالائی عناصر کا جائزہ بھی لینے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی ایک الگ اور تفصیل طلب موضوع ہے۔

فی الحال ہمارا موضوع وہ تخلیقی سفر ہے جس نے داستان کو ناول کا رخ دیا اسے مختصراً تین عہد میں تقسیم کرکے اسے آسان انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہانی سننا اور سنانا مشرقی تہذیب کا ایک خاص مشغلہ رہا ہے۔ آپ بیتی، جگ بیتی، داستان گوئی اور حکایات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ اگر ہم مشرق کو کہانیوں کی سرزمین کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ اور ناول اپنے موجود ہیئتی، فنی اور تخلیقی تقاضوں کے ساتھ مغربی مختصر افسانہ اور ناول کے اثر سے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے داستان کے شعور کو جدید روش سے آشنا کیا۔ داستانوں کے غیر فطری ماحول اور فوق البشر کردار اور واقعات کی جگہ حوادث زمانہ کے معاملات اور مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ مراۃ العروس جو 1869 میں شائع ہوئی اردو صنف ناول کے آغاز کا پہلا زینہ ہے۔ مراۃ العروس کی تصنیف کا مقصد بیٹیوں کی تعلیم وتربیت تھا لیکن دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ اسے وہ غیر معمولی پزیرائی حاصل ہوئی جس نے ڈپٹی نذیر احمد کو اس نوعیت کے دوسرے قصے لکھنے پر آمادہ کیا۔ بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامیٰ اور رویائے صادقہ دیگر تصنیفات ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصنیف 'فسانۂ آزاد' نے قصہ نگاری کی روایت کو ایک نئی جہت دی اور ناول نگاری کا میدان ایک نئے افق کو چھونے لگا۔ سرشار نے لکھنوی معاشرے کے ہر طبقے کو سامنے رکھا۔ مذہبی عقائد اور اخلاقی نظریات اور ان کی قوت مشاہدہ نے اس میں چار چاند لگائے۔ سرشار کے یہاں وعظ ونصیحت اور ہندوستانی دیومالائی مناظر کا شعور حاوی ہے۔ ان کی آزاد خیالی اور نذرانۂ بے نیازی نے لکھنوی معاشرے کے تمام طبقات کے احساسات کی ترجمانی کی۔

ابتدائی دور میں سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر کا نام صنفی طور پر ناول کے فن کو نئی بلندیوں سے روشناس کرانے کے لیے ہمیشہ ادب واحترام سے لیا جائے گا۔ انھوں نے واعظانہ اور ناصحانہ رنگ تو اختیار نہیں کیا لیکن ان کے یہاں ماضی کی روشن تاریخ اور روایات کے حوالے سے بھرپور دیومالائی عناصر کی عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ بدرالنسا کی مصیبت، آغا صادق کی شادی، غیب دان دلہن، حسن کا ڈاکو اور خوفناک محبت یہ تمام عبدالحلیم شرر

کے وہ ناول ہیں جن میں سماجی اور معاشرتی موضوعات سے رشتہ بنائے رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

ان کے بعد مرزا ہادی رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو امراؤ جان ادا کا موضوع لکھنوی تہذیب ہے لیکن جو بات امراؤ جان ادا کو اردو کے لازوال ناولوں میں کھڑا کرتی ہے وہ لکھنوی تہذیب کے دیومالائی امتیازات کی عکاسی ہے۔ دلوں کو خوش کرنے کے لیے رسوا نے حسن و عشق کے عناصر بھی خوب شامل کیے ہیں۔

اس صنف میں مرزا ہادی رسوا کے بعد علامہ راشد الخیری اور مرزا محمد سعید کے ناولوں میں بھی یہ عنصر دکھائی دیتا ہے لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند اردو کے سب سے بڑے فکشن نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ہم خورما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار، بیوہ، بازار حسن، نرملا، چوگان ہستی، گوشۂ عافیت، غبن، پردۂ مجاز، میدان عمل، منگل سوتر اور گئودان وہ ادبی سرمایہ ہیں جو پریم چند کے شاہکار ناولوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

پریم چند کے فن کی بلندی ان کے ناول 'گئودان' میں نظر آتی ہے جس میں ہندوستان کے سماجی اور معاشی نظام کے حوالے سے کرداروں اور واقعات کی منظرکشی کی گئی ہے۔

اس صنف میں ایک نام قرۃ العین حیدر کا بھی ہے جو پریم چند کے بعد شاید اردو کی دوسری سب سے عظیم فکشن نگار ہیں۔ ان کے ناولوں نے مشترکہ تہذیب اور بالخصوص مسلم معاشرے کے جاہ و جلال کے نوحے لکھے ہیں۔ میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم، سیتا ہرن، چائے کے باغ، اور اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو؟ وغیرہ قرۃ العین حیدر کے وہ ناول ہیں جو اردو ناول کی تاریخ کا ایک سنگ میل تصور کیے جاتے ہیں۔

ہندو دیومالا میں عشق و محبت کے حوالے سے جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو ناول میں جنسی پہلوؤں کو سب سے پہلے عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں اجاگر کیا۔ ہوس، مرمر اور خون وغیرہ میں وہ جنسی لذت قابل اعتراض حد تک پائی جاتی ہے جسے واضح طور پر فحاشی اور عریانیت کہا جاسکتا ہے لیکن عزیز احمد کا ناول 'گریز' ایک کامیاب ناول مانا جاتا ہے جو فنی اور تخلیقی اعتبار سے ایک مکمل شاہکار ہے۔

اس صف میں ایک نام جو پورے عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے وہ انتظار حسین کا ہے جن کے زیادہ تر ناول اور افسانے کسی نہ کسی شکل میں ہجرت، تقسیم وطن اور ان سے پیدا ہونے والی بحرانی صوت حال کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دن اور داستان، چاند گہن، یہ ان کے دو ابتدائی ناول ہیں جس میں تجرباتی طور پر ایک مخصوص تکنیک کو انتظار حسین استعمال کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں ناول یادوں کی بازیافت کا کام کرتے ہیں جو ہمیں دھندھلے اجالے میں سفر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ ایک سالک ادب کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس صف میں ایک نام جوگندر پال کا ہے جو ایک منفرد حیثیت کے فنکار کے طور پر اپنے تخلیقی تجربات کی ترسیل کے لیے ناول کو وسیلہ بناتے ہیں ان کے کئی ناول سامنے آچکے ہیں جن میں خواب رو اور نادید کافی مقبول ہوئے ہیں۔

اردو میں تقسیم ملک کے بعد کئی بڑے ناول سامنے آئے جیسے کرشن چندر کا غدار، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، قرۃ العین حیدر کا میرے بھی صنم خانے، علیم مسرور کا بہت دیر کردی اور راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی۔ یہ وہ ناول ہیں جنھوں نے اردو ناول میں دوسری جہت کا آغاز کیا۔

چنانچہ اس عہد میں جو ادب سامنے آیا، اس میں نئے ثقافتی حالات کے مطابق شعر و ادب کی دوسری اصناف کی طرح ناول کی بھی ایک نئی شعریات وجود میں آئی۔ عبدالصمد، حسین الحق، پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، الیاس احمد گدی، انور سجاد، ظفر پیامی، اقبال مجید اور ترنم ریاض کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

جدید ناولوں میں نئے منظرنامے کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ 1947 میں تقسیم ملک فرقہ وارانہ فسادات، کروڑوں لوگوں کی ہجرت اور بے مکانی و بے روزگاری وغیرہ نے برصغیر ہند کی مشترکہ تہذیب کی جڑیں ہلا دی تھیں۔ یہ تمام موضوعات علامتی طور پر ان ناولوں میں واضح انداز میں نظر آئیں گے۔

قرۃ العین حیدر اردو کی سب سے محترم اور معتبر فکشن نگار کے طور پر سامنے آئیں جنھوں نے برصغیر کی تہذیبی کروٹوں کو تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ گرفت میں لے کر ماہرانہ فنی و جمالیاتی بساط کے ساتھ پیش کیا اور اس ہنر میں ان کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا۔

مختصر تخلیقی ادب میں احتجاج، مزاحمت اور حالات کی جس قدر عکاسی صنف ناول میں موجود ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں پائی جاتی۔ ناول ہی وہ ایسی صنف ہے جس میں جدید دور کی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے اور انھیں پوری جزئیات کے ساتھ خود میں سمو لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے حالات کی عکاسی بھی ناول میں بخوبی ہوتی ہے۔ انسانی معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے انسان اور انسان کے مابین جس طرح کے تعلقات بن رہے ہیں اس رشتے کی جو بنیاد ہے ان تمام پہلوؤں کا ایک ناول نگار بہت ہی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اپنے تجربات و مشاہدات کو ناول کے کینوس پر اتار دیتا ہے۔

ناول انسانی زندگی کی حقیقت کی تلاش اور پھر اس حقیقت کو بیان کرنے کا موثر حربہ ہے۔ حقیقت کی ترجمانی کے لیے اس نے قصہ کہانی کا رنگ اختیار کیا لیکن اس کا مقصد محض تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا نہیں بلکہ سماجی زندگی کے مختلف رویوں کو ظاہر کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ ناول زندگی کے ماضی، حال اور مستقبل کی بیک وقت عکاسی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے وسیع کینوس پر سماج میں واقع ہونے والے مختلف واقعات و حادثات کو پیش کیا جاتا ہے۔ الغرض ناول عوامی زندگی کو بیان کرنے والی نثری صنف کا نام ہے جسے سالک ادب، اہل زمانہ کے لیے ایک داستان کے روپ میں پیش کرتا ہے اور یہ قصے ایک زمانے تک سنائے جاتے رہتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Amanullah
Govt. Jubilee Inter College
Baxipur, Gorakhpur - 273001 (UP)

سلسلۂ صحافت

اختر آزاد

طنز و مزاح اور الکٹرانک میڈیا

'طنز' اور 'مزاح' معنٰی کے اعتبار سے اپنی الگ الگ دنیا رکھتے ہیں، لیکن فکری اور اثر انگیزی کے اعتبار سے ادب میں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنٰی۔ اس لیے دونوں اپنے اس رشتے کو بخوبی نبھاتے بھی ہیں۔ کیونکہ جہاں صرف 'طنز' کا پہلو اُبھرتا ہے اسے کوئی برداشت نہیں کرتا۔ اس میں انھیں اپنی توہین نظر آتی ہے۔ ایسے لمحات میں 'مزاح' مرہم کا کام کرتا ہے۔ لیکن اگر مزاح نگار عقلِ سلیم سے کام نہیں لیتا تو مزاح تمسخر بن کر رہ جاتا ہے۔ طنز کے پیچھے مثبت خیال کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ مقصد بھی فوت ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن جب دونوں کے حسین امتزاج سے طنز و مزاح کی جو نئی دنیا آباد ہوگی وہاں اگر آنسو چھلکیں گے تو ساتھ میں ہونٹوں پر قہقہے بھی رقص کریں گے۔ یہاں مزاح کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی کا قول یاد آرہا ہے۔

''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے کیا جائے: ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوشبو کی لپٹ جس سے تمام پژمردہ دل و دماغ باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفر اور حکما بلکہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔'' (مقالاتِ حالی: الطاف حسین حالی، ص 149)

وزیر آغا نے مزاح کو ایک ایسی شے بنا کر پیش کیا جو پتھر دل کو بھی موم بنا سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تبسم، ہنسی، قہقہہ کو ایک کامیاب زندگی کا مظہر قرار دیا۔

''زندگی کی سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس مادیت جو قریب قریب ہر شے کو اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے ہے، انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر ملائم ہو جاتی ہے۔''

''....... یہ احساس مزاح اور اس کے مظہر یعنی تبسم، ہنسی، قہقہہ ہی دراصل ہمیں اس سنجیدہ کائنات میں زندہ رکھنے کے ذمے دار ہیں اور انھی کے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح: وزیر آغا، ص 29)

مجتبٰی حسین نے ہنسی کو انسانی تہذیب کے ارتقا کا بنیادی عنصر قرار دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب سے ہنسی بے دخل ہوگئی تو ہمارا معاشرہ روبہ زوال ہوگا۔ زوال پذیر معاشرے کے ہونٹوں پر خوشیوں کے چاند تارے ٹانک دیے جائیں تو زندگی میں اُجالا پھیل جائے گا، کیونکہ ہنسی زندگی کی علامت ہے۔ ان کے قول پر ایک نظر ڈالیے۔

''انسانی تہذیب کا سفر دراصل ہنسی کے ارتقا کا سفر ہے۔ کسی معاشرے کی ہنسی ہی اس کی تہذیب کے ارتقا کی علامت ہوتی ہے۔ رونے کے لیے اتنا شعور درکار نہیں جتنا ہنسنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔''

(مجتبٰی حسین 'اردو ادب میں طنز و مزاح' مرتب: ڈاکٹر خالد محمود)

مشتاق احمد یوسفی کی رائے اس سلسلے میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ لوگ کب، کیوں اور کس پر ہنستے ہیں اس کا بھی جواز ان کے پاس ہے۔ لیکن بتانے سے اس لیے قاصر ہیں کہ معلوم ہو جائے تو لوگ ہنسنا چھوڑ دیں گے۔ اور جس دن لوگ ہنسنا چھوڑ دیں گے موت واقع ہو جائے گی۔ اس بات کو انھوں نے بہت ہی خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کیا ہے۔

''لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن

ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہوجائے گا۔ انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا سوال کہ کس پر ہنستے ہیں تو اس کا انحصار حکومت کی تاب اور رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں..... لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس، ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں جواب ہماری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔'' (خاکم بدہن: مشتاق احمد یوسفی، ص 11)

مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، مولانا عبدالماجد دریابادی، کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین کے علاوہ بھی بہت سارے نام ایسے ہیں جنھوں نے اردو طنز و مزاح کی دنیا کو ذہانت سے مالا مال کیا ہے۔

پطرس بخاری تو آل انڈیا ریڈیو، اردو سروس کے ڈائریکٹر کے عہدے پر برسوں فائز رہے۔ شہرت بخاری، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک یہ نام ایسے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ریڈیو کے ساتھ جڑا تھا اور ان کے مزاحیہ مضامین اور ڈرامے گاہے بگاہے نشر بھی ہوتے تھے۔ لیکن اب جب سے ٹیلی ویژن کی حکمرانی قائم ہوئی ہے ریڈیو پر طنز و مزاح کی دنیا زوال پذیر ہوئی پڑی ہے۔

اب بات الکٹرانک میڈیا کی ہے۔ زمانہ جس تیز رفتاری سے آگے بڑھا ہے اور اس سے پوری دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ جہاں پہلے پہل طنز و مزاح پرنٹ میڈیا کی گود میں ہنستے مسکراتے بچپن سے جوانی کا سفر طے کرنے میں کامیاب ہوا وہیں آج الکٹرانک میڈیا نے اپنی صحت مند جوانی کے اسرار کو اپنے نہاں خانے میں چھپائے اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔ کل کسی حادثے یا خوشگوار ردعمل کو پرنٹ میڈیا سے گزرنے میں کم از کم بارہ سے چوبیس گھنٹے لگ جاتے تھے لیکن آج الکٹرانک میڈیا نے اپنی تیز رفتاری کے باعث اس سفر کو منٹوں میں طے کر کے اپنے رِدِّعمل کا برملا اظہار اور وہ بھی بغیر کسی روک ٹوک کے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے آج دنیا کے کسی کونے میں بھی آپ چلے جائیں الکٹرانک میڈیا آپ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہے گا اور آپ تنہائی میں بھی ہنسنے مسکرانے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لیں گے۔

بیں بائیس سالوں میں الکٹرانک میڈیا نے بڑے بڑے شہروں کو ہی نہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ کیبل آپریٹر سسٹم اور ڈی ٹی ایچ ڈائریکٹ ٹو ہوم نے پاؤں جمانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ آج تقریباً 90 فی صد گاؤں کے لیے انٹرٹینمنٹ کا ذریعہ ٹی وی ہے۔

90 کی دہائی میں سب سے بڑا نام جسپال بھٹی کا اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ انھیں ان کی بہترین مزاحیہ اداکاری کے لیے پدم بھوشن جیسے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا گیا، جنھیں ہندوستانی ٹیلی ویژن کا آج بھی 'کنگ آف کامیڈی' کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں صرف ڈی ڈی نیشنل ہوا کرتا تھا۔ بعد میں بہت سارے چینل سامنے آئے۔ جسپال بھٹی نے یوں تو طنزیہ اور مزاحیہ کئی سیریل بنائے جن میں 'ڈی ڈی نیشنل' کے لیے 'اُلٹا پلٹا'، 'فلاپ شو'، 'فُل ٹینشن' بعد میں سب ٹی وی کے لیے 'تھینک یو جیجا

جہاں پہلے پہل طنزو مزاح پرنٹ میڈیا کی گود میں ہنستے مسکراتے بچپن سے جوانی کا سفرطے کرنے میں کامیاب ہوا وہیں آج الکٹرانک میڈیا نے اپنی صحت مند جوانی کے اسرار کو اپنے نہاں خانے میں چھپائے اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔ کل کسی حادثے یا خوشگوار رد عمل کوپرنٹ میڈیا سے گزرنے میںکم از کم بارہ سے چوبیس گھنٹے لگ جاتے تھے لیکن آج الکٹرانک میڈیا نے اپنی تیز رفتاری کے باعث اس سفر کو منٹوں میں طے کر کے اپنے ردِّ عمل کا بر ملا اظہاراور وہ بھی بغیر کسی روک ٹوک کے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

جی' اور زی ٹی وی کے لیے 'ہائے زندگی اور وائے زندگی' جیسے اہم کامیڈی سیریلس شامل ہیں جس میں 'فلاپ شو' کو بے انتہا شہرت ملی۔ یہ 10 ایپی سوڈ کا سیریل تھا جو 1991 میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔ جس کے موضوعات تھے (1) چیف گیسٹ (2) میڈیکل بلس (3) گھریلو جائیداد (4) کونٹریکٹر (5) پی ایچ ڈی (6) گورنمنٹ آفیشیل میٹنگ (7) گورنمنٹ آفیسر (8) ڈاکٹر (9) لائن مین اور (10) ٹی وی سیریل........ پہلے ایپی سوڈ 'چیف گیسٹ' میں جسپال بھٹی نے آج کے تناظر میں نہایت ہی فنکاری کے ساتھ 'چیف گیسٹ' کا مذاق اُڑاتے ہوئے اوڈینس کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جب جسپال بھٹی وقت کی قدر کرتے ہوئے صحیح وقت پر فنکشن میں پہنچ جاتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ منتظمین تیاری میں مصروف ہیں اور سب کو یہی لگتا ہے کہ چیف گیسٹ ہندوستانی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے گھنٹہ دو گھنٹہ لیٹ سے آئیں گے۔ لیکن بر وقت پہنچ جانے کے باعث جو کچھ ہوتا ہے اسے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چیف گیسٹ کے استقبال کے لیے نہ ہی لوگ ہیں اور نہ ہی پھولوں کی مالا۔ کلائمکس میں جسپال بھٹی خود اپنے ذریعہ لائے ہوئے مالا کو گلے میں پہن کر اپنا استقبال کرتے ہیں۔ یہ ہندوستانی کلچر کا ایک ایسا آئینہ ہے جہاں چیف گیسٹ لیٹ سے پہنچنے اور ختم ہونے سے پہلے ہی پروگرام سے نکل جانے کو اپنی شان سمجھتے ہیں، ویسے نام نمود والے لوگوں کے منہ پر یہ سیریل ایک زبردست طمانچہ ہے۔

'آفس آفس' سیریل میں ایکٹر پنکج کپور نے مُسدّی لال کا کردار بہت ہی خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ یہ سیریل سب ڈی وی پر 2001 میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔ مُسدّی لال یعنی پنکج کپور کو طنزیہ اور مزاحیہ اداکاری کے لیے 'بیسٹ کومیڈی ایوارڈ' سے لگا تار دو سال نوازا گیا۔ اس سیریل میں دراصل آفس کے کرپشن کو بے نقاب کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سرکاری دفاتر میں سرکاری بابو پیسے کے لالچ میں لوگوں کے اپلیکیشن میں نقص نکال کر ان کی فائلیں دبا دیتے ہیں یا بہانے پر بہانہ بنا کر آج کل پر ٹالتے رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی جیب گرم ہوتی ہے سالوں سے دبی فائلیں منٹوں میں مع دستخط و مُہر باہر آجاتی ہیں۔

یہاں ایک اور ٹیلی سیریل لیٹ نائٹ ٹاک شو 'موورس اینڈ شیکرس' کا ذکر کرنا چاہوں گا جس میں بڑے بڑے سلیبریٹیز کا انٹرویو لیا جاتا تھا اور ان کی فلموں کا پرموشن بھی کیا جاتا تھا۔ یہ سیریل 1997 سے 2011 تک سونی پر دکھایا گیا۔ بعد میں اس کے کچھ حصے سب ٹی وی پر 2012 میں ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ اس میں شیکھر سمن نے زمانے کی تلخیوں اور کج رویوں کو اپنے بندر کے ذریعے دکھانے کی ایک کامیاب سعی کی تھی۔

آج کل ٹی وی کی دنیا میں کومیڈی کا ایک نیا بادشاہ کپل شرما سامنے آیا ہے جنھوں نے 2007 میں 'دی گریٹ انڈین لافٹر چیلنج 3' میں ایک امیدوار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ انھوں نے 'کومیڈی نائٹ وِتھ کپل' کے ذریعے ایک نیا معیار قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سیریل 22 جون 2013 سے شروع ہوا۔ 24 جنوری

2016 تک کلر میں ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا۔ دھرمیندر اس سیریل کے پہلے گیسٹ تھے جن کی فلم 'یملا پگلا دیوانہ' کا پروموشن کیا گیا تھا اور 191ویں گیسٹ اکشے کمار اور نمرت کور تھے جن کی فلم 'ایئرلفٹ' کو آخری شو میں پرموٹ کیا گیا تھا۔

ہندوستانی ٹی وی سیریل کی دنیا میں ایک اہم سیریل 'تارک مہتہ کا اُلٹا چشمہ' بھی ہے۔ 28 جولائی 2008 سے 23 دسمبر 2016 تک اس کی 2100 قسطیں 'سب ٹی وی' پر دکھائی جا چکی ہیں۔ اور اب بھی اس کا سفر جاری ہے۔ 2015 میں جب اس کی 1700 قسطیں ٹیلی کاسٹ ہوئی تھیں تب 22 جون 2015 کو 'لمکا بک آف ریکارڈ' نے سب سے لمبے وقت تک چلنے والے طنزیہ و مزاحیہ ٹی سیریل کے ایوارڈ سے اسے نوازا۔ اس سیریل میں ممبئی کی گوکل دھام سوسائٹی میں چھ ہندوستانی فیملی تارک مہتہ (راجستھان) جیٹھالال (گجرات) آتما رام (مہاراشٹر) ڈاکٹر ہنس راج (بہار) سردار روشن سنگھ سوڈی (پنجاب) جن کی بیوی پارسی خاندان کی ہیں، کرشنن سبرامنیم وکیل (تمل ناڈو) جن کی بیوی بنگالی ہیں، اور ایک بیچلر صحافی پوپٹ لال (بھوپال) رہتے ہیں۔ پورے ہندوستان کی نمائندگی جس طرح سے اس سیریل میں ہوئی ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی سیریلس ایسے ہیں جس نے ہندوستانی ٹی وی دیکھنے والوں کے ذہن کو برسوں اپنے مزاحیہ کرداروں سے ہنسی مذاق کی پھلجھڑیاں بکھیری ہیں جن میں ہم پانچ، تو تو میں میں، دیکھ بھائی دیکھ، نکڑ، زبان سنبھال کے اور منگیری لال کے حسین سپنے وغیرہ۔

آج بھی کئی سیریلس ایسے ہیں جو صرف طنز و مزاح کو اپنی گود میں سمیٹے ناظرین کا دل جیتنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسے صاحب بی بی اور باس (سب ٹی وی)، 'بھابھی جی گھر پر ہیں' (کلرس ٹی وی) نیلی چھتری والے (زی ٹی وی) چڑیا گھر (زی ٹی وی) وغیرہ۔ حالانکہ بھی اس معیار پر کھرے نہیں اترتے۔ اس کے باوجود دیکھنے کے لائق ہیں۔ لیکن کچھ جیسے غیر معیاری ہیں، جس میں جنسی ذو معنی الفاظ کی بھرمار اور ٹی آر پی کی للک نے شو کو پوری طرح سے فوہڑ بنا دیا ہے۔

اب ذرا ٹی وی کی دنیا سے نکل کر انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی دنیا کی طرف چلتے ہیں۔ آج پوری دنیا گلوبلائزیشن میں تبدیل ہو کر ایک گاؤں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ الکٹرانک میڈیا میں خاص طور پر سوشل میڈیا کی بات کریں تو فیس بک، ٹویٹر اور وہاٹس ایپ نے بڑی کم مدت میں اپنے چاہنے والوں کی ایک الگ ہی دُنیا روشن اسکرین پر آباد کر رکھی ہے۔ فیس بک میں طنز و مزاح کی ایک نئی کائنات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے گی۔ اور آپ بھی اس بات کو کچھ حد تک ماننے لگیں گے کہ سوشل میڈیاز میں بھلے ہی طنز و مزاح آج اپنے ارتقائی سفر میں ہو، لیکن ربع صدی تک پہنچتے پہنچتے اس میں استحکام اور وقار پیدا ہوگا۔

فیس بک کا ایک پوسٹ دیکھیے جس میں دو دوستوں کے درمیان اپنی اپنی ماں کو لے کر گفتگو ہوتی ہے کہ ان کی جگہ کیا ہے، ان کا مقام کیا ہے۔ وہ اولڈ ایج ہوم کی پراپرٹی ہیں یا گھر کی رونق۔ اسے بڑی ہی خوبصورتی سے یہاں پیش کیا گیا ہے۔ پڑھیے اور ماں کی یاد میں گم ہو جائیے۔ ماں آپ کے سامنے چلی آئیں گی۔ منی کہانی دیکھیے۔

ایک مدت بعد دو دوست آپس میں ملے تو ایک نے باتوں ہی باتوں میں دوسرے سے اُن کی ماں کے متعلق پوچھا۔ ''ان دنوں ماں کا کیا حال ہے۔'' دوسرے نے بتایا۔ ''آج ماں کا جنم دن ہے۔ میں صبح سویرے ان کے پیر چھونے گیا تھا۔ ابھی اولڈ ایج ہوم سے ہی آ رہا ہوں۔ سب ٹھیک ہے دوست۔'' پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اخلاقاً اسے بھی ان کی ماں کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ ''تمھاری ماں تو تمھارے ساتھ رہتی ہوں گی۔'' یہ سُنتے ہی دوسرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں دوست میں ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا ہوں کہ ماں کو رکھ سکوں۔ میں آج بھی ماں کے پاس رہتا ہوں۔'' (رقیب عالم، فلمی نغمہ نگار و گلوکار)

حالانکہ یہ کہنے میں مجھے عار نہیں ہے کہ فیس بک، وہاٹس ایپ اور ٹویٹر پر جو کمنٹس ہوتے ہیں وہ سب کے سب معیاری ہی ہوتے ہیں۔ اس پلیٹ فارم پر ایک عام آدمی بھی اپنی رائے رکھنے کا اتنا ہی حق رکھتا ہے جتنا کسی خاص کو حاصل ہے۔ لیکن ان میں کچھ کا رشتہ ادب سے جُڑا ہوتا ہے۔ ان میں کچھ ادیب و شاعر اور نقاد ہوتے ہیں جو صرف ادب کے ہی پارکھ نہیں ہوتے بلکہ زمانے کے نباض بھی ہوتے ہیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ وہ سماج کی کوکھ میں اُترتے ہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر مثبت اور منفی سوچ بھی رکھتے ہیں۔ جس کا عکس ان کی تحریروں میں جابہ جا نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ ردعمل ہے جو آج منٹوں میں انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ اور اُنھیں کچھ ہی دیر بعد اپنے عمل کا ردعمل بھی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس لیے آج کے تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو الکٹرانک میڈیا طنز و مزاح کے فروغ میں پوری طرح نہ سہی لیکن ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔

گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ وہ سماج کی کوکھ میں اُترتے ہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں اس پرمثبت اور منفی سوچ بھی رکھتے ہیں۔جس کا عکس ان کی تحریروں میں جابہ جا نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ رد عمل ہے جو آج منٹوں میں انٹر نیٹ کے ذریعے پوری دنیامیں پھیل جاتا ہے۔ اور اُنہیں کچھ ہی دیر بعد اپنے عمل کا ردعمل بھی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس لیے آج کے تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو الکٹرانک میڈیا طنزو مزاح کے فروغ میںپوری طرح نہ سہی لیکن ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔

■

Dr. Akhtar Azad
House No: 38, Road No: 1, Azad Nagar
Jamshedpur - 832110 (Jharkhand)
Mob.: 95726883122
Email.: dr.akhtarazad@gmail.com

بلراج ساہنی

انیس امروہوی

ہندوستان کے صوبہ پنجاب نے جہاں زندگی کے دُوسرے شعبوں میں بڑے بڑے فنکار پیدا کیے ہیں، وہیں فلمی دُنیا کو بھی کئی اہم ستون بخشے ہیں۔ پرتھوی راجکپور، دلیپ کمار، ساحر لدھیانوی، راجکپور، دھرمیندر، راج کھوسلہ، بی۔ آر چوپڑہ، یش چوپڑہ، نور جہاں، پران، راجندر سنگھ بیدی اور راجیندر کمار وغیرہ کے نام فلمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اُسی پنجاب نے، چاہے وہ پاکستان کا پنجاب ہو یا ہندوستان کا پنجاب...... یا ہم یوں کہیں کہ غیر منقسم پنجاب نے ایک بہت بڑے فنکار کو جنم دیا جو آگے چل کر فلمی دنیا کا اہم ستون ثابت ہوا۔

بلراج ساہنی کا جنم یکم مئی 1913 کو راولپنڈی میں ہوا تھا، جو تقسیم وطن کے بعد اب پاکستان میں ہے۔ راولپنڈی دو بڑے شہروں، لاہور اور پیشاور کے درمیان میں ایک نسبتاً چھوٹا شہر تھا۔ پیشاور کے لوگ پرانی وضع کے تھے، جبکہ لاہور نئی روشنی کا شہر تھا، لیکن بلراج جی کے بچپن میں راولپنڈی میں بھی نئی روشنی ہونے لگی تھی، اور قدیم شہر جدیدیت کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی وجہ سے بھی لوگوں میں ایک نیا سیاسی شعور بیدار ہونے لگا تھا۔ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے لگی تھی اور نمک کا قانون بھی توڑا جانے لگا تھا۔

بلراج ساہنی کی زندگی کی کہانی بھی اپنے آپ میں ایک عجیب و غریب داستان ہے...... بڑی سادہ سی زندگی، مگر کتنی جدوجہد بھری۔ بلراج ساہنی کے والد ہربنس لال ساہنی راولپنڈی کے چھاچھی محلّہ کے ایک دومنزلہ مکان میں اپنی بیوی لکشمی، دو بیٹوں، بلراج اور بھیشم اور دو بیٹیوں، ویراں اور سمترا کے ساتھ رہتے تھے۔ ان سب بچوں میں تیسرے نمبر پر بلراج ساہنی تھے اور بھیشم سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، جس میں کمیشن کے طور پر اوسط آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ ان کے والد کی بازار میں کوئی دوکان نہیں تھی، بلکہ گھر پر ہی مکان کے نچلے حصے میں انھوں نے ایک چھوٹا سا دفتر بنا لیا تھا۔ خاندان کے سب لوگ گھر کے اوپری حصے میں رہتے تھے۔ بلراج جی کے والد ہربنس لال ساہنی آریہ سماجی خیالات کے تھے اور راولپنڈی کے آریہ سماج کے منتری بھی تھے۔ ان دنوں آریہ سماج کا ہمارے معاشرے پر اثر بڑھ رہا تھا اور مورتی پوجا، مذہبی ڈھونگ اور اندھے عقائد و روایات کے خلاف ویدک ادب، سنسکرت زبان اور سچے صوفی ازم کے رجحانات سماج پر کافی اثر ڈال رہے تھے۔

بلراج ساہنی اور اُن کے چھوٹے بھائی بھیشم ساہنی کو بچپن میں گروکل میں سنسکرت پڑھنے کے لیے بھیجا گیا، مگر وہاں دونوں کا دل نہیں لگا اور ایک دن بلراج ساہنی نے اپنا فیصلہ اپنے والد کو سنا دیا کہ وہ اب گروکل میں نہیں بلکہ اسکول میں پڑھیں گے۔ اُن کے والد اس بات سے حیران رہ گئے، مگر حقیقت میں بلراج ساہنی نے جیسے ان ہی کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اپنا سارا کام اُردو یا انگریزی میں کرتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ نئی طرز کی تعلیم اب اُن کے بچوں کے لیے بھی ضروری ہو گئی ہے۔ ان کی والدہ بھی بچوں کو نئی تعلیم دلانے کے حق میں تھیں، اس لیے دونوں بھائیوں کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ بڑے بھائی بلراج ساہنی چھوٹے بھائی بھیشم ساہنی سے صرف دو سال ہی بڑے تھے، مگر انہیں چوتھی کلاس میں اور بھیشم ساہنی کو پہلے درجے میں داخلہ ملا۔

بلراج ساہنی لڑکپن سے ہی اپنا ادبی رجحان نظموں کے ذریعے ظاہر کرنے لگے تھے، صرف پندرہ برس کی عمر میں ہی وہ اردو میں شعر کہنے لگے۔ ایک پوری نظم انگریزی میں بھگت سنگھ کی یاد میں کہہ ڈالی۔ بلراج اور بھیشم دونوں بھائیوں نے مڈل کلاس تک کی تعلیم راولپنڈی میں ہی حاصل کی، بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لاہور چلے گئے۔

بلراج ساہنی کو بچپن سے ہی ادبی ماحول اپنے خاندان میں ہی مل گیا تھا۔ ان کی دو پھوپی زاد بہنیں کشمیر میں رہتی تھیں، جن میں سے ایک پروشارتھ وتی کے شوہر جانے مانے ادیب اور مدیر چندر گپت ودیالنکار تھے، جو ادب پر اکثر بحثیں کرتے رہتے تھے۔ بلراج ساہنی نے بچپن میں اپنی والدہ سے بھی سنا تھا کہ ان کی دادی بھی کویتا کہتی تھیں اور ان کے کاروباری والد نے بھی بتایا تھا کہ ایک زمانے میں انھوں نے بھی ایک ناول لکھا تھا، مگر وہ شائع نہیں ہو سکا تھا۔

بلراج ساہنی کی تعلیم ایم۔اے انگریزی تک ہونے

کے بعد ان کے والد ہربنس لال ساہنی نے ان کو اپنے کپڑے کے کاروبار میں شامل کر لیا۔ شادی کے بعد 1937 میں بلراج ساہنی نے والد اور چھوٹے بھائی بھیشم ساہنی کو کاروبار اور دفتر کی ذمے داریاں سونپ کر گھر والوں سے الوداع کہا اور اپنی بیوی دمینتی کے ساتھ کولکاتہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن چلے گئے، جہاں انھوں نے ہندی اور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

شانتی نکیتن کا ماحول بلراج ساہنی کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ وہاں پہنچ کر بلراج کے دل نے گواہی دی کہ یہی زندگی ہے جو وہ جینا چاہتا ہے۔ شروع شروع میں شانتی نکیتن کے پُرسکون ماحول میں بلراج ساہنی کا دل خوب لگا، مگر جلد ہی وہ وہاں کی یکسانیت اور موسیقی ریز ادبی ماحول سے اُکتا گئے۔ ان کو وہاں کی شانت اور پُرسکون زندگی سے اُلجھن سی ہونے لگی، کیونکہ ان کے دل میں کچھ کر گزرنے کا ارمان جوش مار رہا تھا۔ بلراج ساہنی کے دل میں ملک و قوم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا جذبہ موجزن تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ملک کی روح، ہندوستان کی آتما اُن کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ملک و قوم کی اس آواز پر بلراج ساہنی مہاتما گاندھی کے پاس وردھا جا پہنچے۔

وردھا پہنچ کر انھوں نے رسالہ 'نئی تعلیم' کی ادارت اپنے ذمے لے لی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ 1939 میں بلراج ساہنی کو بی۔ بی۔ سی لندن سے مراسلہ ملا کہ ان کا انتخاب بی۔ بی۔ سی کی ہندی سروس میں اناؤنسر کی حیثیت سے ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ گاندھی جی سے آشیرواد لے کر انگلینڈ چلے گئے، جہاں بی۔ بی۔ سی۔ کی ریڈیو سروس میں ہندی کے اناؤنسر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ اس طرح بلراج ساہنی پورے چار برس تک ملک سے باہر رہ کر ملک کی اہم خدمت انجام دیتے رہے اور یہ چار برس بلراج ساہنی کی زندگی میں بڑے عجیب گزرے اور ان کی زندگی کے لیے اہم بھی تھے۔

یہاں رہتے ہوئے ہندوستان میں چل رہی آزادی کی لڑائی میں شامل نہ ہونا اب ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ اس جنگِ آزادی میں اپنے ہم وطنوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے کے لیے وطن واپس چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے 'لوک ناٹیہ منچ' کی ذمے داریاں قبول کرلیں۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا عام لوگوں سے وابستہ ہونے اور عام زندگی سے قریب رہنے کا۔ ناٹک یا ڈرامے کے ذریعے ایک عام آدمی سے اداکار یا فنکار کا کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے، یہ بات بلراج ساہنی کو بہت اچھی طرح معلوم تھی، اور وہ یہی کر بھی رہے تھے۔ ڈراموں سے اُن کو اتنا لگاؤ تھا کہ رات دن سوتے جاگتے بس ڈراموں کی ہی باتیں ان کی گفتگو کا موضوع ہوا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ تحریک آزادی میں بھی برابر حصہ لیتے رہے اور ہر طرح سے کانگریس کے ایک اہم اور سرگرم رکن رہے۔ اسی دوران بلراج ساہنی کا ذہن فلموں کی طرف متوجہ ہوا، اور انہوں نے فلموں سے وابستہ ہونے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ 1944 میں وہ اپٹا (انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) سے وابستہ ہوگئے، وہیں سے فلمساز و ہدایت کار مجمدار کی فلم 'انصاف' میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا۔

اس کے فوراً بعد ہی خواجہ احمد عباس کی فلم 'دھرتی کے لال' میں ایک بھرپور کردار ادا کرنے سے ان کی پہچان شروع ہوئی۔ یہ فلم بنگال کے قحط زدگان سے متعلق ایک انتہائی اثر دار فلم تھی۔

جب بلراج ساہنی پوری طرح فلموں سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر فلموں سے جوڑ لیا تب اس زمانے کے چند بڑے اچھے اور قابل فلمساز اور ہدایتکار فلمی دنیا میں موجود تھے۔ یہ بلراج ساہنی کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ہمیشہ قابل اور سلجھے ہوئے ہدایتکار اور فلمساز ملے۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی آسمان پر بلراج ساہنی کا نام اس روشن ستارے کی طرح جگمگایا جس سے لوگ دشاؤں کا گیان حاصل کرتے ہیں۔

بلراج ساہنی نے اپنی فلمی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1946 میں فلم 'دھرتی کے لال' سے کیا، مگر ان کو شہرت ملی 1953 میں ریلیز بمل رائے کی فلم 'دو بیگھہ زمین' سے۔ اس فلم نے عالمی شہرت حاصل کی اور کانس فلم فیسٹیول میں اعزاز سے نوازی گئی۔ 1947 میں کم عمری میں ہی اُن کی بیوی دمینتی ساہنی کا انتقال ہوگیا اور اس کے دو سال بعد ہی بلراج ساہنی نے اپنی ایک کزن سنتوش چندھوک سے شادی کر لی، جو ٹیلی ویژن میں ایک مصنفہ کے طور پر مشہور ہوئیں۔

گرم کوٹ، ہیرا موتی، دو بیگھہ زمین، ہم لوگ، کابلی والا، سیما، گرم ہوا، ہنستے زخم، وقت، حقیقت، سنگھرش اور 'نیل کمل' وغیرہ کچھ ایسی فلمیں ہیں جن میں بلراج ساہنی نے اپنی فنی صلاحیتوں سے ان سب کرداروں کو زندگی بخشی جو ان فلموں میں انھوں نے پیش کیے۔ یہ چند ایسی فلمیں ہیں جن کی وجہ سے بلراج ساہنی کو فلمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بلراج ساہنی ایک نیک دل، سلجھے ہوئے اور دانشور قسم کے سادگی پسند انسان تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ انسان کو انسان ہی سمجھتے تھے اور چھوٹے، بڑے یا امیر غریب کی تفریق کرنا اُن کے مزاج کے خلاف تھا۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ بلراج ساہنی نے اپنی کتاب 'یادیں' میں تحریر کیا ہے۔ بلراج ساہنی کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے چنڈی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ آؤٹ ڈور کا کام تھا اور فلم کا سارا یونٹ ایک رات کسی امیر دوست کے گھر پارٹی میں مصروف تھا۔ بڑے زوروں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ پنجابی مہمان نوازی، پنجابی حسن، پنجابی ہنسی مذاق اپنے شباب پر تھا۔ مارچ کے مہینے کا بے حد سہانا موسم تھا۔ دن بھر تمام یونٹ نے شوالک کی پہاڑیوں کے آنچل میں شوٹنگ کی تھی اور بڑے حسین شاٹ لیے تھے۔ اسکاچ کے گھونٹ بھرتے ہوئے دن بھر کی تھکاوٹ میں بھی بڑا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم بھی دوشیزاؤں سے دہک رہا تھا۔ ایسے ماحول میں بلراج ساہنی کے ایک دوست نے آکر کان میں کہا۔ ''بلّی! باہر ایک آدمی کھڑا ہے تم سے ملنے کے لیے۔ ذرا ایک منٹ باہر جا کر اُسے درشن دے آؤ۔''

''یہ نہیں ہوگا۔'' بلراج نے کہا۔ ''آج کے دن میں ساری ڈیوٹیاں ادا کر چکا ہوں۔ اب اپنے نجی وقت پر مجھے مکمل اختیار حاصل ہے اور اس کا پورا پورا مزہ لینا چاہتا ہوں۔ تم اس سے کہہ دو کہ کل صبح مجھے ہوٹل میں آکر ملے۔''

''میری درخواست ہے بلّی۔ وہ شام پانچ بجے کے پہلے سے ہی میری کوٹھی پر تھا اور اب اس کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔'' دوستوں میں سب ان کو بلّی کہتے تھے۔

دوست کی اس درخواست پر بلراج ساہنی بڑی بے دلی کے ساتھ باہر آئے۔ دودھیا چاندنی میں چمک رہے سیمنٹ کے فرش پر کھڑے کچھ لوگوں کی ٹولی کے پاس بگھی پر پلاسٹک کے پتلے کی طرح اوم پرکاش نام کا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بلراج کو دیکھ کر اس نے فوجی ڈھنگ سے سلام کیا، جس کا مطلب بلراج ساہنی سمجھ نہ پائے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اتنے لوگوں میں ان کو کس سے ملنا ہے۔ قریب جا کر وہ ان سب لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے، اور اوم پرکاش بگھی پر بیٹھے ہوئے ہی بولا۔ ''کیا ہم بھی میجر رن ویر سنگھ صاحب کے ساتھ ہاتھ ملا سکتے ہیں؟'' اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

بلراج ساہنی کو حیرت ہوئی اور اس کو بغیر ٹانگوں کے دیکھ کر ہمدردی بھی۔ ایک خیال ان کے دماغ میں یہ بھی آیا کہ یہ لوگ کہیں ان کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے۔

''کون میجر رن ویر سنگھ؟'' بلراج ساہنی نے حیرت

سے پوچھا۔
''حقیقت'' کے رنویر سنگھ، اور کون؟'' وہ پھر اسی طرح ہنسا۔

اب بلراج جی کو یاد آیا کہ فلم 'حقیقت' میں انھوں نے ایک فوجی میجر رن ویر سنگھ کا کردار ادا کیا تھا۔ حالانکہ بات کافی پُرانی ہو گئی تھی مگر اس وقت اوم پرکاش کے ان الفاظ سے بلراج جی کو خوشی ضرور ہوئی تھی۔

''میں نے تین بار دیکھی تھی صاحب وہ پکچر۔ چوتھی بار اپنی ماں کو ساتھ لے کر دیکھنا چاہتا تھا، مگر میرے پاس پیسے نہیں تھے۔'' اوم پرکاش نے پھر کہا۔

''اتنی زیادہ پسند آئی تمھیں۔'' بلراج جی نے رسمی طور پر پوچھا۔

''کیسے نہ آتی صاحب، ہم بھی تو لڑے ہیں چینیوں کے ساتھ۔ آپ میجر ٹھہرے، ہم ایک معمولی سپاہی سہی۔''

اس کی طنزیہ ہنسی اور لکڑی کی ٹانگوں کی اصلیت جان کر بلراج جی حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک فوجی جوان جس نے جنگ میں دونوں ٹانگیں کھوئی تھیں، اُن سے ملنے کے لیے چار گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا۔ ان کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔

''تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی کہ تم فوجی جوان ہو؟'' بلراج ساہنی نے پوچھا۔

''بتا کر ملنے میں نہیں، بلکہ مل کر بتانے میں مزہ ہے میجر صاحب۔'' اس نے کہا۔

''مجھے بار بار میجر کہہ کر شرمندہ نہ کرو، خدا کا واسطہ ہے۔'' بلراج ساہنی نے عاجزی سے کہا۔

''آپ اپنی قیمت ہمارے دل سے پوچھیے۔'' اوم پرکاش نے کہا۔ اس کی باتوں میں کتنی حقیقت تھی، کتنی ایکٹنگ تھی، بلراج ساہنی کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

ایکٹنگ میں بھی مجبوری کا جزو ہوتا ہے۔ عورت ہمارے سماج میں مجبور ہے، اس لیے اپنی خواہشوں کو تہوں میں لپیٹ کر رکھتی ہے۔ وہ اپنی ہار میں بھی جیت کا مزہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ بلراج بھی اگر اس وقت مجبور نہ ہوتے تو بغیر ہچکچاہٹ اس بہادر نوجوان کو پوری عزت کے ساتھ پارٹی میں اندر لے جاتے اور اس سے ہاتھ ملانا ہر کسی کے لیے فخر کی بات ہوتی۔ اس کی بدولت پارٹی کو چار چاند لگ جاتے۔ مگر وہ صرف ایسا سوچ سکتے تھے کیونکہ اپنی سوچ پر عمل نہ کرنے کے لیے وہ مجبور تھے۔ اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے انہوں نے جوان سے اتنا ہی کہا۔ ''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔''

''وہ تو ابھی بتائے دیتا ہوں۔ آپ منظور کریں گے؟ میرا گھر یہاں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ ذرا چل کر میری ماں سے مل لیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' اوم پرکاش نے بلا تکلف کہہ دیا۔

بلراج جی اسی وقت اپنی رنگین اور پُر شباب پارٹی چھوڑ کر دوستوں کے منع کرنے کے باوجود اس جوان کے ساتھ اس کی خوشی کے لیے اس کے گھر روانہ ہو گئے۔

بلراج جی کی زندگی میں اس قسم کے ہزاروں واقعات بھرے پڑے ہیں جن کو قلمبند کرنے کی نہ تو یہاں گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک نیک دل اور سادہ لوح انسان تھے، اور ایسے ہی کردار انہوں نے فلمی پردے پر اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اُجاگر کیے تھے۔

فلموں سے وابستہ ہو کر بھی بلراج ساہنی کی دیش بھگتی اور قوم پرستی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر عوام کے درمیان خدمت خلق کا کام جاری رکھا۔ ان کے ساتھیوں میں راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی اور رشی کیش مکرجی کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ بلراج ساہنی نے اُن دنوں ایسی ہی فلموں میں کام بھی کیا۔ 'گرم کوٹ، فٹ پاتھ، وقت' اور 'حقیقت' وغیرہ فلموں کی کہانی مکمل طور پر سچائی سے بھری زندگیوں کی ہی کہانیاں تھیں۔ اسی لیے ان فلموں کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ممالک میں بھی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان فلموں کو فلم بینوں کے ہر طبقے نے سراہا۔ سماجوادی ممالک میں شاید پہلی بار ان ہی فلموں نے ہندوستان کی نمائندگی کی اور ان فلموں سے ہندوستان کی عزت افزائی ہوئی۔ حالانکہ ان فلموں میں سے کچھ نے تجارتی نقطہ نگاہ سے کوئی خاص کامیابی نہ بھی حاصل کی ہو مگر بلراج ساہنی نے پھر بھی اپنی آخری سانسوں تک ہار نہیں مانی اور ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ ایسی فلموں میں کام کریں جن میں دولت کمانے کا مقصد نہ ہو کر انسانیت کی قیمت اور اہمیت کو ترجیح دی گئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ اور یاد آیا۔ اُن دنوں ترلوک جیٹھلی 'گودان' بنانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ انھوں نے ہیرو کے کردار کے لیے بلراج ساہنی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ اتفاق سے اُس وقت بلراج ساہنی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں سکریٹری نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ ہار کر جیٹھلی نے کسی دوسرے اداکار کو اس کردار کے لیے سائن کر لیا۔

بلراج جی جب واپس آئے تو انھیں اس بات کا علم ہوا۔ ان کو بہت افسوس ہوا۔ دراصل بلراج ساہنی کو پریم چند کے ناول 'گودان' کا یہ کردار 'ہوری' بہت پسند تھا۔ اس کردار کے ساتھ بلراج جی نے ہندوستان کے غریب عوام اور ان کی تڑپ کو دل سے محسوس کیا تھا۔

بلراج ساہنی اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ ہمیشہ غریبوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بلراج جی کے فلمی کرداروں میں بھی ورائیٹی ملتی ہے۔ 'دو بیگھہ زمین' میں رکشہ چلانے والے کا کردار، 'تلاش' میں ایک کروڑ پتی تجارتی آدمی کا کردار اور 'سنگھرش' میں کنپٹی پرساد کا کردار، جس کی آنکھوں میں ہر وقت نفرت اور بدلے کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، 'کابلی والا' کا بھولا بھالا پٹھان جس کی نگاہیں محبت اور خلوص و ہمدردی سے ہمیشہ بوجھل رہتی ہیں۔ 'گرم ہوا' میں جوتے بنانے والے ایک مسلم کاریگر کا کردار کون بھلا سکتا ہے۔ 'حقیقت' میں میجر کا کردار اور اسی طرح کے بہت سے مختلف کردار جن کو بلراج ساہنی نے زندگی بخشی۔ وہ اپنے آپ کو کردار میں اتنا جذب کر لیا کرتے تھے، کہ بلراج ساہنی کا پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ملتا تھا اور صرف کردار ہی رہ جاتا تھا۔

بلراج ساہنی کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک بہترین اور سلجھے ہوئے ترقی پسند مصنف بھی تھے۔ انہوں نے ہندی، انگریزی اور پنجابی ادب کو بہت یادگار تخلیقات بخشی ہیں۔ ''میری غیر جذباتی ڈائری، یوروپ کے واسی، میرا پاکستانی سفرنامہ'' اور 'یادیں' کافی مقبول کتابیں ہیں۔ فلم اور اسٹیج کے موضوع پر بھی انھوں نے 'سنیما اور اسٹیج' اور 'میری فلمی آتم کتھا' تصنیف کیں۔

1949 میں بلراج ساہنی کو ان کی کتاب 'میرا روسی سفرنامہ' کے لیے سوویت نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1969 میں بلراج ساہنی کو حکومت ہند کی طرف سے پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ بلراج ساہنی نے دیو آنند کے لیے فلم 'بازی' کی کہانی بھی لکھی تھی جس کو گرو دت کی ہدایت میں بنایا گیا۔

13 اپریل 1973 کو صرف ساٹھ برس کی عمر میں بلراج ساہنی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ہی ان کی بیٹی شبنم کا انتقال کم عمری میں ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ بہت دل برداشتہ اور رنجیدہ تھے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ بلراج ساہنی اداکاری کی دنیا میں ایک ایسا خلاء چھوڑ گئے ہیں جس کو پُر کرنا برسوں تک ہندوستانی فنکاروں کے بس کی بات نہیں۔

■

Anees Ahmad
(Anees Amrohvi)
R-232/10, 3rd Floor
Ramesh Park, Laxmi Nagar
Delhi - 110092
Mob.:9811612373

ونڈوز7 میں فائل کا نظم
(Files Organization in Windows 7)

آپ جانتے ہیں کہ کسی بھی کمپیوٹر میں بنائی جانے والی فائلوں کو کسی معاون وسیلۂ ذخیرہ (Auxiliary Storage Media) پر اسٹور کیا جاتا ہے، جیسے ہارڈ ڈسک، پین ڈرائیو وغیرہ۔ فائلوں کی بڑی تعداد کے سبب انھیں مختلف گروہوں یا ڈائرکٹریوں میں بانٹ کر رکھا جاتا ہے تاکہ کوئی خاص فائل ڈھونڈنا اور اس کا استعمال کرنا آسان ہو۔ ہر کمپیوٹر میں (یعنی آپریٹنگ سسٹم میں) ایسا یا اس سے ملتا جلتا انتظام ہوتا ہے۔ ونڈوز میں بھی فائلوں کو منظم یا مرتب کرنے کے اسی طریقے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس باب میں آپ ونڈوز کے فائل سسٹم کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔

فائل اور فولڈر and Folders)

کمپیوٹر میں ہم اگر کسی پروگرام یا ڈاٹا کو دیکھنا چاہتے ہیں یا اس کے اندر جا کر کوئی کام کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں اس جگہ پر پہنچنا ہوگا، جہاں پر یہ پروگرام یا ڈاٹا رکھے

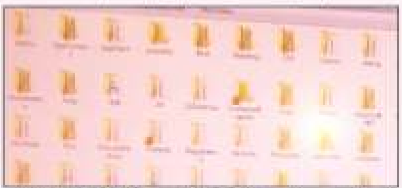

تصویر W-5.1: کچھ عام یا مخصوص فولڈروں کے علامتی نشان یا آئیکان

ہوئے ہیں۔ ان پروگراموں یا ڈاٹا کو کمپیوٹر کے اندر کسی نہ کسی فائل یا فولڈر میں ہی رکھا جاتا ہے اور یہ فائل یا فولڈر جس ہارڈ ویئر پر اسٹور کیے جاتے ہیں، انھیں ہم ہارڈ ڈسک (Hard Disk) کہتے ہیں۔ ایک کمپیوٹر کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ ہارڈ ڈسک ہو سکتی ہیں۔ اسے ہم اپنے گھر میں بنے اس کمرہ کے طور پر سمجھ سکتے ہیں، جس کے اندر ایک الماری رکھی ہو اور پھر اس الماری کے اندر بہت سے خانے بنے ہیں، جن میں ہم اپنے استعمال کی الگ الگ چیزیں الگ الگ خانوں میں رکھتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے، تو گھر کا وہ کمرہ ہارڈ ڈسک ہے، کمرے کے اندر رکھی ہوئی الگ الگ الماریاں 'فولڈر' ہیں اور پھر ان الماریوں کے اندر بنے ہوئے خانے 'فائل' ہیں۔ کمپیوٹر کے اندر بھی فولڈر مختلف قسم کی فائلوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہر فائل میں الگ الگ دستاویز ہوتی ہیں۔ ونڈوز میں فائلوں اور فولڈروں کو

تصویر W-5.2: مختلف قسم کی فائلوں کے آئیکان

آئیکان (Icons) نشانات کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔

عموماً سبھی فولڈروں کا آئیکان ایک جیسا ہوتا ہے جیسا کہ تصویر W-5.1 میں دکھایا گیا ہے۔ ان کی الگ الگ پہچان ان کے نام کے ذریعے ہوتی ہے۔ فولڈروں کے نام ان کے آئیکان کے ٹھیک نیچے دیے ہوتے ہیں۔ ونڈوز کے کچھ خاص فولڈروں کے آئیکان پر کوئی نشان بھی چھپا ہوتا ہے، جس سے ان فولڈروں کے اندر موجود اشیاء (فائل) یا مقصد کا پتہ چل سکتا ہے۔

فولڈروں کی طرح فائلوں کو بھی ونڈوز میں آئیکان کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔ الگ الگ طرح کی فائلوں کے آئیکان بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ فولڈروں کی ہی طرح فائلوں کے نام بھی ان کے آئیکان کے نیچے دیے جاتے ہیں تصویر W-5.2 میں مختلف قسم کی فائلوں کے آئیکان دکھائے گئے ہیں۔ فائلوں کا آئیکان اس بات پر منحصر ہے کہ وہ فائل کس پروگرام کے ذریعے تیار کی گئی ہے۔ اگر کسی فائل ٹائپ کا کوئی خاص آئیکان نہیں ہوتا، تو

دیگر کام کرنے کے لیے ہمیں عام طور پر فولڈروں کو کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فولڈر ڈیسک ٹاپ میں بنا ہے، تو اس کا ایک آئیکان نشان ڈیسک ٹاپ پر نظر آئے گا۔ آپ اس آئیکان کو ڈبل کلک کر کے فولڈر کو کھول سکتے ہیں لیکن اگر فولڈر ڈیسک ٹاپ میں نہیں ہے، کسی اور فولڈر میں ہے، تو اس کا آئیکان ڈیسک ٹاپ پر نظر نہیں آئے گا۔ وہ آپ کو ڈھونڈ کر کھولنا ہوگا۔ ایسے فولڈروں کو کھولنے کا طریقہ درج ذیل ہے:

1۔ ڈیسک ٹاپ پر 'Computer' کے آئیکان کو ڈبل کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر W-5.3 کی طرح Computer کی ونڈوز کھل جائے گی، جس میں آپ کے کمپیوٹر کے ہر ایک ڈسک ڈرائیو (فلوپی اور ہارڈ ڈسک) کا ایک ایک آئیکان دیا جاتا ہے۔

2۔ اس Computer ونڈوز میں اس ڈرائیو (جو عام طور پر :C ہوتا ہے) کو ڈبل کلک کیجیے، جس میں آپ کا فولڈر ہے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر

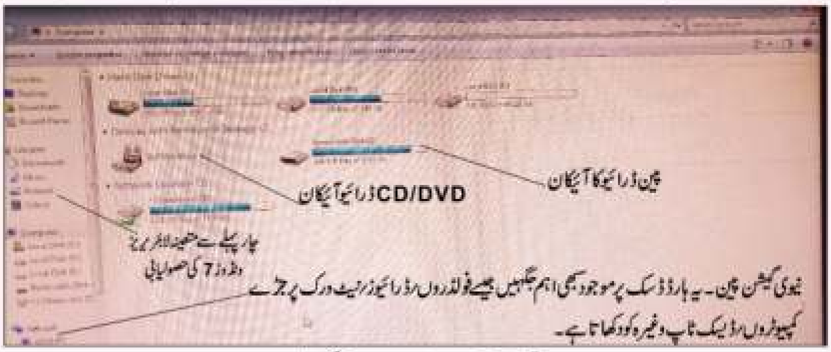

تصویر w-5.3: Computer کی ونڈو

ونڈوز کے نشان والا آئیکان استعمال کیا جاتا ہے۔

ونڈوز پر چلنے والے کمپیوٹروں میں 'Windows' نام کا ایک فولڈر پہلے سے ہی ہارڈ ڈسک میں بنا ہوتا ہے لیکن آپ ڈیسک ٹاپ یا کسی دوسرے فولڈر میں اپنی ضرورت کے مطابق نئے فولڈر بنا سکتے ہیں۔ نئے فولڈر بنانے کے طریقے آگے بتائے گئے ہیں۔

کسی فولڈر کو کھولنا (Openinga Folder)

ونڈوز میں فائلوں کو ادھر ادھر کرنے، نقل کرنے یا

W-5.4 کی طرح اس ڈرائیو کی ونڈو کھل جائے گی اور اس ڈرائیو کے اندر بنے ہوئے سبھی فولڈروں اور فائلوں کا ایک ایک آئیکان دکھائی دے گا۔

3۔ اس ونڈو میں اگر آپ کا فولڈر، یعنی اس کا آئیکان دکھائی دے رہا ہے، تو آپ اسے ڈبل کلک کرکے کھول سکتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اس ونڈو کو اسکرول کرکے بھی اپنے فولڈر کو تلاش کر سکتے ہیں۔ اگر وہ فولڈر نہ ملے، تو آپ کو یہ اندازہ لگا لینا چاہیے کہ وہ فولڈر کسی دوسری ڈرائیو (:D یا :E وغیرہ) میں محفوظ کیا ہوگا۔

اس طرح فولڈروں کو کھولتے ہوئے آپ مطلوبہ

تصویرw-5.4: ڈرائیو :C کی ونڈو

فولڈر تک پہنچ سکتے ہیں۔

ڈیسک ٹاپ میں نیا فولڈر بنانا (Creating New Folder on Desktop)

آپ جانتے ہیں کہ ڈیسک ٹاپ ونڈوز کا ابتدائی نقطہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں ایک پوری طرح آزاد فولڈر بنانا چاہتے ہیں، تو ویسا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ درج ذیل کام کریں:

1۔ اپنے ڈیسک ٹاپ کی کسی خالی جگہ پر ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ اس سے اسکرین پر ایک کانٹیکسٹ مینو (Context Menu) نظر آئے گا۔

2۔ اس مینو میں "New" کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی 'New' آپشن کا ابھرتا مینو (Cascading Menu) تصویر W-5.5 کی طرح نظر آئے گا۔

3۔ اس ابھرتا مینو میں 'Folder' آپشن کو کلک کیجیے۔

آپ دیکھیں گے کہ ڈیسک ٹاپ میں ایک نیا آئیکان نشان نظر آرہا ہے، جس کے نیچے 'New Folder' نام لکھا ہوا ہے اور الٹے رنگ میں ہے۔ آپ اس نام کی جگہ کوئی دوسرا نام ٹائپ کرکے انٹر دبائیے۔ اس سے آپ کے ذریعے ٹائپ کیے گئے نام کا فولڈر بن جائے گا۔ مشق کے لیے اپنے فولڈر کا نام 'MyFolder' رکھیے۔

ڈیسک ٹاپ میں نئی فائل (Creatng New File on Desktop)

نئی فائل بنانے سے پہلے یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ آپ کس قسم کا کام اس پر کرنا چاہتے ہیں۔ الگ الگ کام کرنے کے لیے مختلف کمپنیوں نے اپنے اپنے سوفٹ ویئر یا پروگرام بنا رکھے ہیں، جو سوفٹ ویئر آپ کے کمپیوٹر میں انسٹال ہے، آپ اسی سوفٹ ویئر سے متعلق فائل بنا سکتے ہیں۔

تصویر W-5.5 میں آپ کوئی فائل بنانے کے بھی کچھ آپشن نظر آئیں گے۔ اپنے کام کے حساب سے،

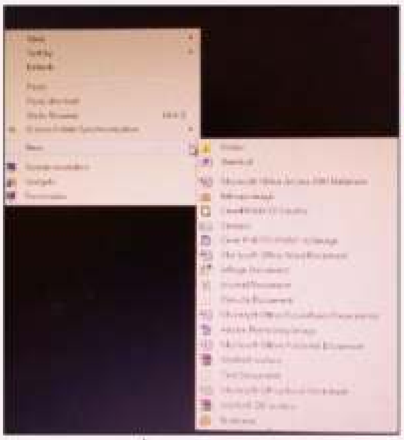

تصویرw-5.5: ڈیسک ٹاپ کا کانٹیکسٹ مینو اور New آپشن سے وابستہ ابھرتا مینو

آپ ورڈ فائل، ایکسل فائل، پاور پوائنٹ فائل وغیرہ آپشن میں سے کسی کو بھی چن سکتے ہیں اور اس کی فائل بنا سکتے ہیں۔ یہ سبھی فائلیں مائکروسوفٹ آفس سوفٹ ویئر انسٹال کرنے پر دستیاب ہوتی ہیں۔

کسی فولڈر میں نئے فولڈر بنانا (Creating New Folder within a Folder)

مان لیجیے آپ پہلے سے بنے ہوئے کسی فولڈر میں ایک نیا فولڈر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1۔ جس فولڈر میں آپ نیا فولڈر بنانا چاہتے ہیں، اوپر بتائے جا چکے طریقے سے اُس فولڈر کو کھولیے۔ اس سے اُس فولڈر کی ونڈو اسکرین پر کھل جائے گی۔ (تصویر W-5.6)

2۔ اس ونڈو کی کسی خالی جگہ پر ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ اس سے اسکرین پر ایک کانٹیکسٹ مینو نظر آئے گا۔

3۔ اس مینو میں 'New' آپشن پوائنٹر لائیے۔ اس سے 'New' کا ابھرتا مینو نظر آنے لگے گا۔ (تصویر W-5.5 کی طرح)

4۔ اس ابھرتا مینو میں 'Folder' آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی موجودہ فولڈر کے ونڈو میں ایک نیا آئیکان بن جائے گا، جس کے نیچے 'New Folder' نام نظر آئے گا۔ اس وقت آپ کی اسکرین تصویر W-5.6 کی طرح دکھائی دے گی۔

5۔ آپ نئے فولڈر کا جو نام رکھنا چاہتے ہیں، وہ ٹائپ کیجیے اور پھر انٹر (Enter) کنجی دبائیے۔

اس طرح آپ کسی بھی فولڈر میں کوئی بھی اور کتنے بھی فولڈر بنا سکتے ہیں۔ مشق کے لیے آپ اوپر ڈیسک ٹاپ میں بنائے گئے فولڈر 'My Folder' میں ایک نیا فولڈر بنائیے، جس کا نام 'This is my folder' رکھ دیجیے۔

دوسرا طریقہ: تصویر W-5.6 اور تصویر W-5.7 میں آپ دیکھیں گے کہ مینو بار میں 'نیو فولڈر' (New Folder) نام کا ایک مینو ہے۔ اس آپشن پر کلک کرنے سے بھی آپ نیا فولڈر بنا سکتے ہیں۔

نیا فولڈر بنانے کا آپشن

کسی فائل یا فولڈر کو دوسرے فولڈر میں لے جانا (Moving a File or Folder to another Folder)

آپ کسی بھی فائل یا فولڈر کو (اس کی سبھی فائلوں

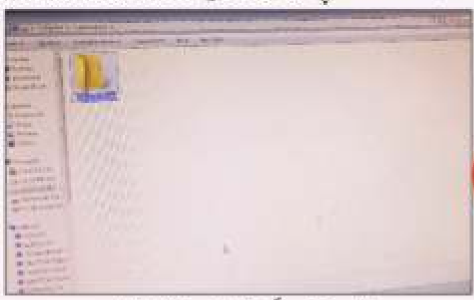

تصویرw-5.6: کسی فولڈر میں بنایا گیا نیا فولڈر

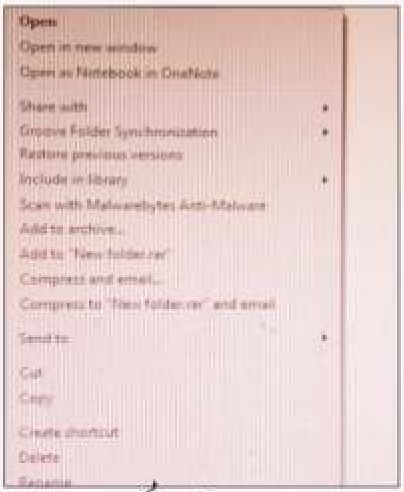

تصویر W-5.8: فائل کا کانٹیکس مینو

سمیت) کسی بھی دوسرے فولڈر میں لے جاسکتے ہیں۔
اس کے لیے ہم مینو بار کے 'Organize' آپشن کے پل ڈاؤن مینو کے Cut اور Paste آپشن کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مان لیجیے کہ کسی فولڈر 'ABC Folder' میں آپ کی ایک ورڈ پیڈ فائل 'My File 1' ہے اور آپ اسے یہاں سے ہٹا کر ایک دوسرے فولڈر 'XYZ' میں لے جانا چاہتے ہیں، تو درج ذیل کام کیجیے:

1۔ فولڈر 'ABC Folder' کے ونڈو میں فائل 'My File 1' کو سنگل کلک کیجیے۔ اس سے اس فائل کے آئیکان کا رنگ بدل جائے گا۔ رنگ بدلنا اس بات کی پہچان ہے کہ یہ منتخب کردہ شے ہے اور آگے کے کام اسی فائل پر ہوں گے۔

2۔ مینو بار میں 'Organize' کو کلک کیجیے۔

3۔ 'Organize' کے پل ڈاؤن مینو میں 'Cut' ہدایت دیجیے۔ ایسا کرنے سے نشان زد فائل اس فولڈر سے ہٹا کر مستقل طور پر ایک دوسرے مقام پر رکھ دی جائے گی۔ اس مقام کو کلپ بورڈ (Clipboard) کہا جاتا ہے،

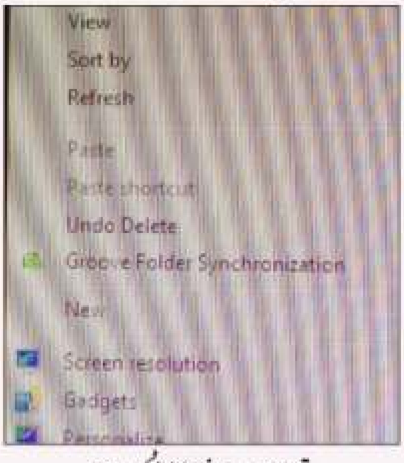

تصویر W-5.9: فولڈر کا کانٹیکسٹ مینو

جہاں سبھی 'Cut' یا 'Copy' کیے ہوئے 'Objects' کو رکھا جاتا ہے۔

4۔ اب اس فولڈر 'XYZ' کو کھولیے، جہاں آپ اس فائل کو لے جانا چاہتے ہیں۔

5۔ اس فولڈر کی ونڈو کے 'Organize' مینو میں 'Paste' ہدایت دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ فائل 'My File 1' کا آئیکان اس فولڈر میں نظر آنے لگا ہے۔

آپ 'ABC Folder' کی ونڈو میں جا کر اس کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ 'My File 1' وہاں سے ہٹ گئی ہے۔

اوپر بتائے گئے طریقے سے آپ کسی فولڈر کو بھی اس کے پہلے فولڈر سے کسی بھی دوسرے فولڈر میں لے جاسکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: اوپر بتایا گیا کام ماؤس کے دائیں بٹن کا استعمال کر کے اور بھی زیادہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ دوسرا طریقہ درج ذیل ہے:

1۔ فولڈر 'ABC Folder' کی ونڈو میں فائل 'My File 1' کے آئیکان کو ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ اس سے اسکرین پر تصویر W.5.8 کی طرح فائل کانٹیکسٹ مینو (Context Menu) نظر آئے گا۔

2۔ اس مینو میں 'Cut' ہدایت کو کلک کیجیے۔

3۔ اب اس فولڈر 'XYZ' کو کھولیے، جہاں آپ فائل کو لے جانا چاہتے ہیں۔

4۔ 'XYZ' فولڈر کی ونڈو میں کسی خالی جگہ پر ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ اس تصویر W-5.9 کی طرح ایک اور کانٹیکسٹ مینو کھل جائے گا۔

5۔ اس کانٹیکسٹ مینو میں 'Paste' آپشن کو منتخب کیجیے۔ ایسا کرتے ہی 'Cut' کے ذریعے کاٹی گئی فائل اس فولڈر میں نظر آنے لگے گی۔

کسی فائل یا فولڈر کو کسی دوسرے فولڈر میں نقل کرنا (Copying a File or Folder to another Folder)

اس کام کا طریقہ بھی ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے کسی فائل یا فولڈر کو کسی ایک فولڈر سے ہٹا کر کسی دوسرے فولڈر میں لے جانے کا طریقہ ہے۔ یہ کام اوپر بتائے گئے دونوں طریقوں سے کیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے

تصویر W-5.11: فائل یا فولڈر کو پین ڈرائیو میں اتارنے کی پیش رفت کا ڈائیلاگ باکس

کہ اوپر جہاں جہاں 'Cut' آپشن یا ہدایت کو چننے (یا کلک کرنے) کی ہدایت ہے، وہاں وہاں آپ 'Cut' کی بجائے 'Copy' ہدایت کو منتخب کیجیے یا کلک کیجیے۔ مشق کے لیے آپ اوپر بتائے کسی طریقے سے فائل 'My File 1' کو پہلے فولڈر 'ABC Folder' سے 'XYZ' میں لے جایئے، پھر اسی فائل کو فولڈر 'XYZ' سے فولڈر 'A 3C' میں نقل (Copy) کرلیجیے۔

فائلوں کے ساتھ کیے گئے یہ دونوں کام ٹھیک اسی طریقے سے کسی فولڈر کے ساتھ بھی کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جب آپ کسی فولڈر کو 'کٹ' یا 'کاپی' کرنے کے لیے چنتے ہیں تب اس فولڈر کے اندر موجود سبھی فائل اور ذیلی فولڈر بھی بنیادی فولڈر کے ساتھ اپنے آپ منتخب کرلیے جاتے ہیں اور خود ہی 'کٹ' یا 'کاپی' ہوتے ہیں۔

جب کسی فائل یا فولڈر کو 'کٹ' کیا جاتا ہے، تو وہ اپنے بنیادی مقام سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، جب کسی فائل یا فوڈر کو کاپی کیا جاتا ہے، تو دوسری جگہ پر صرف اس کی نقل بنتی ہے اور وہ اپنی بنیادی جگہ پر پہلے کی طرح محفوظ رہتے ہیں۔

کسی فائل یا فولڈر کو پین ڈرائیو پر نقل کرنا (Copying a File or Folder to a Pen Drive)

اگر آپ کسی فائل یا فولڈر کو کسی پین ڈرائیو پر نقل کرنا چاہتے ہیں، تو اس فائل یا فولڈر کے آئیکان کو ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے اور اس کے جواب میں جو کانٹیکسٹ مینو حاصل ہو، اس میں 'Send to' آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر W-5.10 کی طرح ایک جھرنا مینو حاصل ہوگا۔

اس مینو میں سبھی ڈرائیوز (جو کمپیوٹر کے اندر یا کمپیوٹر کے باہر سے جڑی ہیں، جیسے کہ پین ڈرائیو وغیرہ) کا ایک آپشن دیا ہوتا ہے۔ آپ جس پر اپنی فائل یا فولڈر نقل کرنا چاہتے ہیں، جھرنا مینو کے ذریعے اس ڈرائیو کے آپشن کو چن لیجیے۔ ایسا کرتے ہی چنی ہوئی فائل کی پین ڈرائیو

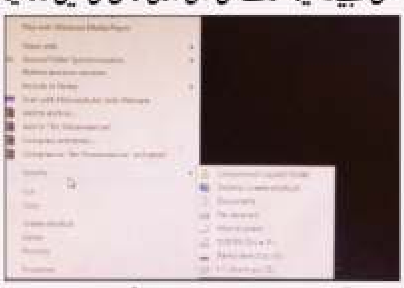

تصویر W-5.10 'send to' آپشن کا جھرنا مینو

میں نقل ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی اسکرین پر تصویر W-5.11 کی طرح ایک چھوٹا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا، جس میں اس کام میں ہونے والی پیش رفت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا رہتا ہے کہ اس کام میں کتنا وقت اور لگے گا۔

یہ ڈائیلاگ باکس اس لیے دیا جاتا ہے کہ پین ڈرائیو پر ڈاٹا لکھنے کی رفتار دھیمی ہوتی ہے۔ اگر فائل چھوٹی ہے، تو یہ کام جلدی ہوجاتا ہے۔ لیکن، اگر فائل بڑی ہے، تو اسے ڈرائیو پر اتارنے میں زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ تب تک آپ کو صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

دوسرا طریقہ: اوپر بتایا گیا کام درج ذیل طریقے سے بھی آسانی سے کیا جاسکتا ہے:

1۔ جس فائل یا فولڈر کو آپ پین ڈرائیو پر اتارنا چاہتے ہیں، اس کو رکھنے والے فولڈر یا ڈرائیو کی ونڈو کو کھول لیجیے اور اس کے آئیکان کو کلک کرکے چن لیجیے۔

2۔ ونڈو کے 'Organize' مینو میں 'Copy' ہدایت دیجیے۔

3۔ پین ڈرائیو کو یو ایس بی پورٹ میں لگا کر اس کی ونڈو کو کھولیے۔

4۔ پین ڈرائیو کی ونڈو میں 'Organize' مینو میں 'Paste' ہدایت دیجیے۔

اس سے چنی ہوئی فائل یا فولڈر ڈرائیو پر لکھنا شروع ہوجائے گا اور آپ کو تصویر W-5.11 کی طرح ہی اس کام کی پیش رفت کو دکھانے والا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔ یہ کام پورا ہوتے ہی پیش رفت کا ڈائیلاگ باکس غائب ہوجائے گا اور اس فائل یا فولڈر کا آئیکان پین ڈرائیو کی ونڈو میں نظر آئے گا، یعنی آپ کی فائل یا فولڈر (سبھی ذیلی فولڈروں اور فائلوں سمیت) اس پین ڈرائیو پر آجائے گا۔ اس کی تصدیق آپ اس پین ڈرائیو کی ونڈو کو کھول کر کرسکتے ہیں اگر کسی فائل کا سائز پین ڈرائیو کے مکمل سائز یا اس میں دستیاب سائز سے بڑا ہے، تو اسے سیدھے پین ڈرائیو پر اتارنا ممکن نہیں ہے ایسی حالت میں اس فائل پر فولڈر کو کسی کمپریس (Compress) یا زِپ (Zip) کرنے والے پروگرام، جیسے Winzip یا Winrar کا استعمال کرکے چھوٹا کرلینا چاہیے۔

کسی فائل یا فولڈر کو پین ڈرائیو سے ہارڈ ڈسک پر اتارنا (Copying a File or Folder from a Pen Drive to the Hard Disk)

اگر آپ کسی پین ڈرائیو پر اسٹور کی ہوئی فائل یا فولڈر کو ہارڈ ڈسک پر ڈیسک ٹاپ یا کسی دوسرے فولڈر میں کاپی کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا آسان طریقہ درج ذیل ہے:

1۔ پین ڈرائیو کو یو ایس بی پورٹ میں لگائیے۔

2۔ ڈیسک ٹاپ پر 'Computer' آئیکان کو ڈبل کلک کیجیے، جس سے 'Computer' ونڈو کھلتی ہے، جس میں آپ کے کمپیوٹر کے ہر ایک ڈرائیو کا ایک آئیکان ہوتا ہے۔

3۔ اس ونڈو میں پین ڈرائیو کے آئیکان کو ڈبل کلک کیجیے۔ اس سے اسکرین پر تصویر W-5.12 کی طرح پین ڈرائیو کی ونڈو کھل جائے گی۔ اس ونڈو میں پین ڈرائیو پر اسٹور کی گئی سبھی فائلوں اور فولڈروں کا ایک ایک آئیکان ہوتا ہے۔

4۔ اس ونڈو میں دکھائی گئی فائلوں یا فولڈروں میں سے جس کو آپ ہارڈ ڈسک پر اتارنا چاہتے ہیں، اس کے آئیکان کو کلک کرکے چن لیجیے۔

5۔ اسی ونڈو میں 'organize' مینو میں 'Copy' ہدایت دیجیے۔

6۔ جس فولڈر میں آپ اس فائل یا فولڈر کو نقل کرنا چاہتے ہیں، اس کو پہلے بتائے گئے طریقے سے کھول لیجیے۔

7۔ فولڈر کی ونڈو میں 'Organize' مینو میں 'Paste' ہدایت دیجیے۔

ایسا کرتے ہی پین ڈرائیو سے فائلوں کا ہارڈ ڈسک پر اترنا شروع ہوجائے گا اور آپ کی اسکرین پر تصویر W-5.11 کی طرح اس کی پیش رفت کا ڈائیلاگ باکس دکھائی دے گا۔

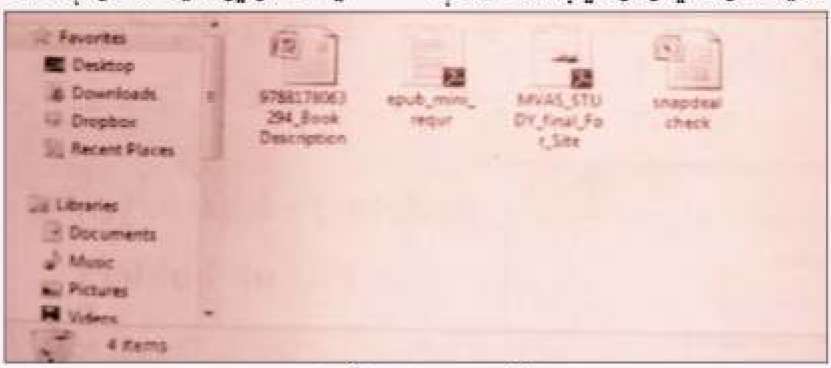

تصویر w-5.12: پین ڈرائیو کی ونڈو

اوپر بتائے گئے سبھی کاموں میں اگر آپ کسی فائل یا فولڈر کو نئے فولڈر میں لے جانا یا نقل کرنا چاہتے ہیں، تو 'Paste' ہدایت دینے سے پہلے اوپر بتائے گئے طریقے سے نیا فولڈر بنالیجیے، پھر اس نئے فولڈر کو کھول کر 'Paste' ہدایت دیجیے۔ آپ پین ڈرائیو میں بھی نیا فولڈر بناسکتے ہیں۔

کسی فائل یا فولڈر کا نام بدلنے کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1۔ اس فائل یا فولڈر کے آئیکان کو ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔

2۔ جو کانٹیکسٹ مینو حاصل ہو (تصویر W-5.8 کی طرح) اس میں Rename آپشن کو کلک کیجیے۔ اس سے اس کا نام الٹے رنگ میں آجائے گا، یعنی منتخب کیا ہوا دکھائی دے گا۔

3۔ اس جگہ پر فائل یا فولڈر کا نیا نام ٹائپ کیجیے اور انٹر (Enter) کنجی دبائیے۔

ایسا کرنے سے فائل یا فولڈر کا نام بدل جائے گا اور نیا نام نظر آنے لگے گا۔

کسی فائل یا فولڈر کو ہٹانا (Deleting a File or Foldr)

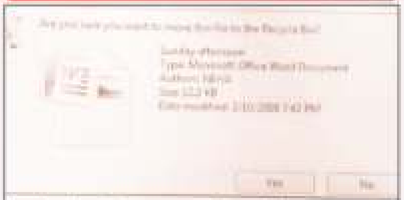

تصویر w-5.13: فائل یا فولڈر کو ہٹانے کا تصدیقی ڈائیلاگ باکس

اگر کوئی فائل یا فولڈر آپ کے لیے آئندہ کسی استعمال کا نہیں رہ گیا ہے، تو آپ اسے ڈیسک سے ہٹا سکتے ہیں۔ یہ کام درج ذیل طریقے سے کیا جاسکتا ہے:

1۔ جس فولڈر میں ہٹائی جانے والی فائل یا سب فولڈر ہے، اس فولڈر کو کھولیے۔

2۔ اس میں ہٹائی جانے والی فائل یا فولڈر کو کلک کرکے منتخب کیجیے۔

3۔ 'Organize' مینو میں 'Delete' ہدایت دیجیے۔

4۔ اس سے آپ کو ایک تصدیق (Confirmation) ڈائیلاگ باکس تصویر W-5.13 کی طرح دیا جائے گا۔

5۔ اس ڈائیلاگ باکس میں 'Yes' بٹن کو کلک کیجیے۔

اس سے آپ کا آبجیکٹ اپنے فولڈر سے ہٹا کر

'Recycle Bin' نامی فولڈر میں رکھ دیا جائے گا۔ ری سائیکل بن سے آپ ضرورت ہونے پر اسے پھر سے حاصل کرسکتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے ہٹا سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: کسی فائل یا فولڈر کو ہٹانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کہیں بھی رکھی ہوئی اس فائل یا فولڈر کے آئیکان کے ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر W-5.8 کی طرح جو کانٹیکسٹ مینو حاصل ہوگا، اس میں 'Delete' آپشن کو کلک کردیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر W-5.13 کی طرح ہی ہٹانے کی تصدیق کرنے کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا، جس میں 'Yes' بٹن کو کلک کرکے آپ فائل یا فولڈر کو ڈیسک سے ہٹا سکتے ہیں، یعنی ری سائیکل بن میں بھیج سکتے ہیں۔

اس طریقے میں اگر آپ 'Delete' ہدایت کو کلک کرتے وقت Shift کنجی کو بھی ساتھ دبا لیتے ہیں، تو اس فائل یا فولڈر کو ری سائیکل بن میں نہیں بھیجا جائے گا، بلکہ ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا جائے گا۔

ری سائیکل بن (Recycle Bin)

تصویر W-5.14: ری سائیکل بن کی ونڈو

اس کے بارے میں آپ پچھلے ابواب میں مختصراً پڑھ چکے ہیں۔ یہ ایک ایسا فولڈر ہے، جس میں ہارڈ ڈسک سے ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے ذریعے ہٹائی گئی فائلوں اور فولڈروں کو رکھا جاتا ہے۔ اس فولڈر کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت (یا جگہ) پہلے سے محدود ہوتی ہے۔ اس حد تک اس میں کتنی بھی فائلوں اور فولڈروں کو رکھا جاسکتا ہے۔ یہ حد ختم ہوجانے پر نئی چیزوں کو رکھنے کے لیے سب سے پرانی چیزوں کو پوری طرح مٹا دیا جاتا ہے۔

جب تک کوئی فائل یا فولڈر ری سائیکل بن میں ہے، آپ اسے اس کی اصلی حالت میں دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ مان لیجیے آپ کسی ہٹائی گئی فائل کو دوبارہ حاصل یا ری اسٹور (Restore) کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1۔ ڈیسک ٹاپ میں ری سائیکل بن کے آئیکان کو ڈبل کلک کیجیے۔ اس سے تصویر W-5.14 کی طرح ری سائیکل بن کی تمام چیزیں (ہٹائی گئی چیزیں) اس کی ونڈو میں دکھائی دیں گی۔

2۔ ری سائیکل ونڈو کی ری اسٹور کی جانے والی چیز (فائل یا فولڈر) کو ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کو ری سائیکل بن کے آبجیکٹ کا کانٹیکسٹ مینو تصویر W-5.15 کی طرح دکھائی دے گا۔

3۔ اس مینو میں 'Restore' ہدایت یا کمانڈ کو کلک کیجیے۔

ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ منتخبہ شے ری سائیکل بن کی ونڈو سے غائب ہوگئی ہے۔ درحقیقت، وہ اپنی بنیادی جگہ (فولڈر) میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی تصدیق آپ اس فولڈر کو کھول کر کرسکتے ہیں۔

ری سائیکل بن کو خالی کرنا (Emptying Recycle Bin)

ری سائیکل بن کو پوری طرح خالی کرنا بھی ممکن ہے۔ پوری طرح خالی کرنے کا مطلب ہے، اس میں رکھی گئی سبھی چیزوں کو مٹا دینا۔ اس کے بعد انھیں دوبارہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ری سائیکل بن کو خالی کرنے کا طریقہ درج ذیل ہے:

1۔ ڈیسک ٹاپ میں ری سائیکل بن کے آئیکان (Icon) کو ماؤس کے دائیں بٹن سے کلک کیجیے اس سے آپ کو اس بن کا کانٹیکسٹ مینو (Context Menu) تصویر W-5.16 کی طرح حاصل ہوگا

2۔ اس مینو میں 'Empty Recycle Bin' آپشن کو کلک کیجیے۔

یہ ہدایت دیتے ہی اس کام کی تصدیق کے لیے تصویر W-5.13 جیسا ایک ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔ اگر آپ ری سائیکل بن کو حقیقت میں خالی کرانا چاہتے ہیں، تو اس میں 'Yes' بٹن کو کلک کیجیے، ورنہ 'No' بٹن کو کلک کیجیے۔

آپ جانتے ہیں کہ ری سائیکل بن ایک فولڈر، یعنی آبجیکٹ ہے، اس لیے اس کی بھی خصوصیتیں (Properties) ہوتی ہیں۔ ایک اہم خصوصیت اس کا سائز ہے، جو ہارڈ ڈسک کی صلاحیت کے فیصد (Percentage) کے طور پر دیا جاتا ہے۔ آپ ری سائیکل بن کے کانٹیکسٹ مینو میں 'Properties' آپشن کو چن کر اس کی خصوصیتوں کو بدل سکتے ہیں۔

ایک ساتھ کئی اشیاء کو منتخب کرنا

(Selecting Multiple Objects at a Time)

اوپر ہم نے جو بھی کام بتائے ہیں، وہ ایک ہی شے یا آبجیکٹ (فولڈر یا فائل) کے بارے میں ہیں لیکن، یہ سبھی کام آپ متعدد اشیاء (فولڈروں یا فائلوں) پر بھی کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ساتھ کئی فائلوں کو نقل کرنا، ہٹانا یا واپس لانا۔ اس کے لیے ان اشیاء کو ایک ساتھ چننا پڑتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ سبھی اشیاء ایک ہی فولڈر میں ہونی چاہئیں، الگ الگ فولڈروں کی اشیاء کو ایک ساتھ نہیں چنا جاسکتا۔

اگر منتخب کی گئی اشیاء گروپ کی شکل میں ایک ساتھ ہیں، تو انھیں منتخب کرنے کے لیے پہلے گروپ کی سب سے پہلی شے یا آبجیکٹ کو کلک کردیں۔ پھر ماؤس پوائنٹر کو گروپ کے آخری آبجیکٹ پر لے جائیں اور شفٹ کنجی کو دبا کر اس آبجیکٹ کو کلک کریں۔ ایسا کرتے ہی ان دونوں اشیاء کے ساتھ ہی ان کے درمیان کی سبھی اشیاء کا رنگ بدل جائے گا، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ چن لی گئی ہیں۔ اب آپ ان منتخبہ اشیاء پر اوپر بتایا گیا کوئی بھی کام کرسکتے ہیں لیکن Rename کرنے کا کام صرف ایک شے یا آبجیکٹ کو ہی منتخب کرکے کیا جاسکتا ہے۔

اگر منتخبہ اشیاء ایک ہی جگہ پر، یعنی ایک ساتھ نہ ہوں، تو انھیں منتخب کرنے کے لیے ہر ایک کو الگ الگ کلک کرنا ہوگا اور کلک کرتے وقت کنٹرول (Ctrl) کنجی کو دبائے رکھنا ہوگا۔ تصویر W-5.17 میں ایک فولڈر میں دور دور رکھی ہوئی اشیاء ایک ساتھ منتخب کی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔

اگر آپ کئی منتخبہ اشیاء میں سے کسی خاص شے یا آبجیکٹ کو انتخاب سے نکالنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے بھی یہی ہدایت دی جاتی ہے۔ کسی منتخبہ شے کو کنٹرول

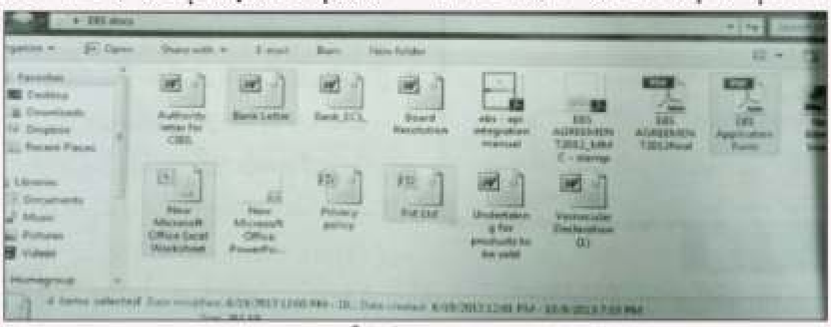

تصویر W-5.17: ایک ساتھ منتخب کی گئی مختلف اشیاء

کنجی کے ساتھ کلک کرنے پر وہ شے انتخاب سے باہر ہوجاتی ہے۔

فائلوں اور فولڈروں کو ڈھونڈنا (Searching Files and Folders)

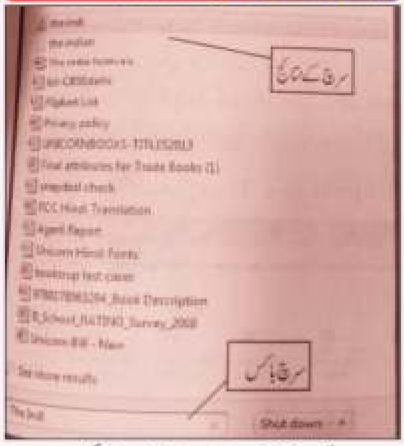

تصویر W-5.18: اسٹارٹ مینو میں سرچ باکس

اگر کوئی صارف کافی لمبے وقت تک کسی کمپیوٹر پر کام کرتا ہے، تو اس دوران اس کے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی بڑی تعداد میں فائلیں بن جاتی ہیں۔ یہ فائلیں مختلف جگہوں، یعنی فولڈروں میں بکھری رہتی ہیں۔ جب تک فائلوں کی تعداد کم رہتی ہے، تب تک تو صارف کے لیے ہر ایک فائل کا نام اور اس کا مقصد یا مواد یاد رکھنا ممکن ہوتا ہے، لیکن جیسے جیسے فائلوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، ویسے ویسے اس کے لیے یہ باتیں یاد رہنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو یہ بھی یاد نہیں رہ پاتا کہ کسی خاص اطلاع یا مواد والی فائل اس نے کس نام سے اور کس فولڈر میں بنائی تھی ایسی حالت کمپیوٹر کے استعمال کرنے والو ں کے سامنے عموماً آتی رہتی ہے۔ اس لیے فائلوں اور فولڈروں کو ڈھونڈنا ایک عام بات ہے۔

عموماً ہر ایک آپریٹنگ سسٹم کی طرح ونڈوز میں بھی فائلوں اور فولڈروں کو ڈھونڈنے کی سہولت موجود ہے۔ یہ ونڈوز کی ایک بنیادی سہولت ہے، اس لیے اسٹارٹ مینو (Start Menu) میں ہی 'Search' نام سے دی جاتی ہے۔ مان لیجیے، آپ کے کمپیوٹر میں 'The Indian Festivals' کے نام سے ایک فائل ہے لیکن آپ اس کی جگہ بھول گئے ہیں۔ فائل کو ڈھونڈنے کے دو طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: فائل تلاش کرنے کا پہلا طریقہ درج ذیل ہے:

1۔ اسٹارٹ بٹن کلک کیجیے، اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ اسٹارٹ مینو میں بائیں جانب نچلے حصے میں دیے گئے سرچ باکس میں مطلوبہ فائل کا نام ٹائپ کیجیے۔ آپ کے ذریعے فائل کا نام ٹائپ کرتے ہی تلاش شروع ہوجائے گی۔ آپ فائل کا پورا نام ٹائپ بھی نہیں کر پائیں گے اور فائل آپ کے سامنے آجائے گی۔

دوسرا طریقہ:

1۔ ڈیسک ٹاپ پر 'Computer' کے آئیکان پر ڈبل کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر W-5.3 کی طرح Computer کی ونڈو کھل جائے گی۔ Computer ونڈو میں ایڈریس بار کی دائیں جانب دیے گئے سرچ باکس میں مطلوبہ فائل کا نام ٹائپ کیجیے۔

2۔ ٹائپ کرتے ہی تلاش شروع ہوجائے گی اور ہارڈ ڈسک میں جن بھی جگہوں پر فائل یا دستاویز سے ملتا نام ہوگا، وہ سبھی فائل یا فولڈر اسکرین پر آجائیں گے۔ (تصویر W-5.19۔

تلاش اور بھی بہتر اور مستحکم ہو، اس کے لیے آپ فلٹر کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ 'Computer' ونڈو میں

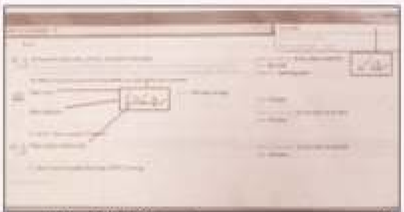

تصویر w-5.19 Computer ونڈو میں فائل تلاش کرنے کا طریقہ

آپ کو دو قسم کے فلٹر دیے گئے ہیں۔ 'Date Modified' فلٹر اور 'Size' فلٹر۔

ڈیٹ موڈیفائیڈ (Date Modified) فلٹر کے ذریعے آپ کوئی بھی اس تاریخ یا وقت کی مدت کو واضح کرسکتے ہیں، جب آپ نے اس دستاویز یا فائل پر آخر میں کام کرکے اسٹور کیا تھا۔

تصویر w-5.20: Computer ونڈو میں ڈیٹ موڈیفائیڈ

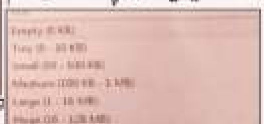

تصویر w-5.21: Computer ونڈو میں سائز فلٹر

سائز **(Size)** فلٹر کے ذریعے آپ فائل کا سائز متعین کرسکتے ہیں کہ وہ آپ کے اندازے کتنی بڑی ہوگی۔

ان فلٹروں کو متعین کرنے سے تلاش اور بھی آسان ہوجاتی ہے اور کمپیوٹر کو لاکھوں فائلوں میں سے ایک فائل کو تلاش کرنے میں وقت کم لگتا ہے۔

ونڈوز 7 میں لائبریریاں (Libraries in Windows 7)

کوئی بھی صارف ایک لمبے وقت میں بڑی تعداد میں مختلف جگہوں پر فائل اور فولڈر بنالیتا ہے۔ لائبریریاں (Libraries) ان فائلوں اور فولڈروں تک آسانی سے

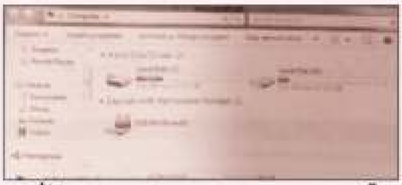

تصویر w-5.22 Computer ونڈو میں لائبریریز آپشن

پہنچنے اور استعمال کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ ونڈوز 7 میں چار پہلے سے متعینہ لائبریریاں پائی جاتی ہیں۔ یہ لائبریریاں 'Computer' ونڈو میں بائیں طرف کے کالم (نیوی گیشن پین) میں نظر آتی ہے۔ (تصویر W-5.22)۔ یہ لائبریریاں ہیں:

1۔ ڈاکیومنٹ لائبریری (Document Library)
2۔ پکچر لائبریری (Picture Library)
3۔ میوزک لائبریری (Music Library)
4۔ ویڈیو لائبریری (Video Library)

یہ لائبریریز (Libraries) فولڈر کی طرح کام کرتی ہیں۔ آپ ان 'Libraries' پر رائٹ کلک کرکے ان کی پراپرٹیز میں جاکر یہ متعین کرسکتے ہیں کہ مکمل ہارڈ ڈسک میں الگ الگ مقام پر بنے مختلف فولڈروں میں سے کون سے فولڈر ان لائبریریز میں نظر آئیں۔ اس طرح سے آپ ان فولڈروں کا انتخاب کرسکتے ہیں، جس سے:

- ڈاکیومنٹ لائبریری (Document Library) میں صرف دستاویزوں سے متعلق فائل اور فولڈر نظر آئیں۔
- پکچر لائبریری (Picture Library) میں صرف تصویر اور تصویروں سے متعلق فائل اور فولڈر نظر آئیں:
- میوزک لائبریری (Music Library) میں صرف موسیقی سے متعلق فائل اور فولڈر نظر آئیں؛ اور
- ویڈیو لائبریری (Video Library) میں صرف

تصویر w-5.23: ونڈوز 7 میں پہلے سے متعینہ لائبریریز

ویڈیو سے متعلق فائل اور فولڈر نظر آئیں۔

دراصل، یہ لائبریریز فائلوں اور فولڈروں کا مجموعہ نہیں ہوتیں اور صرف ان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے اگر کبھی صارف غلطی سے کسی لائبریری کو ڈیلیٹ کردیتا ہے، تب بھی اس کے اندر دکھائی دینے والی فائل اور فولڈر اپنی بنیادی جگہ پر محفوظ رہتے ہیں۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریاگنج، نئی دہلی 2 فون نمبر: 011-23275434,23262683

ادبی کوئز

محمد ناظم علی

(1) ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا آغاز کب ہوا؟
(الف) 1920 (ب) 1930
(ج) 1925 (د) 1919

(2) درون ذاتی ترسیل میں کتنے لوگ شامل ہوتے ہیں؟
(الف) ایک شخص (ب) دو شخص
(ج) تین شخص (د) چار شخص

(3) کس محقق کے مطابق انسانی شخصیت اس کے کلچر کا عکس ہوتی ہے۔
(الف) چومسکی (ب) میکی ور
(ج) بس (د) ایڈورڈ نارگ

(4) موجودہ وزیر اطلاعات ونشریات کون ہیں؟
(الف) اسمرتی ایرانی (ب) پرکاش جاوڈیکر
(ج) ایم جے اکبر (د) مختار عباس نقوی

(5) زبان کے باقاعدہ مطالعے کو کیا کہتے ہیں۔
(الف) نفسیات (ب) لسانیات
(ج) سماجیات (د) لسان

(6) ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار کس نے نکالا۔
(الف) جیمس آگسٹس (ب) گلٹن برگ
(ج) لالہ ہردیال (د) سکھ لال

(7) اردو کے پہلے مطبوعہ اخبار کا نام بتایئے۔
(الف) آئینہ (ب) جام جہاں نما
(ج) آفتاب جدید (د) ہماری زبان

(8) پرسار بھارتی کس سنہ میں وجود میں آیا۔
(الف) 1999 (ب) 1990
(ج) 1995 (د) 2000

(9) ہندوستان میں ٹیلی ویژن نشریات کے لیے سٹیلائٹ کا استعمال پہلی بار کس سال میں ہوا؟
(الف) 1960 (ب) 1955
(ج) 1965 (د) 1970

(10) مغل بادشاہوں کے یہاں خبریں حاصل کرنے کا وسیلہ تھا۔
(الف) رپورٹر (ب) واقع نگار
(ج) نامہ نگار (د) ایڈیٹر

(11) کسی شہر یا خطے میں رپورٹروں کی ٹیم کے سربراہ کو کیا کہتے ہیں۔
(الف) نامہ نگاروں کی ٹیم (ب) بیورو چیف
(ج) اسٹاف رپورٹر (د) ہرکارہ

(12) اخبارات کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ کیا ہے؟
(الف) اشتہارات (ب) مضامین
(ج) نیوز (د) اداریہ

(13) کسی گھپلے کا پردہ فاش کرنے کے لیے خفیہ کیمرے کے استعمال کو کیا کہتے ہیں؟
(الف) اسٹنگ آپریشن (ب) بلو آپریشن
(ج) گرین آپریشن (د) آپریشن

(14) خبر رساں ادارے خبر کے کس ذرائع میں شامل ہیں۔
(الف) اولین ذرائع (ب) ثانوی ذرائع
(ج) بنیادی ذرائع (د) غیر اہم ذرائع

(15) انٹرنیٹ پر پیش کیا جانے والا نجی مواد کیا کہلاتا ہے؟
(الف) Blog (ب) Log
(ج) Login (د) Blue Pring

(16) جز وقتی رپورٹرس کو کیا کہتے ہیں؟
(الف) Stringer (ب) Stronger
(ج) مستقل (د) آؤٹ سورسنگ

(17) خبر کا سب سے اہم حصہ جو ابتدا میں ہوتا ہے کہلاتا ہے؟
(الف) Lead (ب) Load
(ج) Least (د) lost

(18) قارئین تک اخبار پہنچانے والے کو کیا کہتے ہیں؟
(الف) ہاکر (ب) اخبار فروش
(ج) اخبار خریدنے والا (د) اخبار مانگ کر پڑھنے والا

(19) اخبار کے مواد کی تصحیح کو کیا کہتے ہیں؟
(الف) Proof Reader (ب) Reading
(ج) Recitation (د) Writing

(20) روس کی نیوز ایجنسی کا کیا نام ہے؟
(الف) Ijars Tags (ب) Frances
(ج) ارنا (د) رائٹر

(21) دلبر شرام کی لکھی ہوئی مشہور کتاب کا نام ہے۔
(الف) میڈیا کا زوال (ب) میڈیا کا ارتقا
(ج) میڈیا کی ترقی (د) میڈیا کی کہانی

(22) ابتدائیہ سے کیا مراد ہے؟
(الف) خبر کا پہلا حصہ (ب) خبر کا دوسرا حصہ
(ج) تیسرا حصہ (د) چوتھا حصہ

(23) مینوفیکچرنگ کنسنٹ کے مصنف کون ہیں؟
(الف) نوم چومسکی (ب) ہابس
(ج) کارل مارکس (د) گل کرائٹ

(24) فوٹو کیپشن سے کیا مراد ہے؟
(الف) فوٹو کی تشریح (ب) فوٹو پرنوٹ
(ج) فوٹو لینا (د) فوٹو اتارنا

(25) پریس ایجنسی ہاؤس کو کس سنہ میں قائم کیا گیا؟
(الف) 1935 (ب) 1930
(ج) 1936 (د) 1940

(26) کراپنگ سے کیا مراد ہے؟
(الف) فوٹو میں ترمیم کرنا (ب) فوٹو نکالنا
(ج) فوٹو لینا (د) فوٹو میں کمی

(27) رائٹر نیوز ایجنسی کے بانی کون تھے؟
(الف) پال جولیس (ب) پال میری
(ج) پال سنٹ (د) پال

(28) ایسوسی ایٹڈ پریس کو امریکہ میں کب قائم کیا گیا۔
(الف) 1948 (ب) 1950
(ج) 1955 (د) 1960

(29) Universal Journalist کے مصنف کون ہیں؟
(الف) ڈینیل لرنر (ب) تھامس
(ج) Edison (د) Tresa

(30) انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 1930 (ب) 1927
(ج) 1928 (د) 1939

(31) ہندوستان میں پہلا ٹی وی اسٹیشن کس سنہ میں شروع ہوا؟
(الف) 1920 (ب) 1922
(ج) 1925 (د) 1028

(32) ہندوستان میں ٹی وی کی رنگین نشریات کب شروع ہوئی؟
(الف) 1982 (ب) 1985
(ج) 1984 (د) 1986

(33) ہندوستان کا سب سے پہلا ٹی وی چینل کون سا تھا؟
(الف) ای ٹی وی (ب) زی ٹی وی
(ج) زی سلام (د) کیوٹی وی

(34) ریڈیو کے موجد کون ہیں؟
(الف) مارکونی (ب) Jacub
(ج) ویزلی (د) جانسن

(35) ٹی وی کے موجد کون ہیں؟
(الف) J.L Baird (ب) J L Hunter
(ج) Perkin (د) ہابس

(36) اودھ پنچ کے ایڈیٹر کون تھے؟
(الف) منشی سجاد حسین (ب) حسرت
(ج) جوہر (د) ابوالکلام

(37) روزنامہ سیاست کے بانی کون ہیں؟
(الف) عابد علی خاں (ب) اختر حسن
(ج) شعیب اللہ خاں (د) باقر مہدی

(38) ماہ نامہ 'سب رس' کس سنہ میں جاری ہوا؟
(الف) 1938 (ب) 1940
(ج) 1945 (د) 1950

(39) ماہ نامہ 'صبا' کے مدیر کون تھے۔
(الف) سلیمان اریب (ب) اختر حسن
(ج) قاضی عبدالغفار (د) حسرت

(40) پہلے ادبی رسالہ کا نام بتایئے۔
(الف) مخزن الفوائد (ب) فوائد الناظرین
(ج) خورشید دکن (د) آئینہ

(41) 'تہذیب الاخلاق' کب جاری ہوا؟
(الف) 1870 (ب) 1875
(ج) 1872 (د) 1869

(42) 'منادی' کے مدیر کون تھے؟
(الف) حسرت (ب) خواجہ حسن نظامی
(ج) جوہر (د) گوہر

(43) کمپیوٹر کو کس نے ایجاد کیا۔
(الف) الیف چارلس باباایج (ب) گلکرائسٹ
(ج) گٹن برگ (د) ہنٹر

(44) 'شگوفہ' ماہنامے کے مدیر کون ہیں؟
(الف) مصطفیٰ کمال (ب) مصطفیٰ پاشاہ
(ج) حیدر علی (د) پطرس

(45) بابائے اردو کہلاتے ہیں۔
(الف) مولوی عبدالحق (ب) ڈاکٹر عبدالحق
(ج) سراج (د) صفی

(46) خاتون دکن کے مدیر کون تھے؟
(الف) صالحہ الطاف (ب) احمدی بیگم
(ج) اشرف رفیع (د) میمونہ

(47) 'الہلال' اور 'البلاغ' کے مدیر کون تھے؟
(الف) جوہر (ب) ابوالکلام
(ج) عبدالکلام (د) گوہر

صحیح جوابات

1. الف	2. الف	3. د	4. الف	5. ب
6. الف	7. ب	8. الف	9. الف	10. ب
11. ب	12. الف	13. الف	14. ب	15. الف
16. الف	17. الف	18. الف	19. الف	20. الف
21. ب	22. الف	23. الف	24. الف	25. الف
26. الف	27. الف	28. الف	29. الف	30. الف
31. الف	32. الف	33. ب	34. الف	35. الف
36. الف	37. الف	38. الف	39. الف	40. الف
41. الف	42. ب	43. الف	44. الف	45. الف
46. الف	47. ب			

Dr. Mohd Nazim Ali
Ex. Principle Gov Degree College
Mortar
Distt.: Nizamabad - 503224 (Telangana)

تبصرہ و تعارف

آئینہ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد دہم و یازدہم)

تحقیق وترتیب: جمیل اختر

صفحات: 246 (جلد دہم)، 258 (جلد یازدہم)

قیمت: 128 (جلد دہم)، 132 (جلد یازدہم)

ناشر: ڈاکٹر سلیم محی الدین

صدر شعبۂ اردو، شری شیواجی کالج، پربھنی (مہاراشٹر)

قرۃ العین حیدر کا شمار اردو ادب کی ان خوش نصیب ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنی زندگی ہی میں ایک افسانوی شخصیت کا درجہ پا چکی تھیں۔ انھیں اس لحاظ سے بھی ایک رجحان ساز مانا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے وقت فکشن کی جانب توجہ کی جب ہر طرف شاعری کا دور دورہ تھا۔ ان سے قبل اردو میں ناول کا شمار بیشتر مقبول ادب میں کیا جاتا تھا۔ وہ ایک افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار اور مترجم کے طور پر شہرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے 'آگ کا دریا'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'میرے بھی صنم خانے'، 'چاندنی بیگم' اور 'کار جہاں دراز ہے' جیسے لازوال ناول تخلیق کیے ہیں۔ افسانوی مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' پر انھیں 1967 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

زیر نظر کتاب 'آئینہ جہاں' قرۃ العین حیدر کی کلیات کے اشاعتی سلسلے کا حصہ ہے جو دو جلدوں (دہم اور یازدہم) پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل کی نو جلدوں میں ان کے افسانے، ناولٹ، رپورتاژ، مضامین اور خاکے شامل ہیں جبکہ زیر نظر دونوں جلدیں مختلف وقتوں میں لیے گئے اور مختلف رسالوں میں شائع شدہ انٹرویوز پر مشتمل ہیں۔ ان میں دو ایسے انٹرویوز بھی شامل ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں اور چند دیگر زبانوں سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ مرتب کی عرق ریزی اور تحقیق وجستجو کے باعث یہ ایک دستاویزی نوعیت کی حامل کتاب ہوگئی ہے اور آئندہ قارئین، محققین اور ناقدین کے لیے ایک قیمتی تحفے سے کم نہیں۔ جمیل اختر کی تحقیق وجستجو اور صبر وتحمل کا اندازہ ہمیں ان کے قرۃ العین حیدر سے لیے گئے انٹرویو سے ہوتا ہے جو اس کتاب کا پہلا اور سب سے طویل انٹرویو ہے۔ یہ انٹرویو اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ پچھلے تمام انٹرویوز کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

'آئینہ جہاں' میں قرۃ العین حیدر کا لکھا ایک دیباچہ اور مرتب کتاب کا لکھا ایک مقدمہ شامل ہے۔ دراصل یہ ایک ہی مضمون ہے جسے دونوں جلدوں میں شامل کیا گیا ہے۔ دیباچے میں قرۃ العین حیدر نے کھل کر اپنے تخلیقی سفر اور فکری ارتقا کو بیان کیا ہے۔ گھر کے ادبی ماحول اور مشاہیر ادب کی آمد ورفت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ وہ تخلیق کو ایک انفرادی عمل اور فکر کو ایک فطری ردعمل قرار دیتی ہیں بقول قرۃ العین حیدر" لکھنا ایک بے حد انفرادی عمل ہے لیکن اسی کے ذریعے لکھک اجتماعی زندگی میں اپنا اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے دور کی سیاسی اور دوسری تحریکوں کا اثر قبول کرتا ہے یا ان سے الگ بھی اپنی راہ بناتا ہے۔ بعض دفعہ یہ راہ بالکل غیر ارادی طور پر بنتی ہے۔" آگے چل کر وہ بھارت کی مشترکہ تہذیب کا خوبصورت نقشہ کھینچتی ہیں اور اس کے انتشار پر تاسف کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ وہ اپنے انٹرویوز کو بدلتے ہوئے حالات کا آئینہ قرار دیتی ہیں۔ جبکہ مقدمہ میں جمیل اختر نے انٹرویوز کے حصول کے لیے کی گئی جدوجہد اور کلیات کی ترتیب کے دوران پیش آئی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ مرتب نے ایک خوبصورت اضافہ یہ بھی کیا ہے کہ انٹرویو کو اس کے مندرجات کے لحاظ سے ایک خوبصورت عنوان دیا ہے جس سے مذکورہ انٹرویو کے مزاج اور مواد کا اندازہ قاری کو ہو جاتا ہے۔

ان انٹرویوز میں ادب، تاریخ، فلسفہ، تحریکات، عالمی ادب، آزادیٔ نسواں جیسے بے شمار موضوعات پر قرۃ العین حیدر کے برجستہ خیالات تک ہمیں رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ان میں جہاں بدلتے سیاسی، سماجی وتہذیبی منظرنامے کا عکس نظر آتا ہے وہیں قرۃ العین حیدر کی شخصیت کے کئی گوشے بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں ایک افسانوی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکی مصنفہ جا بہ جا نقادوں کا شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنے ابتدائی انٹرویوز میں متنازعہ بیانات (جیسے 'عزیز احمد کا صرف ایک ناول گریز اچھا'') دینے سے نہ گھبرانے والی قرۃ العین آخر آخر میں ہر متنازعہ سوال کا جواب دینے سے انکار کرتی ہیں۔ اپنی تحریروں پر کھل کر بات کرنے والی مصنفہ آخر آخر میں جس طریقے سے میں نے دیکھا چیزوں کو ویسے لکھ دیا'' کہہ کر پیچھا چھڑاتی نظر آتی ہیں۔ ذرا غور سے پڑھا جائے تو یہ کتاب قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج اور رویے کی تبدیلی کا بھی آئینہ ہے۔ میرے خیال سے اس کا مطالعہ اردو کے ان ریسرچ اسکالرز کے لیے نہایت ضروری ہے جو قرۃ العین حیدر، ان کے عہد یا اردو فکشن پر

تحقیق کر رہے ہوں۔ بلاشبہ آئینہ جہاں ایک دستاویزی نوعیت کی کتاب ہے۔
دونوں جلدوں (دہم اور یازدہم) میں مجموعی طور پر تیس انٹرویوز شامل ہیں جو تمام مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک انگریزی اور تین ہندی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ مستقبل کے محققین کے لیے ایسے بیش قیمت اور نایاب تحفے کے لیے مرتب جمیل اختر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کونسل کے معیار کے عین مطابق خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب سرورق آئینہ جہاں کی خصوصیت ہے۔

تاریخ ادب اردو (1858 تا 1911) جلد 16 اور 17

مصنف: محمد انصاراللہ
صفحات: 556/626، قیمت: 235/265، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ارشاد قمر، اے۔بی 452 پہلی منزل، امر پوری رام نگر نبی کریم، پہاڑ گنج، نئی دہلی 25

تاریخ ادب اردو جلد 16 اور 17 محمد انصاراللہ کی ان کاوشوں کا نتیجہ ہے جسے بڑے سے بڑے تاریخ داں آسانی سے ہاتھ نہیں لگاتے بلکہ تاریخ کی پیچیدگیوں میں الجھنا بھی نہیں چاہتے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوا کہ تاریخ جیسے خشک موضوع پر قلم نہ اٹھایا جائے۔ بڑے بڑے ادیبوں اور مورخین نے اس اہم موضوع کو اپنا فریضہ سمجھا اور بڑے ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اسے پیش کیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی محمد انصاراللہ کی یہ کتاب ہے ان کے علاوہ محمود شیرانی میں پنجاب میں اردو، نصیرالدین ہاشمی کی دکن میں اردو اور مسعود حسین خاں کی مقدمہ تاریخ زبان اردو جیسی مایہ ناز کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ ان کتابوں میں اردو کے حوالے سے بات کی گئی ہیں مثلاً اردو کب کیسے اور کہاں سے آئی وغیرہ۔ ان تمام لوگوں نے اپنی اپنی تلاش وجستجو یا تحقیق کی روشنی میں دلیلیں پیش کی ہیں۔

اسی سلسلے کی یہ کڑی ہے جسے محمد انصاراللہ نے بڑی جانفشانی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے پہلے جو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں ان تمام میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ اردو سے متعلق باتیں کہی گئی ہیں۔ تاریخ ادب اردو کی اس جلد سے مقصود یہ ہے کہ زبان اردو کی اصل اور اس کے ارتقا سے متعلق صحیح ترین حقائق ارباب علم ودانش کی نظر میں آجائیں۔ 1857 کے زبردست اور قیامت خیز ہنگاموں کے بعد ملک میں جو غیر معمولی انقلاب کی صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کو قلمبند کرنے کے لیے کئی ہزار اوراق درکار تھے اور لوگوں نے اپنی بساط کے مطابق ان حالات کو صفحہ قرطاس پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اسے مزید وضاحت کے ساتھ محمد انصاراللہ نے بھی اپنی کاوشیں کئی جلدوں میں پیش کی ہیں۔ اس وقت سولہویں جلد ہمارے سامنے ہے اور اس کی فہرست کا شمار کچھ اس طرح ہے:

بریلی، بدایوں، مراد آباد، فرخ آباد، مین پوری، اعظم گڑھ، غازی پور، بہرائچ، گورکھ پور، گونڈہ، فیض آباد، صوبہ بہار (عظیم آباد وغیرہ) مغربی بنگال، کلکتہ مرشد آباد وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی مقامات ہیں جن کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔ دیگر جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی شعروادب کی الگ الگ صنفوں اور علوم وفنون کی مختلف شاخوں کے انداز اور ان کے نشیب وفراز کا بیان وضاحت واختصار کے ساتھ ملتا ہے۔ چند کا ذکر کچھ اس طرح ہے:

بیشتر وہ شعرا جن کا تعلق امراء طبقہ سے تھا وہ لوگ کتابی زبان میں نظم ونثر لکھا کرتے تھے۔ وہ شاعر جن کا تعلق عوام سے تھا یا اپنے کلام کے ذریعے عوام تک پہنچنا چاہتے تھے انھیں کی بولی ٹھولی میں اپنے تصنیفی فرائض کو انجام دیا کرتے تھے۔ ان سب کی مثالیں اس جلد میں موجود ہیں۔ دوسری جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی بعض وہ جگہیں تھیں جس پر انگریزی حکام کا تسلط ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں ایسی جگہوں پر انگریزی معاشرت اور ہر قسم کی معاملات کے اثرات مرتب ہوتے جارہے تھے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ناول اور ڈراما کے علاوہ افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ نظم جدید کی تخلیق کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور پوری تابانی کے ساتھ پروان چڑھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام بلکہ اس کے بعد تک ایسے ارباب قلم موجود تھے جن کو ادبیات اردو کی مروجہ مشرقی اصناف نظم ونثر سے پوری دلچسپی تھی۔ ان کی دلچسپی کا فائدہ یہ ہوا کہ قواعد وعروض، اصول تحریر واملا وغیرہ کے مطالعے اور ان سے متعلق تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ان حالات میں اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ یہی ادبیات اردو کی بہترین ترقی کا زمانہ تھا۔ اس طرح کے خیالات محمد انصاراللہ کے ہیں لیکن جب ہم تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ انصاراللہ کی بات میں دم ہے۔

رہی بات تاریخ ادب اردو کی سترہویں جلد کی تو اس میں 1857 کی جنگ آزادی کے بعد سے پہلی عالمگیر جنگ کے وقت تک اردو زبان وادب کے ارتقا اور نشیب وفراز کے احوال کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس جلد میں مشرقی اور جنوبی ہند کے زبان وادب کے چھوٹے بڑے بیشتر مراکز کا بیان آگیا ہے۔ جن علمی وادبی مراکز کا اس جلد میں ذکر آیا ہے ان میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں:

مشرقی بنگال، آسام، چاٹگام، سلہٹ، اڑیسہ، گوالیار، بھوپال، اندور، گجرات، کاٹھیاواڑ، منگرول، جوناگڑھ، سورت، بڑودہ، جبل پور، جے پور، الور اجمیر، کرناٹک، ویلور، حیدرآباد، ناگپور، بمبئی اور میسور وغیرہ۔ ان علاقوں اور مراکز کے ادبی اور علمی پہلوؤں پر بالتفصیل اور اجمالاً گفتگو کی گئی ہے۔ محمد انصاراللہ صاحب مشرقی بنگال اور آسام کے تعلق سے کچھ یوں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ علاقہ زبان اردو کے معروف مراکز لاہور، دلی اور لکھنؤ سے دور افتادہ ہونے کے باوجود قابل ذکر رہا ہے اور ساتھ ہی ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد کی بدولت زبان اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم وتدریس کا بھی سلسلہ جاری رہا اور ان کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ چاٹگام کے خطے میں بھی اردو کے قابل قدر شعرا گزرے ہیں جن کا ذکر عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ سلہٹ میں شاعروں اور نثرنگاروں کی تعداد خاصی زیادہ ہوگئی تھی اور استادی اور شاگردی کی روایت بھی قائم ہوگئی تھی۔

1857 کے ہنگاموں کے بعد اڑیسہ کے قلمکاروں نے بھی شاعری اور نثر میں اپنی شناخت بنائی اور ان کے علاوہ جو بھی مراکز ہیں ان سب کا اپنا الگ اور منفرد کارنامہ ہے جس کی حقانیت اور معنویت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان تمام خوبیوں کو محمد انصاراللہ نے بڑی جانفشانی سے قلمبند کرکے اہل علم تک پہنچانے کا کام کیا ہے اور اس زمانے میں اردو نظم ونثر کی نئی نئی اصناف رواج پارہی تھیں۔ اس سلسلے کی ہندوستانی شاعری کی ایک صنف 'کھڑکا' بھی تھی۔ یہ اپنی اصل اعتبار سے بہادری کے گیت تھے اور ان کے زیادہ تر مراکز شمالی ہند میں تھے، مثلاً رامپور، شاہجہانپور وغیرہ۔ انگریزی کی اتباع کے نتیجے میں اردو کو جو کئی طرح کی اصناف حاصل ہوئی تھیں وہ یہ ہیں: ناول، ناولٹ، سانیٹ، ڈراما، زبان اور تحریر وغیرہ کے اصول وضوابط کی طرف بھی اس زمانے میں توجہ کی گئی تھی لیکن انگریزی کی تقلید میں افادیت پر زیادہ زور دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخلیقی ادب کی دو صورتیں ہوگئیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی۔ مقصد حیات اگر مثبت اور واضح نہ ہو

تو بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اس اہم کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور امید قوی ہے کہ سب جلدیں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر عنقریب علم وادب کے شائقین کی خدمت میں پہنچ جائیں گی۔

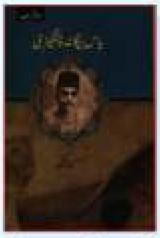

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

مصنف: حسن مثنیٰ

صفحات: 149، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی

مبصر: نوشاد منظر، جوہری فارم، نئی دہلی

غالب شکن کے نام سے مشہور یاس یگانہ چنگیزی کا شمار اردو کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین تھا، انھوں نے کم عمری میں ہی اپنی شاعری کا لوہا منوالیا، ابتدا میں انہوں نے یاس تخلص اختیار کیا مگر عظیم آباد سے جب علاج کے سلسلے میں لکھنو آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی تب سے انھوں نے یاس کے ساتھ یگانہ بھی شامل کرلیا۔

میرے پیش نظر یاس یگانہ چنگیزی پر ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا تحریر کردہ مونوگراف ہے۔ مونوگراف کی اپنی ایک اہمیت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ اہمیت یہ کہ ایک مختصر کتاب کے مطالعے سے ہم کسی شاعر اور ادیب کے متعلق بہت سی اہم باتیں جان لیتے ہیں اور مجبوری یہ کہ مصنف کے سامنے صفحات کی قید ہوتی ہے، بہرحال حسن مثنیٰ نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ 'سوانح اور شخصیت' ہے۔ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے نہایت عمدگی کے ساتھ یاس یگانہ چنگیزی کی زندگی اور اس کے مراحل کا ذکر کیا ہے۔ حسن مثنیٰ نے یگانہ کی زندگی، ان کے مصائب، پریشانی اور روزگار کے مسئلے کے ساتھ معاصرین کے ساتھ ان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ جن دنوں روزگار کے سلسلے میں لاہور میں قیام پذیر تھے، ان دنوں علامہ اقبال کے ساتھ ان کے خوشگوار رشتے تھے، یہی نہیں جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی اور سیماب اکبرآبادی سے بھی اقبال کے دولت کدے پر ملاقاتیں رہیں۔ یہ وہی دور ہے جب لاہور کے معروف اشاعتی ادارے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز میں یگانہ کو ملازمت ملی تھی۔ اس ادارے نے 'اردو مرکز' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کا مقصد اردو کے تمام اصناف کے انتخابات کو شائع کرنا تھا۔ یاس یگانہ کی ملازمت تاجور نجیب آبادی کے معاونین کے طور پر ہوئی۔ بہرحال یاس یگانہ چنگیزی کی پوری زندگی نشیب وفراز سے بھری ہے، ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس شخص نے حق تلفی یا ناحق پرستی کو پسند نہیں کیا۔ یگانہ کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے، جو ان کی قبر کے کتبے پر درج ہے۔

خود پرستی کیجیے، یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

زیر نظر کتاب کا دوسرا حصہ 'ادبی و تخلیقی سفر' ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے اپنی خودنوشت 'خودنوشت یاس' میں لکھا ہے کہ وہ میر تقی میر، خواجہ حیدر علی آتش کے انداز تغزل کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے میر اور آتش کے رنگ سخن کو اختیار کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز عظیم آباد سے کیا، مگر بعض مجبوریوں بلکہ بقول مصنف مزاج کے لاابالی پن نے انھیں عظیم آباد سے لکھنؤ ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی کی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے جس سے ان کی شخصیت متاثر ہوئی بلکہ چند ایک واقعہ نے انھیں متنازع بنادیا۔ بہرحال حسن مثنیٰ نے یاس یگانہ کی کتابوں پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس مونوگراف میں جن کتابوں کا ذکر ہے ان میں نشتر یاس، چراغ سخن، شہرت کاذبہ المعروف خرافات عزیز، غالب شکن، ترانہ، آیات وجدانی، گنجینہ، خودنوشت وغیرہ شامل ہے۔

مذکورہ مونوگراف کا تیسرا حصہ 'یگانہ فہمی: ایک تنقیدی محاکمہ' ہے۔ حسن مثنیٰ نے یاس یگانہ کے چند اہم ناقدین اور ان کی تحریر کا حوالہ اس باب میں پیش کیا ہے۔ باقر مہدی نے لکھا تھا کہ یگانہ نے اپنے زمانے کے حکمراں ادبی حلقے سے بغاوت کی تھی۔ اگر محض اس خیال پر غور کیا جائے تو اس کا ایک مفہوم تو یہی نکلتا ہے کہ یگانہ نے اپنے عہد کے مروجہ شعری اصولوں کے خلاف بلکہ مخالف ایک نیا شعری اسلوب اور لب ولہجہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت کا ادبی ماحول یگانہ کو قبول کرنے سے قاصر رہا، حالانکہ یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری میں انسانی زندگی کی قوت کا احساس اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے، آزادی، بانکپن اور پرزوری ان کے خیال کی خصوصیتیں ہیں۔ لہجے میں ایسی تمکنت اور وقار ہے جو آتش کی یاد دلاتا ہے۔

حسن مثنیٰ نے جامع انداز میں یگانہ کے ناقدین ان کی آرا کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ حسن مثنیٰ کا خیال ہے کہ یگانہ کی شخصیت اور شاعری کا مرکز صداقت، اصول پسندی اور خودداری ہے۔ اور انھیں خصوصیات نے 'یگانہ آرٹ' کو پروان چڑھایا ہے۔

کتاب کا آخری حصہ یاس یگانہ چنگیزی کے شعری انتخاب پر مبنی ہے۔ مصنف نے یگانہ کی غزلوں اور رباعیوں کا خوبصورت انتخاب پیش کیا ہے۔ شاعری کا انتخاب بھی مصنف کے اعلیٰ ذوق کو پیش کرتا ہے۔

مجموعی طور یہ مونوگراف یگانہ فہمی میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مصنف نے نہایت جامعیت کے ساتھ یگانہ کی شاعری پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یگانہ سے متعلق کئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ مصنف نے اعتدال کے ساتھ اپنی بات رکھی ہے۔

اخیر میں قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو اور اس کی پوری ٹیم کو مبارکباد۔ کونسل نے مونوگراف لکھنے کے لیے ہمیشہ ایسے لوگوں کا انتخاب کیا، اور بیشتر مصنفین نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ کتاب کی طباعت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

گنجینۂ معنی کا طلسم

مصنف: اسلم پرویز
صفحات: 143، قیمت: 150 روپے
ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
مبصر: حبیب الرحمٰن، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اسلم پرویز کی یہ کتاب غالب پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 13 مضامین ہیں جو غالب کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پیش لفظ صدیق الرحمٰن قدوائی نے لکھا ہے۔ متن سے انسان اُسی وقت رشتہ استوار کرسکتا ہے جب وہ خود کو افہام و تفہیم کے عمل گزارے۔ تفہیم اسلم پرویز کا خاصہ اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ درس و تدریس سے ایک طویل عرصے تک وابستہ رہے۔

'گنجینۂ معنی کا طلسم (مطالعۂ غالب)' غالب کے یہاں موجود امکانات کا Extension یا توسیع ہے۔ غالبیات کے زمرے میں آنے والے تمام مضامین پر اگر ہم غور کریں تو یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ تمام تر توانائی کے بعد بھی Repetition کے امکانات برقرار رہتے ہیں۔ غالب کا سخن اپنی شعری توانائی کے ساتھ متن کو بار بار دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ متن دیر سے خود کو آشکار کرتا ہے اور اس پر یہ اصرار بھی کرتا ہے کہ کسی ایک معنی کو حتمی نہ سمجھا جائے۔

پہلا مضمون 'تفہیم غالب' غالب کے ایک شعر کے حوالے سے ہے۔ تمہیدی گفتگو میں کئی ایسے نکتے ہیں جن پر نظر ٹھہرتی ہے۔ وہ شاعر کو چند بنیادوں پر تلمیذ رحمانی سمجھتے ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ان کے اس نظریے کی اساس ہے۔

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

ان کے نزدیک اگر شعر مواد کے اعتبار سے اپنے اندرون میں کچھ رکھ پانے سے قاصر ہے تو وہ شعر سچا نہیں بلکہ ایسا کلام موزوں ہے جسے تفہیم کے دائرے سے باہر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ صاحب کتاب نے 'تفہیم' کا لفظ استعمال کیا ہے جو افہام کے بعد کا مرحلہ ہے۔ یعنی قاری خود کو افہام کے عمل سے گزارے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ یہ شعر تفہیم کے لائق ہے یا نہیں۔ شعر کے تعین قدر کے سلسلے میں وہ تقابل کے قائل ہیں۔ ایک شعر کے مقابلے دوسرا شعر اسی شاعر کا ہوسکتا ہے۔ اسی دور کے کسی دوسرے شاعر کا یا مختلف ادوار کے کئی شعرا کے اشعار تقابل کا معیار ہوسکتے ہیں۔

تیسرا مضمون 'غالب دین و دانش کے درمیان' غالب کے مذہبی عقائد پر روشنی ڈالتا ہے۔ غالب کی شاعری اور نثر کے حوالے سے وہ تمام تر باتیں شامل کی گئی ہیں جن پر مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراض کیے جاتے رہے ہیں۔ مکتوبات کے حوالے سے مختلف اقتباسات نقل کیے گئے ہیں اور ان اشعار کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن میں جنت کی حقیقت، شراب طہور اور فرشتوں کا انسان کی نیکی اور بدی کو لکھنا شامل ہے۔ ان اشعار میں طنز کی لہر تیز تر ہے۔ غالب کا استفہام کس قدر اثر انگیز ہے اس کی مثالیں جا بہ جا کلام غالب میں نظر آتی ہیں۔ مذہبی معتقدات کے زیر اثر کی جانے والی شاعری میں بھی آسودگی کا اظہار نظر نہیں آتا۔ وہاں بھی لہجہ تشکیک سے بھرپور اور استفہام اپنی اوج پر ہے۔ اسلم پرویز شاعری میں احتجاج کی روایت کو باوقار نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبی ریاکاری کی بدولت ہی احتجاج کی لے تیز تر ہوئی۔ وہ غالب کے اس رویے کو شوریدہ سری کا نام دیتے ہیں کہ یہ عام آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک چند شخصیتیں تاریخ کی مخلوق ہونے کے ساتھ اس کی خالق بھی ہوتی ہیں اور فن کارانہ بصیرت کے تناظر میں غالب کو وہ اُس عہد کی تاریخ کا خالق بھی شمار کرتے ہیں۔

چوتھا مضمون 'غالب کی شاعری میں علامت' ہے۔ اس میں غالب کے یہاں موجود علامات کی نشاندہی کی گئی ہے اور علامات کا وہ اصطلاحی مفہوم جو مغرب کی دین ہے اس کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ غالب کا دور مغربی اصطلاحات سے قبل کا ہے ظاہر ہے وہ اس سے باخبر تو ہو نہیں سکتے۔ لیکن علامات زبان کی سرشت میں داخل ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلم پرویز نے اس گوشے پر بھی نظر ڈالی ہے۔ پانچواں مضمون 'غالب اپنی شکست کی آواز' میں غالب کے تخیل پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک تخیلی فکر سے غالب اور تحلیلی فکر سے اقبال پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں ایک قابل غور نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اچھی اور بری شاعری کو آمد اور آورد کے خانوں میں رکھ کر دیکھنا ایک گھسا پٹا تنقیدی رویہ ہے۔ ان کے نزدیک آمد کا تعلق خداداد صلاحیت سے اور آورد کا مشق و مہارت سے ہے۔ ان کا یہ قول 'آمد اور آورد' کا بغور مطالعہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ غالب کے تخیل اور فکر پر بہت بات ہوئی یہ مضمون بھی اسی کا حصہ ہے۔ چھٹا مضمون 'غالب اور مومن' بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ عموماً شعرا کے موازنے میں کہیں نہ کہیں ذہنی ہم آہنگی یا موافقت تنقید نگار کے تنقیدی رویے پر سوالیہ نشان قائم کردیتی ہے۔ علامہ شبلی کا 'موازنۂ انیس و دبیر' بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ غالب اور مومن کا مطالعہ کرتے وقت بھی عموماً اسی طرح کا رویہ اختیار کیا گیا۔ اسلم پرویز کا یہ مضمون اعتدال کی بہتر مثال ہے۔ آٹھواں مضمون 'غالب مجنون' دراصل پروفیسر شمس الحق عثمانی کا مضمون ہے جو 'سہ ماہی اردو ادب' 2007 میں شائع ہوا ہے۔ اسلم پرویز کا یہ مضمون شمس الحق عثمانی کے مضمون پر کیا گیا ایک تبصرہ ہے۔ غالب کی شاعری میں موجود الفاظ کو شمار کرنے کی جو کوشش شمس الحق عثمانی نے کی ہے وہ ایک نئے باب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دسواں مضمون 'غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ: ایک تعارف' خلیق انجم کی کتاب کا بھرپور تعارف ہے۔ آخری مضمون 'غالب اور انگریزی الفاظ' ہے جو اسلم پرویز نے ادبی زندگی کے شروعاتی دور میں لکھا۔ انھوں نے اس مضمون سے قبل ایک نوٹ بھی تحریر کیا جس میں اس کی وضاحت بھی کردی ہے۔ غالب کے یہاں انگریزی زبان کے کون سے لفظ کن معنوں میں استعمال ہوئے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد لسانی منظرنامہ میں جو تبدیلی رونما ہوئی یا ایک تہذیب نے دوسری تہذیب کے الفاظ کو کس طرح قبول کیا اس کا مفصل ذکر اس مضمون میں موجود ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ کون سے حالات ہیں جس میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کسی اور زبان میں شامل ہوجاتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے مثالوں کی ذریعے وضاحت بھی کی گئی ہے۔

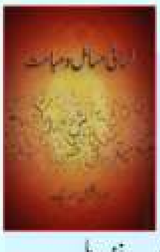

لسانی مسائل و مباحث

مصنف: مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 256، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: عبدالوحید خان، روم نمبر 106، علامہ اقبال ہاسٹل، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یہ کتاب 'لسانی مسائل و مباحث' مرزا خلیل احمد بیگ کی لسانی تحقیق کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے لسانیات پر ان کے تین مضامین کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں، پہلا مجموعہ 'اردو کی لسانی تشکیل' کے نام سے 1985 میں، دوسرا 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' کے نام سے 2005 میں اور تیسرا 'اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے' کے نام سے 2014 میں شائع ہوئے ہیں۔ 'لسانی مسائل و مباحث' میں تحقیقی اور لسانی نوعیت کے کل چندرہ

مضامین شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں اردو کے آغاز کے ایک نئے نظریے کی تشکیل کے حوالے سے مدلل گفتگو کی ہے۔ اردو زبان کی عہد بہ عہد ارتقاء سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی لسانی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں مسعود حسین خاں کے نظریے کی دادرسی کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اردو زبان کا وجود اس وقت سے تسلیم کیا جانا چاہیے جب سے کھڑی بولی معرض وجود میں آئی ہے وہاں انھوں نے اپنے اس مضمون میں آغاز اردو کے سلسلے میں اپنے اور مسعود حسین خان کے مابین تفریق کو بھی واضح کیا ہے

دوسرا مضمون 'اردو زبان کا تاریخی تناظر' ہے۔ اس میں انھوں نے اردو زبان کے مختلف محققین اور ماہر زبان کے نظریات اور آراء کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان کے تعلق سے ان کی کیا کیا رائے رہی ہیں اور وہ کس زاویے فکر سے اردو کے تاریخی تناظر پر غور کرتے ہیں۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے اس سلسلے میں دلچسپ گفتگو کی ہے اور بیان کیا ہے کہ اردو کو بلا تفریق مذہب وملت شمالی ہندوستان میں بیسوی صدی کے وسط تک مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کی مشترکہ زبان کی حیثیت حاصل تھی، جہاں مسلمان اردو زبان کو اپنی وراثت سمجھتے تھے وہیں اس ملک کے سچے محب وطن ہندو بھی اردو کو اپنی زبان کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

تیسرے مضمون 'اردو کی کھڑی بولی کی بنیاد' میں کھڑی بولی کو ہی مختلف دلائل وشواہد سے اردو ثابت کیا ہے اور چوتھے مضمون 'کھڑی بولی اور اہل ہندی (ایک تاریخی جائزہ)' میں بیان کیا ہے کھڑی بولی نے اردو کے آغاز وارتقاء میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس سے کسی بھی ماہر لسانیات کو انکار نہ ہوگا اور آگے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اردو والوں کو کھڑی بولی سے جتنی انسیت رہی ہے اہل ہندی کے یہاں یہ اتنی ہی ناپسند کی جاتی تھی اور اس کی اصل وجہ حوالوں کے ساتھ لسانی اسباب سے زیادہ تاریخی، تہذیبی اور داخلی اسباب کو بتایا ہے۔ پانچویں مضمون 'مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کے قدیم ترین حوالے' میں مسعود سعد سلمان کی زندگی کے تعلق سے اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ انہیں ہندوی یا ہندی کا پہلا مسلمان شاعر بتاتے ہوئے ان کے ہندوی دیوان کو 'ابتدائی قدیم اردو' کے ادبی نمونوں میں سے ایک بتایا ہے۔ چھٹے مضمون 'اردو زبان کی سماجی اور تہذیبی جڑیں' میں مصنف نے ہر زبان کی پہچان اس کے سماجی اور تہذیبی رشتوں پر قائم بتایا ہے اور اردو زبان کی سماجی، تہذیبی اساس سرزمین ہندوستان میں تلاش کیا ہے اور اسے خالص ہندوستانی زبان مانا ہے۔ لکھا ہے کہ اردو بولنے والے خواہ کسی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کا تہذیبی مزاج اور تہذیبی کردار ایک ہوتا ہے۔ اگلا مضمون 'اردو قواعد نویسی کی روایت' کے عنوان سے ہے جس میں اردو قواعد نویسی کی اہمیت اور مقاصد کو بیان کرتے ہوئے اس کا مفصل تاریخی اور موضوعی جائزہ لیا ہے۔ اردو قواعد نویسی کی ابتداء تاریخی اعتبار سے انگریز قواعد نویسوں کے ذریعے ہوئی۔ اس کے بعد انشاء اللہ خاں انشاء کے قواعد کا ذکر کرتے ہوئے گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں لکھی گئیں اردو زبان کی قواعد کی تاریخ وار فہرست بھی پیش کی ہے بعد ازاں قواعد کی مختلف قسموں کا بیان ہے۔ اگلے دو مضامین 'کیٹیلر کی ہندوستانی گرامر کے قلمی نسخے' اور 'پانینی اور اس کی اشٹادھیائی' گرامر اور قواعد سے متعلق ہیں ان دونوں کی قواعد نویسی کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب میں تین مضامین 'سید محی الدین قادری زور کا نظریہ آغاز زبان اردو'، 'مسعود حسین خاں کی لسانیاتی تحقیق'، 'گوپی چند نارنگ کی لسانیاتی فکر وبصیرت' ہیں جن میں ان ادیبوں کی لسانیاتی اور نظریاتی تحقیق سے بحث کی ہے۔ ان کے علمی کارناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر ناقدانہ نظر صرف کی ہے اور ان کی لسانیاتی ادبی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر اگلے دو مضامین میں رؤف پاریکھ اور یعقوب میراں مجتہدی کے علمی کارناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا آخری مضمون 'اردو زبان کی تعلیم و تدریس: مسائل اور امکانات' ہے جس میں اردو زبان کی تحصیل اور تدریس پر سائنٹفک طریقے سے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اردو کو مادری اور ثانوی زبان کے طور پر کس طرح سکھائی اور پڑھائی جاسکتی ہے اس کے اصول اور طریقہ کار سے بحث کی ہے۔

علامہ شوق نیموی حیات اور لسانی خدمات

مصنف: ڈاکٹر عبداللہ خان

صفحات: 152، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ثاقب فریدی، 113/18، سیکنڈ فلور، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی

'علامہ شوق نیموی حیات اور لسانی خدمات' ڈاکٹر عبداللہ خان کی تصنیف ہے۔ اس تصنیف میں عبداللہ خان نے شوق نیموی کی حیات اور ان کی لسانی خدمات کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کام کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کتاب کے شروع میں عصر حاضر کے ناقد پروفیسر محمد محفوظ الحسن کے تعارفی کلمات ہیں۔ انھوں نے تعارف میں شوق نیموی سے متعلق اہم باتیں بتائی ہیں۔ ان کا یہ تعارف شوق نیموی سے لگاؤ اور دلچسپی کا اظہار ہے۔ اس کے ذریعے شوق نیموی کی شخصیت کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ تعارف کے بعد عبداللہ خان کا پیش لفظ ہے۔ اس میں انھوں نے کتاب کا پورا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں چھ ابواب ہیں۔ پہلا باب 'علامہ شوق نیموی۔ ایک تعارف' کے عنوان سے ہے۔ کتاب کے اس حصے میں عبداللہ خان نے شوق کی پیدائش، خاندانی حالات و ماحول، ان کی تعلیم و تربیت، شجرہ نسب، بیعت، نکاح اور انتقال کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس کے ذریعے شوق نیموی کی ابتدائی زندگی کی تمام صورت حال سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ پہلے باب میں ہی شوق کی ذاتی زندگی بیان کرنے کے بعد ان کی علمی اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں عبداللہ خان نے شوق کی تمام تصنیفات کا جائزہ لیا ہے اور انفرادی طور پر شوق کی تمام کتب کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا ہے۔ ایک ادیب کے علاوہ شوق ایک بڑے عالم وفاضل بھی تھے۔ آثار السنن، جامع الآثار، جبل المتین، رد السکین، لامع الانوار، وسیلۃ العقبی، تبیان التحقیق اور مقالہ کاملہ وغیرہ شوق کی عبقری شخصیت کی ترجمان ہیں۔ ان کتب کے علاوہ لسان وزبان کے حوالے سے سرمہ تحقیق، ازاحۃ الاغلاط شوق کی اہم کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ خان نے ان تمام کتابوں کے تعلق سے بات کی ہے۔ جس کے ذریعے ان کتب کے موضوعات سے بھی قاری کو واقفیت ہوتی ہے۔ البتہ مصنف نے شوق کی شاعری پر قابل قدر گفتگو نہیں کی ہے۔ شوق کی شاعری کے متعلق مصنف نے اس قدر لکھا ہے کہ لکھنؤ آئے اور وہاں شاعری کی وجہ سے شہرت حاصل کرلی۔ حضرت تسلیم لکھنوی اور حضرت شمشاد لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کی غزل میں دہلی اور لکھنؤ دونوں کا رنگ تھا۔ اور ان کے کلام پر تصوف کا رنگ سب سے گہرا ہے۔

اردو ادب میں شوق نیموی کو ان کی مثنوی 'سوز وگداز' کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے سوز وگداز کے علاوہ بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن ان کی دیگر مثنویاں اس قدر مشہور نہ ہوسکیں۔ مثنوی کے علاوہ شوق غزل گوئی، قصیدہ گوئی، رباعی گوئی اور قطعہ تاریخ وفات میں بھی ماہر ہیں۔ شوق کی غزلیں عاشقانہ ہیں۔ شوق کا دیوان ان کی وفات کے بعد 1326ھ میں مطبع سیدی محلہ گورھٹہ پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ شوق کی غزل کے دو اشعار اس زمانے میں بہت مشہور ہوئے تھے۔ میں انھیں یہاں رقم کرتا ہوں۔

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا   ہو جاو گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

مرے آگے کیا گل کھلائیں گے غنچے مجھے یاد ہے مسکرانا کسی کا

ڈاکٹر عبداللہ خان نے چوتھے باب میں شوق نیموی کی لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے قبل دوسرے باب میں شوق کے عہد کی سماجی، تہذیبی اور ادبی صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے باب میں مصنف نے 'ادب میں تصور زبان' کے موضوع پر مدلل بحث کی ہے۔ مصنف کا اصل مقصد شوق نیموی کے تصور زبان پر گفتگو کرنا تھا لہذا اس سے قبل انھوں نے ادب میں تصور زبان کے عمومی تصورات پر روشنی ڈالی تا کہ شوق نیموی کے تصور زبان کو مختلف آرا کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔اس ضمن میں وہ ''زبان کیا ہے، تصور زبان روایتی طرز فکر، فصیح اور غیر فصیح کا بیان، زبان کا صحیح ہونا، تہذیبی نمائندگی میں شرکت، زبان کا تقابلی تصور جیسے عنوانات قائم کرتے ہیں اور ان عنوانات پر مدلل گفتگو کرتے ہیں۔ چوتھا باب 'حضرت شوق نیموی کا تصور زبان' ہے۔ اصلاح، ایضاح، ازاحۃ الاغلاط اور سرمۂ تحقیق لسانیات پر شوق نیموی کی اہم کتب ہیں۔ مصنف نے اس باب میں پہلے شوق کے تصور زبان پر عمومی بات کی ہے اور اس کے بعد ان کتب پر علاحدہ علاحدہ ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ چوتھا باب تقریبا 30 صفحات پر مشتمل ہے۔ پانچواں باب گزشتہ تمام ابواب کا محاکمہ ہے یعنی گزشتہ ابواب میں کیا باتیں کی گئی ہیں مصنف نے اس باب میں ان کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ چھٹے باب میں شوق کی مشہور مثنوی ''سوز و گداز کا متن پیش کیا گیا ہے۔سوال یہ ہے کہ جب مثنوی 'سوز و گداز کا متن' نمونے کے طور پر پیش کیا گیا تھا تو بہت مناسب ہوتا کہ شوق کے دیوان سے کچھ غزلیں اور قصیدے بھی قارئیں کے ذوق کی تسکین کے واسطے پیش کیے جاتے۔ بہر حال کتاب تقریبا ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی یہی کامیابی ہے کہ اس کے ذریعے شوق نیموی کی شخصیت کا تبحر واضح طور پر سامنے آتا ہے اور ان کی شخصیت کو اس کتاب کے ذریعے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

فکر و آگھی

مصنف: ڈاکٹر جعفر جری

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: جاں نثار معین، سینئر ریسرچ اسکالر

ڈپارٹمنٹ آف ویمنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد)

ڈاکٹر جعفر جری عصر حاضر کے ممتاز محقق اور زبان و ادب کے اسرار و رموز سے آشنا قلمکار ہیں۔ وہ ایک معتبر محقق و ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اتالیق اور مابعد جدید تخلیق کار ہیں۔ان کی تصنیف 'فکر و آگہی' اردو ادب کے متنوع جہات کا مرکب ہے۔ یہ ایک ایسا ادبی و علمی مرقع ہے جس کے مطالعے سے قاری کی علمی انسیت بڑھ جاتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر نوخیز اعظمی کا خیال ہے'ان کی تحریر کی جو خوبی ہے خود ہی قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے، وہ ان کا خلوص، محنت اور ادبی دیانت داری ہے اور یہی چیز ان کی متاع بے بہا بھی ہے اور ان کے روشن مستقبل کی ضمانت بھی لیکن چونکہ انھوں نے اغیار کے ہاتھوں سے سمندر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رفع تشنگی کے لیے خود کنواں کھودنے کو شعار بنایا ہے۔لہذا ان کی کامیابی دیر طلب اور اعصاب شکن یقینی ہے۔

اس سے پیشتر جعفر جری کے متعدد تحقیقی و تنقیدی اور علمی و ادبی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ادبی تحریروں کی باطنی فضا کی وسعت اور کثیر الجہتی کو بڑی صفائی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ پہلے حصے کے مضامین میں 'اردو میں غزل مسلسل... روایت اور فن' طلبہ میں غزل کی فکر و آگہی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیگر مضامین دکنی شاعری کا ماہ تمام اور اردو غزل کا امام... ولی، پنڈت دیا شنکر نسیم اور... 'گلزار نسیم، غبار خاطر... گلزار نسیم، جذبہ حب الوطنی اور... اقبال، دکنی شاعری میں مشترکہ تہذیب کی روایت، اور 'ڈاکٹر عبدالحق کی منفرد انشا پردازی' پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ سرگزشت رفعت صدیقی (یاد رفتگاں کی روشنی میں) خاکہ ہے اور آخر میں ایک انٹرویو افکار شہریار... مصاحبہ کی روشنی میں پر محیط ہے۔

متذکرہ اصناف ادب کے مضامین آج 'فکر و آگہی' کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔ کہنے کو یہ مضامین ہیں لیکن حقیقت میں اردو ادب کی روح ہے کیونکہ مصنف نے اپنے فہم و ادراک اور وسیع النظری سے ہر موضوع کا پوری طرح حق ادا کیا ہے۔ادبی تخلیق کاروں کے مابعد جدید افکار کو اپنی تنقید کے کوزے میں سمویا ہے۔ جو اچھی کاوش ہے۔اُس کا عکس ان کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے''غزل مسلسل ہوتے ہوئے بھی ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے غزل غیر مسلسل سے یکسر مختلف ہے۔ جیسے کہ واضح ہو چکا ہے مطلع، مقطع، ردیف اور قافیے وغیرہ کی مماثلت کے باوجود غزل مسلسل کا پیمانہ غزل غیر مسلسل کے پیمانے سے بہ غایت جدا ہے۔''

جعفر جری کی یہ کتاب موجودہ قاری کے مزاج کے اعتبار سے سہل انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو داں طبقہ کے لیے معاون و مددگار ہے۔

مصنف نے ادب کی متنوع جہات کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ کتاب میں شامل کیا ہے جس میں ایک خاکہ اور انٹرویو بھی منفرد اسلوب سے مزین ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے جدید اردو ادب ہو یا کلاسیکی ہر پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں ادبی اور علمی مضامین ہیں۔

دوسرا حصہ خاکوں اور ملاقات نگاری پر مشتمل ہے۔

مصنف کا انداز تحریر سلیس اور رواں ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات سمجھانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ یہ تصنیف نہایت معلوماتی ہے۔ادبی اصناف پر عالمانہ تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں کم ہیں۔ یہ تصنیف ادبی گوشوں پر ایک نئی فکر کا آغاز کرانے میں کامیاب ہوگی اور امید ہے کہ اردو حلقوں میں اس کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

شاعری

کلیات کاشف

شاعر: مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی، مرتب: اشتیاق احمد قاسمی

صفحات: 352، قیمت: ندارد

ناشر: مکتبہ مجلس قاسم المعارف، دیوبند

مبصر: فاروق اعظم قاسمی، روم نمبر 160، پیریار ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی 110025

حسان بن ثابت سے اقبال تک اور اقبال سے آج تک بے شمار ایسے شاعر پیدا ہوئے جن کی شاعری نے دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا، نسلوں کی تربیت کی اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ میر و غالب اور اقبال و ٹیگور جیسے عظیم شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے فکری اثرات دور اور دیر تک باقی رہتے ہیں۔ان کے علاوہ بہت سے دوسرے اور تیسرے درجے کے بھی غالب و اقبال دنیا میں آئے لیکن اول درجے تک نہ پہنچ سکنے کے باوجود اپنی شاعری سے ایک دنیا کو سیراب کیا۔ایسے ہی گمنام فنکاروں میں ایک قابل ذکر اور لائق قدر نام مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی راجوپوری (1933-1996) کا بھی ہے۔ کاشف صاحب اقبال کے ہم دوش تو نہیں تھے تاہم انھوں نے اقبال کی لفظیات کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکری روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی جس قدر سعی کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔نظم 'اسلامیات پر

ریسرچ' پڑھ کر شمس الرحمٰن فاروقی بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لہجے کی متانت، دین وملت کے لیے دردمندی اور مصرعوں کی چستی، ہر چیز اقبال کی یاد دلاتی ہے اور یہ ایسا نہیں جیسا کہ پہلے زمانے کے کئی شعرا نے کہا تھا کہ اقبال کے بعض الفاظ اور قوافی کو برت کر سمجھا تھا کہ ہم اقبال کے طرز میں کہہ رہے ہیں۔ مولانا کے ان اشعار میں اقبال کے کلام کی روح نظر آتی ہے۔'' (کلیات کاشف، ص:59)

اس خصوصیت کی حامل محض یہی ایک نظم نہیں ہے، ان کا پورا کلیات اس قسم کے کلام سے لبریز ہے۔ کاشف مرحوم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں گرچہ انھوں نے خوب صورت غزلیں اور اچھوتی رباعیات بھی کہی ہیں۔ کاشف مرحوم نے موضوعات ولفظیات اور اسلوبیات کے ساتھ ساتھ عنوانات میں بھی اقبال کا تتبع کیا ہے۔ مثال کے طور پر مومن خدا کے حضور میں، دعوت حق، بندۂ مومن سے، نوائے تازہ، نمائندۂ جمہور، سرِ حیات، فکر مستقبل، حسن وعشق، فرشتہ اور انسان، مرد قلندر، جشن شیطان، فریب زندگی، چانداور چراغ، پھول اور بلبل اور بہ عندلیب چمن وغیرہ لیکن یہ عنوانات نری تقلید کا نمونہ نہیں ہیں۔

ساڑھے تین سو صفحات کا یہ ایک ضخیم کلیات ہے۔ کتاب کے ابتدائی 58 صفحات تأثرات وتقریظات، مقدمے اور احوال شاعر کو محیط ہے۔ اس کے بعد 20 صفحات حمد و نعت کے لیے مختص ہیں۔ 36 صفحات پر 34 غزلیں، 38 صفحات پر مناقب ومراثی، 39 صفحات پر رباعیات درج ہیں اور ایک صفحے پر چند قطعات بھی مندرج ہیں۔ اخیر کے سات صفحات میں چند کتابوں اور اداروں کا اشتہار بھی شامل کیا گیا ہے۔ لغوی تشریح وتوضیح کے ساتھ آٹھ صفحات میں ترانۂ دارالعلوم دیوبند کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ ترانہ شاہکار ہے لیکن 'کلیات کاشف' کے لحاظ سے یہاں پر اس کا ذکر بے محل ہے۔ اخیر کے 36 صفحات پر مشتمل کلیات میں مذکور مشکل الفاظ کی جو فرہنگ مرتب کی گئی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔

99 صفحات پر کل 92 نظمیں شامل کلیات ہیں۔ کتاب کا یہی نظمیہ حصہ اس کی جان ہے۔ کاشف مرحوم دیوبند کے ان ممتاز فرزندوں میں ہیں جن کے یہاں علم وادب کی کئی جہات روشن ہیں۔ وہ ایک ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، صحافی اور بہترین خطاط ہونے کے ساتھ ایک منفرد لب ولہجے کے پیامی شاعر بھی ہیں اور بیسویں صدی کے استاد شاعروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسوس کہ سماج اپنے بہت سے علمی دفینوں سے محرومی کے ساتھ ایک عظیم شاعر کے علم وفن سے بھی اب تک محروم تھا۔ اللہ بھلا کرے مولانا ریاست علی ظفر بجنوری صاحب کا اور مرتب کلیات مولانا اشتیاق احمد قاسمی کا کہ انھوں نے اہل ذوق کے لیے ایک بیش قیمت خزانے کی دریافت کی اور اس سے مستفید ہونے کی راہ ہموار کی۔

شاعری کو سمجھنے اور اس پر گفتگو کرنے کے لیے فہم شعر کی قوت اور عمدہ ذوق درکار ہوتا ہے اور اگر کسی شعری سرمایے کی تدوین کا مرحلہ ہو تو پھر اس وسیلے کی ضرورت مزید دو چند ہو جاتی ہے۔ لیکن تدوینی مرحلے میں اگر کسی کہنہ مشق استاد شاعر کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے تو پھر 'کلیات کاشف' جیسی شاہکار کتاب وجود پذیر ہوتی ہے۔

پیامی شاعر ہونے کے اعتبار سے کاشف الہاشمی اقبال کے بالکل ہم قدم ہیں لیکن یہ ہم قدمی کہیں پیوند محسوس نہیں ہوتی۔ کاشف صاحب کے اس رویے کو بجائے تقلید کے توسیع کا نام دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کاشف الہاشمی نے فلسفۂ زندگی کو مختلف طرز وانداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار:

صورتِ نغمہ، کمالِ زیر و بم ہے زندگی   کیف وکم ہے، بندغم ہے، موج یم ہے زندگی
زندگی کا ماحصل اک نالۂ خاموش ہے   ظلمتِ امروز، آئینہ نمائے دوش ہے
حسنِ عالم تاب کا نقش اثر ہے زندگی   انجمن میں سوز تابانِ جگر ہے زندگی

'اپنا مقام'، 'فکر مستقبل' اور 'فکر معاش' وغیرہ نظموں میں حال اس طرح زندہ ومتحرک ہے کہ یہ نظمیں چالیس پچاس سال قبل کی نہیں بلکہ آج اور اب کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔

شاعر نے مغربی تہذیب کے چہرے سے بھی منافقت کا غازہ بڑی خوب صورتی سے ہٹایا ہے۔

دیو تہذیبِ نوی کا زندگی پر خندہ زن   زندگی تہذیب کے عشرت کدے میں نوحہ گر

شاعر کے یہاں مناظر فطرت کی تصویر کشی بھی دیدنی ہے۔

اک داستاں چھپی ہے پھولوں کی خامشی میں   رودادِ غم لکھی ہے تاروں کی روشنی میں
موجوں سے کہہ رہی ہے ساحل کی بردباری   گوہر نہ ٹوٹ جائے اتنی بلاکشی میں

شاعر نے اقبال کے بشمول بہت سے اساتذۂ فن میر و غالب، سراج اورنگ آبادی، اور حالی وغیرہ کی زمین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کاشف الہاشمی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بسا اوقات اپنی نظموں کا آخری شعر فارسی میں کہتے ہیں مثلاً: مومن خدا کے حضور میں، رمز دل بیتاب، تصویر حیات، خودشناسی، حسن وعشق، عصر حاضر، حقیقت سفر، سماع، لب جو اور جواب مکتوب وغیرہ کا آخری شعر فارسی زبان میں ہے۔ اسی طرح بہت سی نظموں کے عنوانات قرآنی آیات ہوتے ہیں۔ جیسے 'اکفرتم بعد ایمانکم' اور 'ربنا ما خلقت ھذا باطلا'۔ بہت سی نظموں کا اسلوب مکالماتی اور ڈرامائی بھی ہے۔ 'پھول اور بلبل' میں ہمیں پہاڑ اور گلہری جیسا مکالماتی اسلوب ملتا ہے اور 'غروب آفتاب' کو اگر نثری جامہ پہنا دیا جائے تو وہ ایک بہترین ڈراما بن سکتا ہے۔

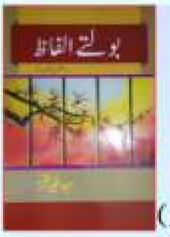

بولتے الفاظ

شاعر: ابوالخیر نشتر
صفحات: 160، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: تسیم احمد تسیم، کالی باغ، نزد میر شکار ٹولی مسجد، بتیا 845438 (بہار)

ابوالخیر نشتر اردو کے سینئر اور استاذ شاعر ہیں۔ انھیں یکساں طور پر غزلیہ اور نظمیہ شاعری پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے پچاس سالہ شعری شعر کے دوران کئی ادبی رجحانات وتجربات کو دیکھا ہے۔ لیکن انھوں نے جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی، آج بھی وہ اسی پر قائم ودائم ہیں۔ نشتر موضوعات پر فن کو اولیت دیتے ہیں کیونکہ ملکی اور بین الاقوامی احوال وکوائف سے واقف ہونا قدرے آسان ہوتا ہے لیکن انھیں فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ شعری جامہ پہنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی خامیوں اور کمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں یا قطعات، ہر جگہ ان کا مخصوص لہجہ اور اسلوب قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

'بولتے الفاظ' ابوالخیر نشتر کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کے دو مجموعے الفاظ کی خوشبو (1986) اور لفظ لفظ آئینہ (2010) منظر عام پر آچکے ہیں اور قارئین کے خاص حلقے سے اپنا بھرپور خراج بھی حاصل کر چکے ہیں۔ تازہ مجموعہ 'بولتے الفاظ' ان کی نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے اس میں ہر مقام پر اپنے مخصوص تیور اور طنطنہ کے ساتھ اپنے عہد کے تمام کیف وکم کو کمال خوبی کے ساتھ اجاگر کر دیا ہے۔ شاعر کے یہاں اکثر مقام پر عہد موجود کی بے حسی، بے غیرتی اور ظالمانہ وجابرانہ سوچ کے خلاف زبردست احتجاجی لے سنائی دیتی ہے مگر اس کا احتجاج اس کے فن اور شعری محاسن پر کہیں بھی غالب نہیں ہونے پاتا۔ اس ضمن میں نظموں کے چند حصے ملاحظہ کریں:

میں نے دیکھا/ خونچکاں منظر/ خلا کی اوٹ سے/ ذہن کی دہلیز پر
رقصاں ہے مرے/ ایک سوال/ کون ہے اس شہر کا خالق؟/
بتا...... اے وقت کے تازہ خدا...... (ایک سوال)

جہاں علم وفن/ فکر وسخن میں/ اسی کی شہرتیں ہیں/ وہی فنکار....../

چہرے پر کئی چہرے لگائے/ حصارِ ذات کو سورج بنائے
لہو انسانیت کا چاٹتا ہے/ اندھیرا ہی اندھیرا بانٹتا ہے (وہی فنکار)

دنیا کے بے تاج خداؤ/ محلوں سے اب باہر آؤ/ پتھر دل یہ راز بتاؤ
ان کا مقدر خنداں کیوں ہے؟/ ایوانوں میں زنداں کیوں ہیں؟ (مزدور کا مقدر)

مندرجہ بالا نظموں کے ان حصوں سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر نہ صرف اپنے عہد کے خود ساختہ خداؤں سے نالاں ہے بلکہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنا خاص ہدف بناتا ہے جو بے حسی کی موٹی ردا اوڑھ کر پڑے ہوئے ہیں انسانیت کی پامالی اور ظلم و بربریت کی بحالی اس عہد کا بڑا المیہ ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرنا ازحد لازمی تھا، اور شاعر نے یہاں ایک ذمے دار شاعر اور شہری کی حیثیت سے اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔

اب اخیر میں غزلوں کے چند اشعار دیکھیں:

ہم سفر ہے عتاب سورج کا	دشت میں دور تک شجر ہی نہیں
چہرے پہ کئی داغ لیے گھوم رہا ہے	اُس شخص کو آئینہ دکھا کیوں نہیں دیتے
ابھی جھوٹ ہے سچ پہ غالب جہاں میں	صداقت یہاں شہریاروں میں گم ہے
یہ خود فریب تصنع تجھے مٹا دے گا	قلم کو تلخ حقائق سے آشنا رکھنا
تمام عمر کئی پاس کے جزیروں میں	وہ لکھ رہا ہے مری داستان پانی پر

ابوالخیر نشتر کے ان غزلیہ اشعار میں بھی وہی نظموں والا لہجہ برقرار ہے۔ وہ عہد موجود کی سنگینی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ ان اشخاص کو آئینہ دکھانا چاہتے ہیں جو بظاہر سفید پوش اور باکردار بنے پھرتے ہیں، لیکن اصل میں وہ بہت بڑے سیاہ کار اور ظالم و جابر ہیں۔ 'بولتے الفاظ' میں شاعر نے ...... قطعات بھی شامل کیے ہیں۔ یہ قطعات ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی شخصی قطعات بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ابوالخیر نشتر کا یہ مجموعہ ادب کے جانکاروں اور فنکاروں کے درمیان پذیرائی حاصل کرے گا۔ کتاب دیدہ زیب اور قیمت مناسب ہے۔

حرف و نوا

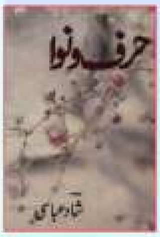

مصنف: شاد عباسی
صفحات: 220، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: مصنف
مبصر: ماسٹر نثار احمد، 413 مین روڈ
نئی کردم پوری، شاہدرہ، دہلی 96

جب کوئی ادب پارہ سامنے آتا ہے تو ایک نئی فکر نئی سوچ سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ شاعر اور شاعر کے اردگرد کا منظر پس منظر پڑھ کر اور سمجھ کر ادبی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعری کی شکل میں ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملتی ہے جس میں رنگارنگی تخیلاتی موضوعات و مفاہیم سے لطف اندوز ہو کر قاری کھٹے میٹھے تجربات سے گزرتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ہر ادب پارہ کچھ نہ کچھ تاثر ضرور چھوڑتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی مکمل ہے اور نہ کوئی تخلیق یا ادب پارہ پوری طرح نقص سے پاک ہے۔ لیکن ہم اس بات کے قائل ہیں کہ اچھی باتیں لے لی جائیں اور برائی کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہ کسی بھی تخلیقات سے استفادے کے لیے ضروری ہے ورنہ آپ برائی میں الجھ کر رہ جائیں گے اور آپ کو کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا۔ اور یہ صرف ادب کا مسئلہ نہیں بلکہ زندگی کا ضابطہ ہے۔ رہا تحقیق و تنقید کا مسئلہ وہ ایک علیحدہ چیز ہے جو جوہر شناسی سے عبارت ہے۔

فی الوقت ہمارے سامنے بزرگ شاعر جناب شاد عباسی کا شعری مجموعہ حرف و نوا ہے جو ان کی غزلوں اور نظموں کا غالباً چھٹا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے موصوف کے لفظ بہ لفظ، سفینۂ غزل، بات غزل کی، غزلوں کے مجموعے، نوائے فاراں، نعت و منقبت، بکھرے موتی غزلیں نظمیں اور قطعات اور اسی طرح پانچ نثری کاوش منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے علاوہ تین نثری کاوش غیر مطبوعہ ہیں۔ ویسے حرف و نوا میں بھی نظمیں اور آزاد نظمیں و قطعات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے اور 97 غزلیات اس میں شامل ہیں۔ البتہ نعت کے حوالے سے آپ نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور صرف ایک نعت پر ہی اکتفا ہے۔ وہ بھی شاید روایتاً اور برکتاً۔

آپ شاعری کے علاوہ نثر نگاری بھی خوب کرتے ہیں جس کا محور زیادہ تر اپنے اردگرد کی منظرکشی ہوتا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ویسے آپ عمر کے جس پڑاؤ پر ہیں یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ خیالات و ادراک میں بھی پختگی آتی ہے اور یہ چیز شاعر اور قلم کار کے یہاں اور بھی زیادہ ملتی ہے۔ جن اذہان کو غور و فکر کی عادت نہیں ہوتی وہ تخلیقی ذہن نہیں ہوتے۔ فی زمانہ شاعری جس سمت میں محوِ سفر نظر آتی ہے وہ گرد و پیش کی منظرکشی اور عکاسی ہے یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

جرم قانون کی دفعات غلط لکھتا ہے	سب گواہوں کے بیانات غلط لکھتا ہے
اپنی گستاخی کی تہمت پہ صفائی کیا دوں	جرم کے وقت مقامات غلط لکھتا ہے

بدلتے وقت اور حالات کے تناظر میں یہ بھی دیکھیں:

محفل بدل گئی ہے رستہ بدل گیا	اس دل میں بن رہا تھا جو نقشہ بدل گیا
بے چینیوں کی بس گئیں ہر سمت بستیاں	شہر خیال پہلے سے کتنا بدل گیا

روایات کی پاسداری اور خودشناسی کا عکس بھی شاد عباسی کی شاعری میں ملتا ہے اور آپ کی نظر اس کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنا کر محفوظ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ روزِ ازل ہی سے انسانی قالب میں انسانیت کے خلاف کام کرنے والوں کی کمی نہیں رہی ہے اور انسانیت ہمیشہ ایسی طاقتوں کے نشانے پر رہی ہے۔ لیکن بہرحال جیت ہمیشہ سچائی کی ہوتی ہے اور سچائی جن کے ساتھ ہوتی ہے وہ ایک نہ ایک دن سرخرو ضرور ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان کے اندر خود احتسابی بھی ہو:

اونچی لہروں سے ہم نہیں خائف	ٹوٹی کشتی ہے ناخدا ہم ہیں

نثری اعتبار سے بھی آپ نے اپنے اردگرد کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیا ہے اور اس کو بھی ایک ذخیرے کے طور پر آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف برادریاں اور ان میں پائی جانے والی رسومات پر آپ کی گہری نظر ہے۔

اپنے اطراف کے شعراء سے متعارف کرانے کا کام آپ نے کیا یہ بڑا کام ہے۔ بچوں پر بھی آپ نے کام کیا ہے اور یہ سب عدیم الفرصتی، اور مصروفیات کے باوجود انجام دیا ہے۔ باوجود اس کے سفر جاری ہے۔ شاد صاحب کا یہ سفر کب تک جاری رہتا ہے اور کس کس شکل میں اپنی کوشش و کاوش سے ادب کو کیا دیتے ہیں انتظار کیجیے۔

فکشن

پرانے کپڑوں کا سودا گر

مصنف: عبدالمتین جامی
صفحات: 160، قیمت: 160، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A، تیسری منزل، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

اردو کے شعری و ادبی منظر نامے پر عبدالمتین جامی ایک متنوع اور ہمہ جہت شخصیت کے طور ابھرے۔ متنوع اور ہمہ جہت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف صنف افسانہ ہی میں

نہیں بلکہ ناول، رباعی، غزل، آزاد غزل، غزل نما، منظوم تمثیل، فن ترجمہ نگاری کے علاوہ شعور تنقید، معلومات عامہ اور سائنسی و مذہبی موضوعات سے متعلق بیش بہا مضامین تحریر کیے جن کا تفصیلی ذکر سعید رحمانی نے پیش لفظ اور پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنے مضمون 'عبدالمتین جامی ایک ہمہ جہت شخصیت' میں کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'پرانے کپڑوں کا سوداگر' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی کے ذریعے منظر عام پر آیا جس میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ہر افسانہ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ روایتی بھی ہیں اور جدت پسند بھی۔ کیونکہ ان میں دونوں طرح کے افسانے پائے جاتے ہیں۔ کچھ افسانے ایسے ہیں جو جدیدیت سے خاصا متاثر نظر آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن میں ترقی پسندی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کی قرأت سے عبدالمتین جامی کی تخلیقی ہنرمندی، فن پر عبور، آرٹ اور کرافٹ پر گرفت، زبان و بیان پر قدرت، پیش کش کا انداز انتہائی موثر، موضوعات میں یک رنگی کے بجائے تنوع، وحدت تاثر، زمان و مکاں کی قید سے آزاد، سماج اور معاشرے کا درد و کرب، زوال پذیر معاشرے کی صورت حال، زمیندارانہ نظام کا کرب، صنعت کاری کے فروغ اور انڈسٹری کے قیام سے دیہات اور دیہی معاشرے کی معیشت کی تباہ کاری اور اس کے زوال پذیری کی داستان، انسانوں سے زیادہ پالتو جانوروں سے محبت، لگاؤ اور ہمدردی کا اظہار، ازدواجی زندگی کی صورت حال، ناکارہ، بے راہ روی اور دن میں کروڑ پتی بننے کا خواب دیکھنے والی نئی نسل کی بے راہ روی اور پیسے کمانے کے شارٹ کٹ کی مسلسل کوشش، طوائف کی نفسیاتی کیفیت، جسم فروشی میں ملوث طوائف کی کایا پلٹ وغیرہ موضوعات کو بالترتیب اپنے افسانوں پرانے کپڑوں کا سوداگر، ٹیڑھی لکیر، خواب ادھورے رہ گئے، انتقام، بادل چھٹ گئے، سراب، پہیلی اور رنڈی وغیرہ افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام افسانوں کو پڑھتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ تخلیق کار نے ان تمام موضوعات کو عصری حسیت سے جوڑ کر اس کے محاسن و معائب کو پیش کیا ہے۔ اور جس طرح کی صورت حال ہوتی جارہی ہے ان افسانوں کو پڑھ کر بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ افسانوں کے علاوہ کچھ افسانے ایسے ہیں جو جدیدیت کے زیر اثر تحریر کیے گئے ہیں۔ ایسے افسانوں میں بکریوں کا جلوس، گرد آلود حروف، خودکشی، جمن کی لاٹھی، چوکیدار اور دستک وغیرہ اہم ہیں جن میں جدیدیت کا رنگ و آہنگ تو ہے لیکن تجریدیت کے شکار نہیں ہیں۔ اس میں دوراز کار تشبیہات و استعارات اور دیگر رموز و علائم سے بہت حد تک پاک ہیں جو افہام و تفہیم میں سد راہ بنتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے قاری کے اندر ایک طرح کی بے چینی کی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ بے چینی اس لیے ہوتی ہے کہانی ختم ہونے کے بعد دوسری کہانی قاری کے ذہن میں چلنے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی وہ خوبی ہے جو ایک منجھے ہوئے تخلیق کار کی اہم شناخت ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل آخر کے کچھ افسانے مثلاً بھوتنی کی رخصتی، اجنبی ایشور، قلمی دوست، بدلتے رشتے اور دو سو روپے وغیرہ ایسے ہیں جن پر ترجمہ کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے زبان کی سلاست اور روانی جو دوسرے افسانوں میں ہے وہ آخر والے افسانوں میں نہیں ہے۔ البتہ ان افسانوں میں انسان کے داخلی احساسات اور خارجی مشاہدات کو بہت ہی موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے Readable ہیں۔ یہ مجموعہ صرف عصری مسائل یا تمثیلی حقائق کو جاننے کے لیے ہی نہیں بلکہ عبدالمتین جامی کی تخلیقی ہنرمندی، فکری تنوع، مثبت زاویہ فکر اور سماجی و معاشرتی نقطہ نظر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے پڑھا جانا چاہیے۔ یہ مجموعہ ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ ٹائٹل سادہ مگر دیدہ زیب ہے۔ طباعت بہتر ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

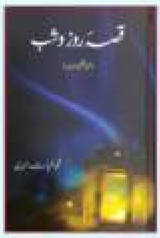

قصۂ روز و شب

مصنف: محمد غیاث الدین

صفحات: 248، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سیم الدین خلیل الدین صدیقی ریسرچ اسکالر

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد (دکن)

زیر تبصرہ کتاب مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے، جس میں سولہ افسانے شامل رعایتی ٹکٹ، ڈائننگ ہال، فلیٹ پارٹنر، نیا ادیب، زور و بیان، تلفظ صدیقی، شہری عید، رہائش جو، علامت شناسی، طائر زریں، چین کارڈ، چودہ طبق، پشیماں پشیماں، وطن عزیز، محفل خلوت اور غبارۂ قوم ہیں۔ البتہ یہاں ہر افسانے پر تفصیلی بحث کرنا مناسب نہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے تمام افسانے اپنے موجودہ دور کے عکاس ہیں ان میں تسلسل، پلاٹ، کردار، زماں و مکاں، مختصر کردار، اور اس میں ایک طرح کا تاثر بھی نمایاں ہے۔

رعایتی ٹکٹ، فلیٹ پارٹنر، رہائش جو، وطن عزیز اور 'غبارۂ قوم' ایسے افسانے ہیں جس میں موجودہ معاشرے کی شہری و دیہی بدحالی اور رہائشی علاقوں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی جیسے متعدد مسائل کی عکاسی ان افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

'فلیٹ پارٹنر' اور 'رہائش جو' یہ ایسے افسانے ہیں جس میں شہروں میں رہنے کے لیے کرائے کے مکان تلاش کرنے کے لیے جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اور جب گھر مل جاتا ہے تو کرائے دار کو دیگر کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا تذکرہ ان افسانوں میں دکھائی دیتا ہے، جس سے قاری بخوبی واقف ہوتا ہے کہ مسائل فلیٹ ملنے پر ختم نہیں ہوتے بلکہ اصل میں وہاں سے ہی شروع ہوتے ہیں، 'وطن عزیز' اور 'غبارۂ قوم' ایسے افسانے ہیں جن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان بھلے ہی کتنی ترقی کیوں نہ کرلے اسے اپنا وطن عزیز ہوتا ہے وہاں کے لوگ عزیز ہوتے ہیں بھلے ہی وہاں اس نے کتنے ہی داغ جھیلے ہیں۔ سچ میں ان کا وطن عزیز وطن ہے۔ 'غبارۂ قوم' بلا شبہ قوم کا غبار ہے جو ہر سماج کا مسئلہ ہے، جس میں افسانہ نگار ہمیں پہلے تو مشہور تاریخی شہر اورنگ آباد کی سیر و تفریح کراتا ہے پھر ایک ایسے شخص سے متعارف کرواتا جو اپنی ہی لاپروائی کا خود شکار ہوتا ہے اور اس کا ذمے دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ لڑائی جھگڑے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ڈائننگ ہال، شہری عید اور 'چودہ طبق' ایسے افسانے ہیں جس میں شہری مسائل و تہذیب کی دردانگیز جھلکیاں دکھائی دیتی ہے، 'ڈائننگ ہال' ایسا افسانہ ہے جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے ہاسٹل میں رہنے والے طلباء و طالبات کے میس میں کھانا کھانے کے متعلق ایک طنزیہ کہانی ہے جس میں طلباء ایسا کھانا کھاتے ہیں جو بے لطف، بے مزہ، بے ذائقہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی وہ خاموشی اختیار کرتے ہیں جب وہ ڈائننگ ہال کے مالک سے شکایت کرتے ہیں تو وہ انھیں جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہیں دیتا، اور اس کی تسلی سے یہ امید لگا دیتے ہیں کہ کل کاش اچھا کھانا کھانے کو ملے لیکن کوئی امید بر نہیں آتی۔

'شہری عید' شہر کے ماحول اور اس ماحول پر طنز ہے جہاں لوگ سوئیاں بنانے کے بجائے چھوٹے کھلا کر عید ملنے آئے لوگوں کو روانہ کر دیتے ہیں گلے لگ کر ملنا اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینا تو دور کی بات ہے، سیدھے منھ سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ 'شہری عید' ایک تقابلی کہانی ہے، جس میں گاؤں اور شہری عید کا موازنہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔

'چودہ طبق' عنوان افسانہ نگار نے منٹو کے افسانے 'بڑھے کھلنے' سے اخذ کیا ہے، جس میں ازدواجی زندگی کے رومانی لمحات کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ایک 30 سالہ جوان کی جنسی بے چینی کا اظہار ہے جس کو افسانہ نگار نے بہترین انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی خواہش کے تئیں بازار حسن کی سیر کرتا ہے۔ لیکن وہاں اسے یہ تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے

کہ انسان کو شہوانی راستے پر چلنے سے صرف وقت اور روپیوں کا ہی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

نیا ادیب، زور و بیان، تلفظ صدیقی، علامت شناسی، طائر زریں اور 'پشیماں پشیماں' ایسے افسانے ہیں جن کا مقصد نوجوان نسل کو متحرک کرنا ہے، دی گئی فہرست میں سے اگر ہم 'طائر زریں' کو الگ کرتے ہیں تو ان تمام افسانوں کے بنیادی موضوع و مقصد نوجوان طلبا، جیسے ریسرچ اسکالر کے لیے زبان و بیان کے ساتھ تلفظ کی صحیح معلومات فراہم کرنا ہے، یہ افسانے ہمیں تاریک دنیا سے روشن دنیا تک لانے کا کام انجام دیتے ہیں، ان افسانوں سے افسانہ نگار کا مقصد سماجی، سیاسی، نفسیاتی، تعلیمی، اور معاشراتی اصلاح کرنا ہے۔ لہٰذا 'طائر زریں' ایجوکیشن کے کھوکھلے پن کو علامتی طور پر بیان کرنے کی جامع کوشش ہے۔ افسانے میں فنکار نے تعلیمی انتظامیہ پر روشنی ڈالی ہے کہ آج کی ایجوکیشن میں ڈی ایڈ اور بی ایڈ، کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں بے روزگار ہو گیا ہے اور جو لوگ لاکھوں روپئے دے کر کام کر رہے ہیں انھیں کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

'تلفظ صدیقی' میں الفاظ کا صحیح استعمال کرنے کے لیے تاکید کی گئی ہے تو 'پشیماں پشیماں' میں ایک طالب علم کی بداخلاقی کو موضوع بنایا گیا ہے، افسانہ 'نیا ادیب' میں فلسفیانہ نقطۂ نظر ملتا ہے، جس میں شعور کی رو کی تکنیک کی بھی کچھ جھلک ملتی ہے۔

'علامت شناسی' بلاشبہ علامت شناس افسانہ ہے۔ 'پین کارڈ' موجودہ دور میں کس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اگر یہ کسی سفر میں کسی انسان کے پاس نہ ہو تو وہ کس طرح کے مسائل میں الجھ جاتا ہے اس کی کتنی اہمیت و ضرورت ہے، اس کا اندازہ ہمیں اس افسانے میں ہوتا ہے۔ 'محفل خلوت' بھی نمایاں افسانوں میں سے ایک ہے، جس میں شہباز اور پرتیش کی محبت کا المیہ اس افسانے میں فنکار نے پیش کیا ہے، نیز محبت پر فلسفیانہ طرز کا اظہار بڑے ہی دلکش، انداز میں دکھائی دیتا ہے۔

غرض یہ کہ اس افسانوی مجموعہ 'قصہ روز و شب' میں کئی روز اور کئی شب پنہاں ہیں جس نے تمام قارئین کے لیے نئی راہیں ہموار کر دی ہیں جس سے قاری بیک وقت کئی مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔

مضامین

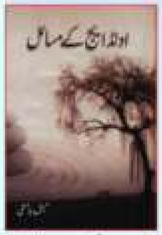

اولڈ ایج کے مسائل

مصنف: سہیل جامعی

صفحات: 128، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: بک کارپوریشن، دہلی

مبصر: اسعد اللہ، 1444/45، فیاض گنج، آزاد مارکیٹ، دہلی 6

زیر تبصرہ کتاب 'اولڈ ایج کے مسائل' سہیل جامعی کی بڑھاپے کی زندگی سے متعلق نہایت ہی مفید اور دلچسپ کتاب ہے جس میں انھوں نے بتیس ذیلی عنوان کے تحت اچھی بحث کی ہے۔ ایک طرف یہ کتاب بڑھاپے میں آنے والے مسائل کا احاطہ کرتی ہے تو دوسری طرف ترغیب بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ زندگی کے تینوں زمانوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بڑھاپے میں خود کو غیر ضروری ہستی ہونے کی سوچ کو حاوی ہونے نہ دیں، زندگی چلتے رہنے کا نام ہے۔ اپنے پسندیدہ شوق کو جگائیں۔ آگے بڑھیں کیا پتہ یہ شوق آپ کی زندگی کے اس پڑاؤ میں نئی پہچان دے جائے۔'' پھر انھوں نے اس ضمن میں دو مثالیں پیش کی ہیں کہ کس طرح آٹھ بار میراتھن میں حصہ لے چکے ہندوستانی کسان فوجی سنگھ نے 102 سال کی عمر میں 2013 میں ریٹائرمنٹ لیا۔ 'بدلتے وقت کے ساتھ تھوڑا آپ بھی بدلیں' اس عنوان کے تحت سماجیاتی مطالعے کے ساتھ جن شقوں پر بحث کی ہے وہ ہے 'سوچ میں تبدیلی' بہنوں کو حق دینا، بڑھاپے میں خود پر انحصار، بڑھاپے میں خوشیوں کے لیے تیاری۔ 'خاندان سے باہر کی دنیا' کے متعلق رقمطراز ہیں: ''بزرگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی فیملی سے نکل کر اپنے دوستوں کی ایک دنیا بنائیں۔ اپنے ہم عمر، ہم مزاج لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا شروع کریں۔ مزید اس طرح کے تعینات کے بعد لکھتے ہیں'' اس طرح سے خود کو مصروف رکھیں گے تو آپ کو بڑھاپا بوجھ محسوس نہیں ہوگا اور آپ کا بڑھاپا خوشیوں بھرا گزر جائے گا۔'' اسی طرح بڑھاپے کی زندگی میں سماجی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تبدیلی انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اس لیے ہمیشہ یاد رہے کہ نئی شروعات کی کوئی عمر متعین نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ نئی نسل کی تربیت سازی کی جائے اور اپنے علم و تجربے سے اس نئی نسل کو فائدہ پہنچایا جائے، اور سماجی کاموں میں خود کو مصروف رکھا جائے۔ اگر ایسا کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے تو اس سے نہ صرف خود کو فائدہ پہنچے گا بلکہ آپ کی عمر پر بڑھاپے کا اثر بھی نہیں آئے گا۔

''تکنیک سے دوستی ....بزرگوں کے لیے فائدہ مند ہے'' اس ضمن میں قابل مصنف لکھتے ہیں۔'' اپنے مطابق اسمارٹ فون چنیں، آپ گھر بیٹھے اپنے فون، پانی اور بجلی کا بل جمع کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے بجٹ کے مطابق ایک اسمارٹ فون چنیں اور اس فون سے آپ لوگوں سے بات چیت کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' آگے لکھتے ہیں'' آپ ٹچ اسکرین (Touch Screen) کے بجائے عام کی پیڈ (Keypad) والا فون چنیں، وہ ایسا ہو جس میں بٹن بڑے سائز کے ہوں اس سے آپ کو فون آپریٹ کرنے میں سہولت ہوگی۔ 'لمبی عمر کی.....' اس مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ ''انسان کو اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی فکر نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ خود کو کم عمر ہی محسوس کرنا چاہیے اس سے نہ صرف ہم خود کو تر و تازہ محسوس کریں گے بلکہ خود کو نوجوان سمجھنا لمبی زندگی جینے میں معاون ہوتی ہے۔'' آگے لکھتے ہیں کہ ''صبح کا ناشتہ راجہ کی طرح کرنا چاہیے، دوپہر کا کھانا عام آدمی کی طرح اور رات کو ایک بھوکے آدمی کی طرح۔ یہ وہ عادت ہے جس سے آپ لمبی عمر پا سکتے ہیں۔ اس سے جسم بیماریوں کو روکنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔'' 'اولڈ ایج میں سائیکل چلانے کے فوائد' اس مضمون میں مصنف نے 'پیکو' فلم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ'' اپنے شہر کی جانی مانی گلیوں میں عرصہ بعد سائیکل سے گھومتے ہوئے اس بزرگ (امیتابھ بچن) کے چہرے پر بکھری خوشی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ اس موضوع کو دکھانے کے لیے سائیکل نے ایک بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ جبکہ اصل زندگی میں کوپن ہیگن کے ستانوے سالہ بزرگ کلاڈ تھم کی مثال دی گئی ہے جنھوں نے پچھلے اسّی سال میں شہر میں کہیں بھی جانے کے لیے سواری کے طور پر سائیکل ہی کا استعمال کیا ہے۔ مزید آگے لکھتے ہیں'' سائیکل چلانے سے دل مضبوط ہوتا ہے، پھیپھڑے میں کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، خون کا دوران یکساں بنا رہتا ہے، جسم اور پٹھوں کی مساج ہوتی ہے اور ساتھ ہی ذہنی تناؤ اور ڈپریشن کو کم کرتی ہے۔''

'سردیوں میں چہت اور بڑھاپا، عمر کے ساتھ مصروفیت بڑھائیں، نیک ہو کر زندگی آسان بنائیں، اکیلے پن کا احساس، اپنے دماغ کو ذہنی کاموں کے ذریعہ درست رکھیں، خوشی اور روحانیت کو اپنی زندگی میں شامل کریں، جاڑوں کے موسم میں کس طرح سے درد سے راحت پائیں، بزرگ بن سکتے ہیں ترقی کی راہ، ڈرائیونگ سے بنا رہے گا جسمانی اور دماغی توازن، ڈیمنشیا کی پہچان وقت پر ضروری، کچھ قدم سکون بھرے بڑھاپے کے لیے'' ایسے عناوین ہیں جن کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے تاہم ایک مبصر کے لیے اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ تمام پہلوؤں پر بحث کر سکے۔ آخر میں مصنف نے ایک بہت ہی اہم بحث پر کتاب کو مکمل کیا ہے وہ ہے 'اپارٹمنٹ لائف' اس مضمون میں ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے جو نہایت ہی دلچسپ مگر دلدوز ہے۔ ورما جی سے مخاطب ہوتے ہوئے

مصنف نے کئی گھرانوں کو اپنے قلم کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جہاں بڑے بزرگوں کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے اور انھیں اس عمر میں بجائے آرام کے مزید تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

آخر میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں کہ بڑھاپا بذات خود اپنے آپ میں کوئی معمہ نہیں بلکہ فطری طور پر اس مرحلے تک ہر شخص پہنچتا ہے جسے قدرت پہونچانا چاہے۔ تاہم کچھ حکمت عملی ہے جس کو اپنا کر ہم اس عمر میں بھی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اس قبیل کی تمام باتوں، گذارشات، حکمت عملیاں، تدابیر سے یہ کتاب عبارت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب پر بہترین سے بہترین تبصرے اور مضامین تحریر کیے جائیں گے اور کتاب اس لائق ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے تاکہ آنے والے وقتوں کے لیے ہم ذہنی طور پر تیار رہیں۔ اور بوڑھاپے کو بھی ایک خوب صورت مگر لائق تقلید زندگی میں تبدیل کر سکیں یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم وقت کی رفتار کے ساتھ خود کو ڈھالنا سیکھ لیں۔

دیدبان (جلد:1)

مرتبین: سیمین علی، سلمیٰ جیلانی، نسترن احسن فتیحی

صفحات: 420، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی

نئی ٹیکنالوجی نے اردو اخبارات و رسائل کے دائرے کو وسعت بخشی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے اب رسائل و جرائد کی رسائی ان علاقوں تک بھی ہونے لگی ہے جہاں تک پہنچنے کا پہلے تصور محال تھا۔ سوشل میڈیا کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی منٹ میں رسالہ یا اخبار لاکھوں لوگوں تک پہنچ جاتا ہے اس کا منفی اثر اب پرنٹ میڈیا پر پڑنے لگا ہے۔ کیونکہ مطبوعہ اخبارات یا رسائل کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے اور ہر جگہ اس کی موجودگی بھی نہیں ہو پاتی۔ جبکہ آن لائن اخبارات اور رسائل دنیا کے کسی بھی کونے میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو میں آن لائن ادبی جریدوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ جریدے نہ صرف اہم ادبی مباحث اور مسائل کو اپنے دامن میں جگہ دیتے ہیں بلکہ قاری سے مکالمے کی ایک ایسی صورت بھی پیدا کر رہے ہیں جس سے ادبی جمود ٹوٹ رہا ہے اور تحرک کی ایک معنی خیز فضا قائم ہو رہی ہے۔ یہ آن لائن جریدے ساری سرحدوں کو توڑ کر مختلف ملکوں اور گوشوں کے لوگوں کو ایک ایسے ادب جہان سے جوڑ رہے ہیں جس میں تنوع ہے اور تازگی بھی۔

'دیدبان' بھی ایک آن لائن ادبی جریدہ ہے جس نے مختصر عرصہ میں مقبولیت کی نئی منزلیں طے کی ہیں۔ اس کے آن لائن کئی شمارے شائع ہو چکے ہیں اور شائقین اسے ایک نئے نشان راہ اور سنگ میل کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ اس ای میگزین کا ایک سالانہ انتخاب بھی مطبوعہ صورت میں ترتیب دیا گیا ہے جو 420 صفحات پر محیط ہے۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس سے اردو ادب کا ایک عالمی دریچہ ہمارے سامنے کھل جاتا ہے۔ نسترن احسن فتیحی نے اس رسالے کی اشاعت کے جواز کے تعلق سے بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ ان کا یہ خیال قابل تحسین ہے کہ "اس ای میگزین کے ذریعے دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے اردو ادب کے شائقین کو اکٹھا کرنا ہے۔" وہ یہ بھی لکھتی ہیں کہ "کچھ عرصے سے ہمیں لگ رہا تھا کہ ادب کے منظرنامے پر وہ نام اور تخلیقی کاوشیں جو بیش بہا ہیں لیکن سوشل میڈیا سے دور ہونے کے باعث قارئین ادب کا ایک بڑا حلقہ ان سے حظ اٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے۔" مرتبین نے اسی محرومی کو دور کرنے کے لیے نئی ٹیکنالوجی کا سہارا لیا اور برقی میگزین کی اشاعت کا آغاز کیا۔" اس تعلق سے ممتاز فکشن نگار اقبال حسن خان کی یہ بات اس کی تائید کرتی ہے کہ "اردو زبان کی ترویج کے لیے نیٹ پر بہت تیزی سے قابل قدر کام ہو رہا ہے۔ اردو میں جو بھی چھپ رہا تھا اس کی پہنچ اتنے لوگوں تک بوجوہ نہیں تھی لیکن نیٹ پر جو بھی ابھر کر سامنے آتا ہے فوراً ہی لاکھوں تک پہنچ جاتا ہے۔" نیر حیات قاسمی نے بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آج کے تقاضوں کے مطابق آن لائن موجودگی نہ صرف زیادہ قارئین تک پہنچنے کا باعث بنتی ہے بلکہ ایک ماحول دوست عمل بھی ہے۔"

'دیدبان' کا مقصد زیادہ سے زیادہ قارئین تک رسائی ہے اور اس مقصد میں یہ رسالہ کامیاب ہے۔ اس کے مشمولات بھی معیاری ہیں اور قلم کار بھی مستند ہیں۔ افسانے کے باب میں جہاں انور سدید، حامد سراج، ممتاز حسین، شموئل احمد، طارق چھتاری، حسین الحق، شاہد جمیل، عامر ابراہیم، زیب ازکار حسین، قمر سبزواری، غضنفر، سیمیں درانی، سیمیں کرن، شاہین کاظمی، توصیف احمد، مشتاق احمد نوری، آدم شیر، ارشد علی، علی آریان شامل ہیں تو وہیں مضامین میں علی رفاد فتیحی، محمد ظہیر بدر، پیغام آفاقی، فرخ ندیم، قاسم یعقوب، نصیر احمد ناصر، خورشید حیات، افشاں ملک جیسی شخصیتیں ہیں۔ مضامین کا گوشہ اہم ادبی مباحث پر مرکوز ہے۔ علی رفاد فتیحی نے علی سردار جعفری کی نظم 'میرا سفر' کا ساختیاتی تجزیہ کیا ہے اور ایک نئی جہت سے اس نظم کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ فرخ ندیم نے منٹو کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کے حوالے سے منٹو متن کے معنیاتی نظام پر دانشورانہ گفتگو کی ہے اور اس کے پاگل کردار بشن سنگھ یا ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ابنارملٹی کو موضوع بناتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک فکر انگیز سوال ہے۔ آج کے تناظر میں اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تانیثی تھیوری اور اردو نظم کے حوالے سے قاسم یعقوب کی تحریر فکر انگیز ہے۔ انھوں نے مرد حاوی معاشرے کے خلاف تانیثی متن کے احتجاج پر مربوط اور مبسوط گفتگو کی ہے۔ نصیر احمد ناصر کا مضمون 'عورت عظیم ہے' ذہن کے کئی در وا کرتا ہے۔ خورشید حیات کی تحریر 'تخلیق اور تخلیق کا رشتہ' بہت سے سوالوں کو ذہن میں جنم دیتی ہے۔ افشاں ملک نے 'عصمت چغتائی کے افسانوں میں رومانی رجحانات' کی جستجو کی ہے۔ اس میں مائیکرو فکشن کے تحت بھی کئی تحریریں شامل ہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی ہیں اور اچھی منظومات کا انتخاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک گوشہ 'تراجم' کا بھی ہے۔ یہ اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اب عالمی ادب کے تراجم بہت کم رسائل و جرائد کا حصہ بن پاتے ہیں۔ اس میں جمال ابوحمدان کے عربی افسانے کا ترجمہ 'ابوفہد' نے 'چیونٹیوں کی بستی' کے عنوان سے کیا ہے۔ تو سلمیٰ جیلانی نے جیمس جوائس کے افسانے کا ترجمہ 'فلائن کی بہنیں' اور اس کے علاوہ سیمین علی پنجابی نے 'بابا بلھے شاہ کی کافی' کا ترجمہ پنجابی سے کیا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے شیخ ایاز کی نظموں کا سندھی سے ترجمہ کیا ہے۔ بلغارین شاعرہ ذویکا بلند زیویا کا ترجمہ سلمیٰ جیلانی نے کیا ہے۔ جھمپا لاہیری کے مشہور افسانے مسز سین کا ترجمہ ڈاکٹر نازیہ حسن نے انگریزی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ خالد قیوم تنولی کا ایک قسط وار ناول 'پس غبار سفر' کے عنوان سے شامل ہے۔

مجلہ 'دیدبان' نے ادب کے نئے امکانات اور رجحانات کو سمیٹنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ مجلہ تین خواتین کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور یہ تینوں ادب کے نہایت معتبر نام ہیں اور نہایت کشادہ اور متحرک ذہن کے حامل بھی۔ ادب کی عالمی لہروں، رویوں اور رجحانات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ سیمین علی، سلمیٰ جیلانی اور نسترن احسن فتیحی یہ تینوں ہی دیدبان کی ترتیب و انتخاب میں شامل ہیں اور اس تثلیث سے ادب کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ یقیناً اس سے ہمارے اردو ادب کو ایک نئی آکسیجن ملے گی اور ہم عالمی ادب کے نئے رویوں اور رجحانات سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ ادب کی مختلف صنفوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی رہے گی۔ یقیناً یہ ایک اہم کام ہے۔ 'دیدبان' اگر اسی تسلسل سے شائع ہوتا رہا تو یقیناً یہ ادبی و ثقافتی ڈسکورس کا ایک جلی عنوان ثابت ہوگا۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

تقریب 'یومِ مادری زبان' کا انعقاد

نئی دہلی: مادری زبان وہی ہے جو ہمیں ماں اور ماں کی گود سے ملتی ہے۔ مادری زبان کا تحفظ ماں کی گود سے ہی ہوسکتا ہے۔ ہماری ماؤں کی ذمے داری زیادہ ہے مگر نہ جانے کیوں ہم ایسی ماؤں سے اجتناب کرتے ہیں جو اردو زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'یوم مادری زبان' پر منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے گھروں میں بھی مادری زبان کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ گھروں کی بدلتی لفظیات پر انھوں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کی ابتدائی تربیت اپنی مادری زبان میں ہی کی جانی چاہیے۔

21 فروری کو 'یوم مادری زبان' کے عنوان سے اس تقریب کا انعقاد قومی اردو کونسل کی جانب سے امیا جسولہ کے کانفرنس ہال میں کیا گیا تھا، جس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی پروفیسر شہپر رسول نے شرکت کی۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض حقانی القاسمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر غضنفر علی، ڈائرکٹر، سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مادری زبان کی اہمیت، معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مادری زبان سے بچوں کی تفہیمی قوت اور ذہانت بڑھتی ہے اور یہ زبان سیکھنا اس لیے آسان ہوتا ہے کہ زبان کی لسانی آسانیاں سیکھنے والے کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہیں۔ اور لفظ بغیر کسی محنت، مشقت اور تردد کے اس کے حافظے کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مادری زبان میں پڑھا ہوا بچہ جب دوسری زبانیں سیکھنا شروع کرتا ہے تو اس کے اپنے تصورات ولفظیات اس کی رہنمائی کرنے لگتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کسی بھی دوسری زبان کو سیکھنے کے لیے مادری زبان کا اچھا علم ضروری ہے۔

پروفیسر غضنفر علی نے اردو میڈیم کو ذریعہ تعلیم بنانے کی راہ میں آنے والی دقتوں اور رکاوٹوں کا بھی ذکر کیا اور یہ واضح کیا کہ اردو نصابات میں سائنس، معاشیات، ریاضیات اور دیگر موضوعات پر اردو میں مواد کی کمی ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے مادری زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بچہ پہلی آواز، پہلا حرف اور لہجہ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اور جو اہمیت ماں کی ہے وہی حیثیت مادری زبان کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بچوں کی رگوں میں مادری زبان خون بن کر دوڑتی ہے۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی جانب سے مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کے حوالے سے منعقدہ تحریری مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعامات سے بھی نوازا گیا۔ پہلا انعام شاہ ہمایوں تفضل، دوسرا اسامہ اور تیسرا عرشی ناز کو دیا گیا۔ اسکول کے طلبہ کے لیے منعقدہ تحریری مقابلے کے لیے بہت سے مضامین موصول ہوئے تھے جن میں سے تین مضامین کو ماہرین کی کمیٹی نے انعام کے لیے منتخب کیا۔ تقریب میں قومی اردو کونسل کے افسران اور کارکنان کے علاوہ دہلی کی سرکردہ شخصیات اور جامعات کے طلبہ وطالبات بھی شریک تھے۔ تقریب کا اختتام پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے کلمات تشکر پر ہوا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 فروری 2018

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'جشن یوم اردو' کا انعقاد

نئی دہلی: ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی تاریخ میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت گنگا جمنی تہذیب اور سیکولرزم کی ایک روشن علامت ہے، انھوں نے ہندوستان سے اپنی محبت اور شیفتگی کا جو ثبوت دیا ہے اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ وہ ترک نژاد تھے مگر ہندوستان کی مٹی سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ ان کی پوری شاعری اسی جذبہ محبت سے معمور

ہے انھوں نے اپنی شاعری میں اتحاد و یکجہتی کا درس دیا ہے اور ان کی پوری شاعری میں ہندوستانیت کی خوشبو رچی بسی ہے۔ امیر خسرو کی انھیں امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی یوم پیدائش کی مناسبت سے ہر سال 3 مارچ کو قومی اردو کونسل 'جشن یوم اردو' کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ہوٹل امیا، جسولہ، نئی دہلی میں منعقدہ 'جشن یوم اردو' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو کی شخصیت ایسی ہے جن سے ہر طبقے اور ہر زبان کے لوگ بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کا صوفیانہ کلام ہر ایک کے دل کی دھڑکن بنا ہوا ہے اسی لیے امیر خسرو کی یوم پیدائش کو یوم اردو کے طور پر پورے ہندوستان میں منایا جائے تو یہ امیر خسرو کو ایک بڑا خراج عقیدت ہوگا۔ جشن یوم اردو میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شاہد مہدی سابق شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے امیر خسرو کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ پورے فارسی ادب میں اتنے اعلیٰ درجے کا تخلیق کار شاید ہی ملے جس نے تمام موضوعات کا احاطہ کیا ہو۔ خسرو کو اپنے وطن ہندوستان پر ناز تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بڑے شاعروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں ہر زمانے میں مختلف زاویوں سے پڑھا جاتا ہے، جس سے ان کی معنویت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ آج کے ماحول میں خسرو کو پھر سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مہمان ذی وقار پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اس موقع پر خسرو کے حوالے سے بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو صرف اردو زبان کے موجد نہیں تھے بلکہ ہندی کے بھی جنک تھے۔ ان دونوں زبانوں کی پیدائش خانقاہوں میں ہوئی جسے ہندوی کہا جاتا تھا جو آج اردو اور ہندی کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ انھوں نے یہ کہا کہ ارباب اقتدار میں بیٹھے لوگ اردو کی ترویج و اشاعت میں سرگرم ہیں لیکن صرف سرکاری مراعات اور تعاون کی بنیاد پر اردو کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ہم اردو والے پوری ایمانداری اور دلجمعی کے ساتھ اسے پھر اپنے گھروں میں آباد کریں اور آنے والی نسلوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دلائیں۔ اردو کا معاملہ اتنا خراب نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔

اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ سوائے امیر خسرو کے ہندوستان میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ جشن یوم اردو کسی اور کے نام سے منسوب کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ امیر خسرو ہی تھے جنھوں نے چھ سو سال قبل ہندوی کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود سے باہر ممالک سے متعارف کرایا۔ امیر خسرو کی بازیافت درحقیقت ہندوستانی تہذیب وثقافت اور تصوف کی بازیافت ہے۔ اس موقع پر مہمان اعزازی ڈاکٹر امام احمد عمیر الیاسی نے کہا کہ ہمیں خسرو کی دی ہوئی میٹھی زبان اردو کی مزید ترویج و اشاعت کی ضرورت ہے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، رحمت اللہ علیہ سے وابستہ سید محمد نظامی نے بھی امیر خسرو کی شخصیت اور فن کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر مقررین نے 3 مارچ کو پورے ہندوستان میں 'یوم اردو' کے طور پر منانے کی تجویز پیش کی اور تمام حاضرین نے اس تجویز کی تائید کی۔

اس موقع پر ایک صوفیانہ محفل کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں ممتاز فنکار اندرا نائک (ممبئی) نے صوفیانہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ محفل کا اختتام کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے کلمات تشکر پر ہوا۔ اس محفل میں دہلی کی سرکردہ شخصیات کے علاوہ جامعات کے طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مارچ 2018

قومی اردو کونسل میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: لگ بھگ تین برسوں سے کونسل سوشل سائنس کے موضوعات پر ایسی کتابیں شائع کرتی آرہی ہے جو نہ صرف اردو قارئین کی بڑی آبادی بلکہ جامعات کے

طلبہ وطالبات کے لیے بھی مفید و مددگار ہیں۔ آج کی میٹنگ میں انگریزی کی جن نایاب و کلاسیکی کتابوں کو ترجمہ کے لیے منتخب کیا گیا وہ قابل ستائش ہیں۔ یہ کتابیں دنیا کی بیشتر زبانوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ افسوس اردو قارئین ایسی کتابوں سے اب تک محروم ہیں۔ مثلاً:

1.The Individual and Society 2. The Mothers, 3. A History of Classical Sociology 4.Ten Great Economists 5.Women in Modern Society 6.The Position of Woman in Primitive Society

کے نام قابل ذکر ہیں۔ کونسل ایسی کتابوں کو سیریز کے طور پر شائع کرنے جارہی ہے تاکہ آج کے مسابقتی دور میں ہمارے بچے پیچھے نہ رہ جائیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے حوالے سے یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اردو مذہبیات اور ادب تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ کونسل اس تصور کو توڑنا چاہتی ہے۔ میٹنگ میں پیش کیے گئے Minutes کو اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا اور کئی نئی تجاویز پر بھی غور وخوض کیا گیا۔ پینل کی صدارت ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کی۔ انھوں نے کہا کہ واقعی اس طرح کی کتابوں کی اشاعت سے کونسل کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ جائے گی اور اردو زبان کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ہونے لگے گا۔ اس موقع پر پروفیسر رضوان قیصر نے کہا کہ ایسی کتابیں اردو قارئین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہوں گی ۔ میٹنگ میں دوسرے ممبران نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

میٹنگ میں پروفیسر ایچ ایم قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، پروفیسر ناظم علی، ڈاکٹر عذرا عابدی، جناب نریش ندیم، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر ایم داؤد محسن، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر مظفر اسلام، ڈاکٹر سجاد عالم رضوی، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، محمد شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 مارچ 2018

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار کی افتتاحی تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ریسرچ کے حالات اب اس لیے اچھے نہیں رہے چونکہ اس کا تعلق اب جاب سے ہوگیا ہے۔ حالانکہ اس کی بھی اپنی مجبوری ہے۔ سہولت کی کمی اور اس کی زیادتی دونوں ہی تعلیم کے لیے نقصان دہ ہیں۔ یہ ایک اچھا فورم ہے۔ جہاں آپ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ سائنس میں ریسرچ کا معیار آگے بڑھ رہا ہے تو زبان وادب کی ریسرچ کا معیار کیوں زوال کی طرف گامزن ہے۔ اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ معروف اسکالر عارف نقوی نے کہا کہ ہم تو یہاں یہ

بھی دیکھنے آئے ہیں کہ یہاں کیا کام ہورہا ہے تاکہ ہم جرمنی میں اس پر عمل کرسکیں۔ ہمیں تحقیقی کام پر زیادہ زور دینا چاہیے، ہماری ریسرچ کی زبان ایسی ہونی چاہیے تاکہ بعد کے طلبہ کو پڑھنے میں آسانی ہو۔ ہمیں روایتی طریقے سے آگے بڑھ کر عالمی نقطہ نظر کے ساتھ ریسرچ کرنی چاہیے۔ مصاعد قدوائی، وائس چانسلر، جامعہ اردو، علی گڑھ نے کہا کہ تحقیق کا کام زندگی کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کے نوجوانوں میں جستجو ہو اور وہ لگن کے ساتھ تحقیقی کام کرسکیں۔ ڈاکٹر نریش نے کہا کہ آپ ریسرچ کررہے

ہیں، سرچ نہیں کررہے ہیں، سرچ کا کام پہلے ہوچکا ہے۔ آپ تحقیقی کام تو کررہے ہیں مگر یہ سوچیں کہ تعلیمی استعداد کے معاملے میں آپ کہاں ہیں۔ معروف فارسی اسکالر پروفیسر چندر شیکھر استاذ شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ ریسرچ کے طریقہ کار اور نصاب میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ گفتگو میں کہا کہ ریسرچ اسکالرسمینار کے رواج کا منبع غالب انسٹی ٹیوٹ ہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہر جگہ ریسرچ اسکالرسمینار منعقد ہورہے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سمینار کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ دوسروں پر منفی خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اپنا بھی خیال رکھیے۔ مستقبل آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس عمر میں آپ کو ساری سہولیات دی جارہی ہیں۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید رضا حیدر، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام پروگراموں میں ریسرچ اسکالر سمینار سب سے اہم ہے، ریسرچ اسکالر سمینار کا سب سے بڑا فائدہ ریسرچ اسکالروں کو ہوتا ہے۔ غیر ملکی یونیورسٹیز کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کی نمائندگی یہاں ہورہی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد بین الاقوامی ریسرچ اسکالرسمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر وہاج الدین اور پروفیسر احمد محفوظ نے اور نظامت غزالہ فاطمہ نے کی۔ اس سیشن میں علی ظفر، اسما، مقصود حسین شاہ، مدثر رشید، محمد ریحان، سیدہ خاتون نے اپنے مقالات پیش کیے۔ آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر ابوبکر عباد اور ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے کی اور نظامت امیر حمزہ نے کی۔ اس سیشن میں نازیہ تسکین، محمد مدثر، موسیٰ ارشد احمد کوچے، روبی، سعید الحسن، راشدہ خاتون، نور اشرف نے اپنے مقالات پیش کیے۔

ریسرچ اسکالرسمینار کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ مقالوں کا رجحان تنقید کی طرف ہے۔ اچھے متون کی ترتیب و تدوین کے کام نہیں ہورہے ہیں۔ شعری متن پڑھنے کی بھی صلاحیتیں ہم سے ختم ہورہی ہیں۔ حوالہ جات پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مقالہ لکھنے کے وقت حوالہ جات کی بڑی اہمیت ہے اور حوالے پورے دینے چاہئیں۔ اس اجلاس میں محمد آثار احمد انصاری، شاہین ترنم، نور بانو، گلشن بنجارہ، وسیم اقبال نحوی، عرفان عسکری، شاذلی خان، زینب ناز اور خوشتر زرین نے اپنے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی نظامت عبدالرزاق زیادی نے کی۔ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار کے دوسرے روز کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے سمیناروں میں اظہار مافی الضمیر کی ادائیگی سے طلبہ و طالبات میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ آپ چاہیں جتنی اچھی باتیں کہیں مگر جیسے ہی آپ کا تلفظ خراب ہوتا ہے آپ کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ تلفظ کی درست ادائیگی ناگزیر ہے۔ اس اجلاس کی نظامت صالحہ صدیقی نے کی۔ اس میں قمر جہاں، محمد شاداب شمیم، شاہد عالم، مسرور احمد حیدر، آصفہ زینب اور محمد ارشد نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے روز کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی اور پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی اس اجلاس کی نظامت فرمان چودھری نے کی۔ اس اجلاس میں انجم پروین، ندا معید، اشتیاق احمد، محمد جاوید، نسرین صدیقہ، نغمہ تبسم، جاوید عالم اور نگمینہ حبیب نے اپنے مقالات پیش کیے۔ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار کے دوسرے روز کے آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر علی اکبر شاہ اور ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی نے کی اور نظامت شہباز رضا نے کی۔ اس اجلاس میں شاہد رضی، رہبر رضا، سروری بیگم، امتیاز احمد، وصی الدین سردار، تنویر مظہر، محمد رفیق اور شیخ اصغر نے اپنے مقالات کی قرأت کی۔ اس موقعے پر دونوں صدور نے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی۔

ریسرچ اسکالرز سمینار کے اختتامی اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ تحقیق کا مقصد آزادیٔ فکر و خیال کی پرورش ہے۔ علمی و تحقیقی دنیا میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ تحقیق کے کام میں ڈرنے گھبرانے کی نہیں ریاضت کی ضرورت ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ جب شاگرد استاد سے آگے نکلتا ہے تو اساتذہ کو خوشی ہوتی ہے۔ یہ سمینار اپنی نوعیت کا یکتا اور قرار واقعی بین الاقوامی سمینار ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کہا کہ اس سمینار کے انعقاد کا فن غالب انسٹی ٹیوٹ کو ہی آتا ہے۔ ہر سال بڑی محنت کے بعد یہ سمینار منعقد ہوتا ہے۔ اگلے بین الاقوامی سمینار میں ہماری کوشش ہوگی کہ تین کے بجائے تیرہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز شامل ہوں۔ اختتامی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سید رضا حیدر، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے کی۔ اجلاس میں ترکی کی استنبول یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر آرزو سورین اور جاپانی اسکالر مورا کامی آسوکا نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ آخری روز کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی و پروفیسر ابن کنول نے کی۔ اس اجلاس کی نظامت محمد شفیق عالم نے کی۔ اس اجلاس میں محمد توصیف خان، غلام نبی کمار، محمد ثناء اللہ، اعجاز احمد، محمد صالح ظفر، محمد فیضان حسن نے اپنے مقالات پیش کیے۔ آخری روز کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور پروفیسر علیم اشرف خاں نے اور نظامت نورین علی حق نے کی۔ اس اجلاس میں معصوم غلامی، بی بی سکینہ، صالحہ صدیقی، ایس ئی نوراللہ، امتیاز احمد علیمی، محمد فرحان، نائلہ تبسم، احسن ایوبی، ابراہیم وانی، تنویر احمد میر اور شہناز رحمان نے اپنے مقالات پڑھے۔

آخری دن کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انور پاشا اور پروفیسر رضوان قیصر نے کی۔ اس اجلاس کی نظامت توحید حقانی نے کی۔ اس اجلاس میں آرزو سورین، نورین علی حق، نیلوفر یاسمین، شہ نور حسین، افتخار احمد، محمد سلیم، سمیہ بانو، عابد علی خان اور محمد معین خان نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کے بعد تمام مقالہ نگاروں، ناظموں اور ریسرچ اسکالر سامعین کو سرٹیفکیٹ دیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 تا 7 مارچ 2008

ہندوستان کے مذہبی صحیفوں کے اردو تراجم

نئی دھلی: ہندوستان کے مذہبی صحیفوں کے اردو تراجم جہاں ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں وہیں بین المذاہب تہذیب و ثقافت اور رواداری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ باتیں مقررین نے ہندوستان کے مذہبی صحیفوں کے اردو تراجم کے عنوان سے منعقدہ ایک قومی سمینار میں کہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے سربراہ اور اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے تراجم کے حوالے سے کہا یہ نہ صرف علم میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تہذیب کو جاننے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ تراجم خواہ نظم میں ہو یا نثر میں آج کے دور میں ان کی بہت اہمیت ہے۔ خاص طور پر ایک زوال پر آمادہ معاشرے میں ایسے مذہبی صحیفوں کے تراجم کی سخت ضرورت ہے۔ عالمی سہارا کے لئیق رضوی، ڈاکٹر آصف ازہری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آج کل کے سابق مدیر اور روزگار سماچار کے ایڈیٹر ڈاکٹر ابرار

رحمانی نے کہا کہ رامائن اور مہابھارت کے علاوہ دیگر مذاہب کے صحیفوں پر توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ معروف نقاد حقانی القاسمی نے مذہبی صحیفوں کے اردو تراجم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مذہبی تراجم کا مقصد دماغ کی کھڑکیاں کھولنا تھا اور بین مذہبی مکالمے کی راہ ہموار کرنا تھا لیکن اردو کے مذہبی تراجم ثقافتی پل کا کام نہ کرسکے۔ ہندی کی مشہور صحافی منیشا بھلہ نے گروگرنتھ کے ترجمہ کا جائزہ پیش کیا۔ اس موقع پر دیگر شرکا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت خان رضوان خان نے انجام دی۔ پروگرام کا انعقاد آواز چیریٹیبل ٹرسٹ دہلی، مظہر فاؤنڈیشن انڈیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے عمل میں آیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 26 فروری 2018

سرسید شناسی: جہات وامکانات

نئی دہلی: اُردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام فروری

23 سے 25 فروری 2018 میں ایک مذاکرۂ ذی شان بعنوان 'سرسید شناسی: جہات وامکانات' منعقد ہوا۔ جس میں افتتاحی و اختتامی مجلسوں کے علاوہ چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے، جن میں سرسید کی حیات، خدمات، فکر، علمی، ادبی حیثیت، تحریک تعلیمی، نیز ان کے پیغام و میراث کو محیط متعدد موضوعات پر ممتاز علما و محققین نے اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔

افتتاحی تقریب کی صدارت جناب سید شاہد مہدی سابق شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اسلم پرویز، شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد شریک ہوئے۔ کلیدی خطبہ ممتاز ماہر سرسیدیات پروفیسر اصغر عباس نے پیش کیا۔ مہمانان کرام کا استقبال اکادمی کے نائب صدر نشین پروفیسر شہپر رسول نے کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی اور بطور مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع، شیخ الجامعہ مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور نے شرکت کی۔

مختلف اجلاسوں کی صدارت، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ مقالہ نگاروں میں جناب شمیم طارق نے، سرسید بحیثیت مورخ، ڈاکٹر مظفر حسین سید نے، 'سرسید اور شبلی' پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے، مضامین سرسید کی ادبی وتہذیبی اہمیت، ڈاکٹر شمس بدایونی نے، سرسید کی مکتوب نگاری اور پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے، سرسید کا انداز فکر، جیسے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ پروفیسر غضنفر، جناب سہیل انجم، ڈاکٹر عباس رضا نیر، ڈاکٹر صفدر امام قادری وغیرہ کے علاوہ کثیر تعداد میں مقالہ نگار شامل تھے۔

قابل ذکر ہے کہ لائق فائق قلم کاروں کی وسیع تر شرکت، مقالات کے معیار، معیاری بحث ومباحثہ، کثیر تعداد میں حاضرین کی موجودگی، نیز حسن انتظام کے باعث یہ مذاکرہ ایک کامیاب مذاکرہ تھا۔

پریس ریلیز: مظفر حسین سید، نئی دہلی، 5 مارچ 2018

فراق یادگاری خطبہ

نئی دہلی: نیر مسعود کا فکشن ماضی کی بازیافت کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جو ہر قسم کی تقلید اور مکتبیت سے پرے، نئے سرے سے زبان، اسلوب، تکنیک اور موضوع ومواد کو برتنے اور پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ زبان کی ہندوستانیت پر اس قدر تاکید ہے کہ عربی اور فارسی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ایک خودمختار اور غیر مختصر بیانیہ ظہور پذیر ہوجائے، جس کو صرف اردو پن ہی کہا جاسکتا ہے۔ نیر مسعود اپنی کہانیوں میں کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش، گمشدہ اشیا اور احساسات کی جستجو کی فضا کو کھویا کھویا سا رکھتے ہیں اور یہ فضا کہانی کے نارمل کرداروں، خبر دینے والے مکالموں اور حرکت سے معمور عمل اور ماضی سے متعلق پراسرار معاملات کے ساتھ مل کر کچھ طلسمی سی ہوجاتی ہے اور ان سب کو ایک تار میں پرونے والے واقعے سے ان میں کہانی پن پیدا ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے کمیٹی روم، شعبۂ سنسکرت میں منعقدہ فراق یادگاری خطبہ میں ممتاز فکشن نگار اور دانشور سید محمد اشرف نے کیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے فرمایا کہ نیر مسعود ماضی کے بجائے مستقبل کا فکشن نگار ہے۔ البتہ ماضی سے رنگ، روشنی اور خوشبو ضرور کشید کرتا ہے اور نیر مسعود کا ماضی دراصل ہندوستان کی وہ عجیب وغریب تہذیب ہے جس کو ہند اسلامی تمدن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اس تہذیب کا خوبصورت تحفہ اردو زبان ہے۔ استقبالیہ خطبہ پروفیسر شہپر رسول نے پیش کیا۔ جبکہ ڈاکٹر خالد جاوید نے سید محمد اشرف کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے فراق گورکھپوری کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موثر خطبے کی نظامت کے فرائض ڈین فیکلٹی برائے علوم والسنہ پروفیسر وہاج الدین علوی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 فروری 2018

امیر حسن عابدی لکچر کا انعقاد

نئی دہلی: شعبۂ فارسی ذاکر حسین دہلی کالج میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی صدارت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے دوسرا امیر حسن عابدی میموریل لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مسرور احمد بیگ نے تمام مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے پھولوں سے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے پروفیسر امیر حسن عابدی پر یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا امیر حسن عابدی سے ایک روحانی رشتہ ہے جس کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی نیز انھوں نے ہندوستان میں فارسی کی تہذیبی، ادبی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور ایران کے تعلقات زمانہ قدیم سے رہے ہیں اسی لیے عصر حاضر میں بھی فارسی زبان وادب کی اہمیت کم نہیں ہوسکتی۔ اس بزم کے مہمان خصوصی پروفیسر علیم اشرف خان صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے امیر حسن عابدی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر امیر حسن عابدی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو کبھی قصہ پارینہ نہیں ہوسکتی۔ آخر میں اس بزم کے صدر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شعبہ فارسی ذاکر حسین کالج

کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہر طرح سے تعاون کی یقین دہانی کرائی نیز پروگرام کے آخر میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر خورشید احمد کی کتاب کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمود فیاض نے انجام دی اور شرکا میں شعبہ فارسی، عربی، اردو کے نامور اساتذہ میں پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر راجندر کمار، پروفیسر ریحانہ خاتون، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر جمشید احمد، ڈاکٹر حسنین اختر کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا دہلی' 17 فروری 2018

اکیسویں صدی کی ادبی صحافت

نئی دہلی: معروف سماجی تنظیم پرگتی شیل مزدور جن کلیان سیوا (رجسٹرڈ) آزاد پور اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے اشتراک سے غالب اکادمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک روزہ قومی سیمنار بعنوان 'اکیسویں صدی کی ادبی صحافت: مسائل و امکانات' منعقد کیا گیا۔ سیمنار میں اردو زبان و ادب اور صحافت کی معروف اور اہم شخصیات نے شرکت کی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ بھی مقررین نے اردو کی ادبی صحافت کے حوالے سے بے حد پر مغز گفتگو کی اور اردو میں ایسے موضوع پر سیمنار کے لیے سماجی تنظیم کو مبارکباد دی۔ سیمنار کا آغاز خالد رضا خاں کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے تنظیم کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس موضوع پر سیمنار کرانے کی غرض و غایت بیان کی۔ سیمنار کے مہمان خصوصی معروف شاعر اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اکیسویں صدی میں اردو کی ادبی صحافت مضبوط ہوئی ہے اور اردو میں نئے نئے رسالوں کی آمد سے ادبی صحافت کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ آج اردو ہندوستان میں عوامی رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے۔ ہمیں اس کے رسم الخط کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سیمنار کے افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ادب اور صحافت بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ اردو کی ادبی صحافت نے بھی اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج لوگ رسالوں سے دور ہوتے جارہے ہیں انھیں پھر سے اردو رسائل و جرائد سے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ سیمنار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب حقانی القاسمی نے اکیسویں صدی کی ادبی صحافت، معیار، مسائل اور امکانات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو رسالے متنوع موضوعات کی وجہ سے عام قارئین سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہیں۔ صحافت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے۔ انھوں نے ادبی صحافت کی اصطلاح کو غلط اور گمراہ کن قرار دیتے ہوئے کہا کہ اصطلاحات کو وضع کرتے وقت ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خان نے موضوع کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو رسائل اور اخبارات کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے اس لیے ہم سب کو چاہیے کہ اپنے گھروں میں، اپنے رشتے داروں میں اچھے اور معیاری رسائل جاری کروائیں جس سے اردو کا کھویا ہوا وقار واپس آسکے۔ سیمنار کے پہلے سیشن میں آجکل کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی، اردو بک ریویو کے مدیر عارف اقبال، معروف صحافی سہیل انجم، نیشنل چینل آل انڈیا ریڈیو کے افتخار الزماں، عالمی سے کے لئیق رضوی، ہندوستان ایکسپریس کے ظفر انور شکر پوری نے مقالے پڑھے۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر شہزاد انجم اور جاوید اقبال خان نے کی۔ اسی موقعے پر ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر شاہانہ مریم شان، ڈاکٹر محمد امان اللہ، ڈاکٹر سفینہ، ڈاکٹر اسد اللہ اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب خان رضوان نے مقالے پڑھے۔ سیمنار کی نظامت کے فرائض جناب زبیر خان سعیدی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تنظیم کے سکریٹری جناب صابر علی نے مالی تعاون کے لیے قومی اردو کونسل اور اس سیمنار میں شرکت کے لیے بھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2018

مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی: فن اور شخصیت

الہ آباد: شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے اختتام ہال میں بزم تعمیر ادب (ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن) کی جانب سے دو روزہ قومی ریسرچ اسکالرز سیمنار مورخہ 12 تا 13 فروری 2018 کو منعقد ہوا۔ سیمنار کے پہلے روز افتتاحی اجلاس میں محترمہ ندا معید صاحبہ نے استقبالیہ پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت محترمہ سفینہ سماوی صاحبہ نے کی۔ قرآن کریم کی تلاوت سے سیمنار کا آغاز ہوا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر شبنم حمید صاحبہ نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر سید محمد ہاشم نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر راجندر کمار، ڈاکٹر عبدالقادر جعفری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس بزم کو نیک خواہشات اور دعاؤں سے نوازا۔ افتتاحی اجلاس میں ریسرچ اسکالر محمد سلیم انور کی کتاب 'ارض وسما' کی رسم اجرا بھی ہوئی۔ سیمنار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے اور نظامت محمد ریحان خان نے کی۔ اس اجلاس میں مختلف جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں محمد پرویز خان، ایم اے کائنات، آنند جی راؤ، نصرت جہاں، صفت زہرا، سوریا پرکاش راؤ، عامر اقبال، حرا شہاب، زینگ مینو اور محمد عادل کے نام قابل ذکر ہیں۔

سیمنار کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس کی نظامت ندا معید صاحبہ نے کی۔ پروفیسر شبنم حمید اور پروفیسر احمد محفوظ نے مشترکہ طور پر صدارت کی۔ اس اجلاس میں سب سے زیادہ مقالے پیش کیے گئے جن میں ارشد جمیل، پروین جہاں، محمد ریحان، آفتاب احمد، محمد دانش، نیاپنا، غزالہ فاطمہ، مورا کامی آسوکا جن کا تعلق جاپان سے ہے، فرح بانو، محمد سلیم، رخسار پروین، عالیہ بیگم، ارم نعیم اور ارشد علی شامل ہیں۔ مقالہ خوانی کے بعد پروفیسر اشفاق احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کے بعد صدارت فرما رہے پروفیسر احمد محفوظ صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی دہلی) نے اپنے خیالات کا اظہار مقالات کی روشنی میں کیا اور مقالوں کی خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ عبارت آرائی کے بجائے مقالے میں علمی زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ بزم تعمیر ادب کی جانب سے اس سیمنار کے لیے صدارتی خطبے کے بعد صفت زہرا نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمد ہاشم نے اور نظامت محمد دانش نے کی۔ اس اجلاس میں راشدہ خاتون، جاوید احسن، محمد یاسین، لیاقت علی، زینب افضال، چودھری امتیاز احمد، محمد مبشر، محمد قاسم اور محمد آصف نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے مقالوں کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کیا۔ اس کامیاب سیمنار کے لیے انھوں نے صدر شعبہ اردو پروفیسر شبنم حمید صاحبہ کو مبارکباد پیش کی۔

رپورٹ: چودھری امتیاز احمد، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، 18 فروری 2018

اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار

لکھنؤ: اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ایک قومی سیمنار 'اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار' کے عنوان سے یوپی پریس کلب لکھنؤ میں

'اردو اور ہندی کا رشتہ' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت ماہر تعلیم و سابق پرنسپل ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ عبدالسلام صدیقی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی شفاعت حسین، جنرل سکریٹری، مسلم اقلیتی مورچہ، رضوان احمد سابق ڈی جی پی محترمہ تبسم قدوائی، پرنسپل تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عشرت ناہید نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ ڈاکٹر سیما صدیقی، غفران نسیم، ڈاکٹر ای اے حیدری (راجستھان)، پروفیسر عشرت ناہید اور ضیاء اللہ صدیقی نے مقالے پیش کیے۔ جلسے کے صدر عبدالسلام صدیقی نے اردو انشائیہ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ای اے حیدری نے اپنے مقالے میں کہا کہ آزادی کے بعد کے انشائیہ نگاروں کی فہرست یہیں تمام نہیں ہوتی اور بھی بہت سے نام ہیں جیسے حامد رشیدی ٹونکی، ممتاز شکیب، راشد ممتاز وغیرہ نے بھی اس صنف میں اپنی جولانی فکر کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ سمینار میں صحافی ضیاء اللہ صدیقی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انشائیہ کو نثری غزل کہہ سکتے ہیں جو مرصع ہوتی ہے اس کا تعلق صرف جذبات ہی سے نہیں ہوتا یہاں شعور کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ اپنی تحریر میں انشائیہ نگار مختصر اور جامع جملوں میں معنی خیز اشارات پنہاں کر دیتا ہے۔ اس کا ہر لفظ جذبات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر سیما صدیقی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ایک اچھے انشائیہ نگار کی پہچان ہے اس کا مشاہدہ گہرا ہو اور یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب اس کی نفسیاتی شناخت اعلیٰ پائے کی ہو ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ ہر فرد کی نفسیاتی جانچ اور مشاہدے کے بعد ہی اپنی بات کہے۔ پروگرام کے اخیر میں کنوینر حنان خان نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کامیابی کے ساتھ سمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 فروری 2018

اردو اور ہندی کا رشتہ

لکھنؤ: ہندی اور اردو دونوں اہم ہندوستانی زبانیں ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں زبانوں کا فروغ مغلیہ حکومت کے زوال کی آہٹ کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں کا گرامر تقریباً ایک ہونے کی وجہ سے ان کا فروغ بھی ایک ساتھ ہی شروع ہوا۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں زبانوں کے اسلوب میں تھوڑی بہت تبدیلی نظر آنا شروع ہوتی ہے اور اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زبانوں کی سطح پر جتنا گہرا رشتہ اور قربت اردو اور ہندی زبانوں میں ہے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار صدر جلسہ پروفیسر آصف زمانی نے آزاد ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ یک روزہ سمینار 'اردو اور ہندی کا رشتہ' میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ سمینار میں افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کنوینر پروگرام نثار احمد نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ٹرسٹ کے اراکین نے مہمانوں کا گلدستوں اور پھولوں سے استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض مولانا آزاد یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ہندی سنستھان کے سابق صدر و سابق ممبر آف پارلیامنٹ اودے پرتاپ سنگھ نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں، اور اردو کے کچھ روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ کا بدل کوئی دوسرا ہندی لفظ نہیں ہے۔ مثلاً شکایت وغیرہ، اس لیے بنا کسی تفریق کے دونوں زبانوں کو فروغ دینا چاہیے اس لیے کہ زبانوں کا تعلق مذہب سے ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ مہمان اعزازی سینئر صحافی پریم کانت تیواری نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اردو اور ہندی کے اس رشتے کو دانشوروں نے الگ الگ نام دیے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اردو ہندی کو ہندوستان کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا جبکہ اردو کے معروف ادیب گوپی چند نارنگ اردو ہندی کے اس رشتے کو ایک دوسرے کی طاقت بتاتے ہیں۔ مقالہ نگار ڈاکٹر سیما صدیقی، ڈاکٹر عمیر منظر، اویس سنبھلی، ضیاء اللہ صدیقی اور محمد عرفان نے اپنے تحقیقی مقالوں میں کہا کہ آزاد ہندوستان کے آئین میں ہندی اور اردو کو الگ الگ زبانوں کے طور پر رکھا گیا ہے، مگر اس کے باوجود ان زبانوں کا لسانی رشتہ ختم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی لسانی عکس میں زبانوں کی تاریخ اور ماخذ ایک ہی ہیں، اپنی تمام مخالفتوں کے باوجود اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ متواتر قائم ہے۔ تمام مقالہ نگاران نے اردو اور ہندی کے روشن و تابناک مستقبل کی اپنی تحقیق اور تجربہ سے پیشن گوئی بھی کی۔ آخر میں ٹرسٹ کے صدر عبداللہ بخاری نے مہمانوں کے شکریہ کے ساتھ سمینار کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 فروری 2018

اردو میں تاریخ نگاری

شاھجہاں پور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و گاندھی فیض عام کالج کے شعبہ تاریخ کے اشتراک سے بدھ کو کالج کے کمیٹی ہال میں دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو میں تاریخ نگاری' موضوع پر منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت کالج منتظمہ کمیٹی کے صدر سید معین الدین نے کی۔ مہمان خصوصی ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے وائس چانسلر پروفیسر انل شکلا نے اپنے خطاب میں کہا کہ عوام کی تاریخ عوام کی ہی زبان میں لکھی جاسکتی ہے۔ اردو ایک طویل عرصہ تک عوام الناس کی زبان رہی ہے۔ سنہ 1700 کے بعد کی مستند تاریخ اردو کے علم کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو حقیقت میں دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ کا اہم ترین ذریعہ اور وسیلہ عوام ہیں۔ مقرر خصوصی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اردو پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا اچھا خاصا دینی اور تاریخی سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جہاں ہمیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ ہمیں ان آزادیوں کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ مہمان اعزازی نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر انصارالحق نے اردو کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ باعث تشویش ہے کہ اردو بول چال میں تو ہے مگر تحریر میں وہ غائب ہو رہی ہے۔ رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر سید حسن عباس نے رامپور کے حکیم نجم الغنی خاں کی ادارت میں اخبار الصنادید کے حوالے سے بتایا کہ اس کے بغیر روہیل کھنڈ کی مستند تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ تکنیکی سیشن میں ڈاکٹر مہارشی دیانند وشوودیالیہ روہتک

سے ڈاکٹر اعجاز احمد نے مولوی محمد باقر کی ادارت میں شائع ہونے والے دہلی اردو اخبار کا تذکرہ کیا جس میں 1857 کی آنکھوں دیکھی تاریخ درج ہے۔ ان کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر سیف اللہ سیفی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر پرویز نظیر اور کمایوں یونیورسٹی ہلدوانی کے ڈاکٹر سراج محمد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں سمینار کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر تنویر حسین نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2018

اودھ کے طبیب شعرا اور ان کی خدمات

لکھنؤ: طب اور اردو زبان و ادب کا قدیم رشتہ رہا ہے لہٰذا اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمیں اردو ریڈرشپ پر بطور خاص توجہ دینی ہوگی۔ مولانا عبدالغفار ویلفیئر

سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے اودھ کے طبیب شعرا اور ان کی ادبی خدمات کے جیسے اہم عنوان پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی جلسے کے مہمان خصوصی پروفیسر سید ارتضیٰ کریم ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اردو کونسل کے توسیعی منصوبوں میں طب، انجینئرنگ، سماجیات، کمپیوٹر سائنس، ابلاغی ذرائع اور قدیم وراثت کو محفوظ کرنے اور اردو رسم الخط کے لیے مستقبل قریب میں جاری کیے جانے والے ای ہب سافٹ ویئر کو جلد شروع کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ محض غالب اور میر کے تنقیدی جائزے سے کونسلوں کا کام نہیں پورا ہوتا۔ ضرورت ہے کہ اردو اکادمیاں متحد ہوکر اردو زبان و ادب کے علاوہ سماجی علوم، کمپیوٹر سائنس، اور تیزی سے بڑھتے ذرائع ابلاغ پر منصوبہ سازی کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کریں۔ لیش بھارتی اعزاز یافتہ ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی نے اپنے طویل کلیدی خطبے میں اودھ کے اطبا کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے اسے مزید منظم طور سے مرتب کرنے کی بات کہی۔ مہمان ذی وقار سینئر ایڈوکیٹ ظفریاب جیلانی نے کہا کہ اردو کو خود اپنانا ہوگا اور اس کے لیے ہمیں گھر میں اردو بولنے، سیکھنے اور سکھانے کا ماحول بنانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کوثر عثمان نے کہا کہ اردو ایک زبان نہیں ہے ایک تہذیب ہے ایک معاشرت ہے ادب و اخلاق کی علامت ہے۔ ہمیں اسے زبان نہیں ایک تہذیب کی طرح اپنانا چاہیے۔ فخرالدین علی احمد کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر عارف ایوبی نے کہا ہمیں اردو کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا اور اردو کو روزگار سے جوڑنے اور اسے مزید مفید بنانے کے لیے نئے منصوبے بنانے ہوں گے۔ پروگرام میں ڈاکٹر عارف ایوبی کو استقبالیہ دیا گیا اور سوسائٹی کی طرف سے حکیم خواجہ ساجد حسن کو تدریسی خدمات، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی کو لٹریری طبی تحقیق کے حوالے سے اہم خدمات کے اعتراف کے طور پر انعام سے نوازا گیا اور ڈاکٹر معید کو طبی تنظیم کے ذریعے اہم خدمات کے اعتراف کے طور پر اعزاز سے نوازا گیا۔ دوسری نشست ایرا میڈیکل یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر سید عباس علی مہدی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر کوثر عثمان کے علاوہ یونانی انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر مقبول احمد خاں مہمان اعزازی رہے۔ سمینار میں حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، حکیم شمیم ارشاد، حکیم فیاض، ڈاکٹر نثار اعظمی، حیدر علوی، ڈاکٹر رضوان الرضا، ڈاکٹر عرفی فیض آبادی، ڈاکٹر عارف اصلاحی، ڈاکٹر فخر عالم، عرفان لکھنوی نے مختلف شاعر اطبا پر اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر افروز طالب نے کی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر احسان رؤف نے نبھائی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 فروری 2018

اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات

لکھنؤ: اردو کے غیر مسلم صحافیوں میں منشی نول کشور کا نام زرّیں حروف سے لکھا جائے گا، اردو صحافت میں منشی نول کشور کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اردو عربی کتابوں کی طباعت میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے منشی نول کشور نے 1858 میں لکھنؤ سے اودھ اخبار شروع کیا۔ ان خیالات کا اظہار عطاء اللہ سنجری نے اکادمی آف ماس کمیونکیشن کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے اکادمی آف ماس کمیونکیشن ہال، قیصر باغ لکھنؤ میں 'اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات' کے موضوع پر منعقد یک روزہ سمینار میں کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عارف ایوبی (چیئرمین فخرالدین علی میموریل کمیٹی) اور ایس رضوان احمد (سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی) نے مشترکہ طور پر کہا کہ انیسویں صدی میں اردو صحافت کے آسمان پر غیر مسلم صحافی چھائے رہے۔ آگرہ کے صدر الاخبار کے کیدار ناتھ، فوائد الشائقین کے پربھو دیال، بنارس اخبار کے بابو رگھوناتھ تھاٹھے، مفید ہند کے منشی ایودھیا پرساد، مالوا اخبار کے دھرم نرائن، کوہ نور کے منشی ہرسکھ رائے، اور لالہ جگت نرائن، زائرین ہند کے ہرونس لال وغیرہ نے اردو صحافت میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مہمان اعزازی ہندی کے ادیب و صحافی روشن پریم یوگی، پروفیسر صابرہ حبیب، فیاض رفعت اور محمد طارق نے کہا کہ اردو صحافت کی زرّیں تاریخ غیر مسلم صحافیوں کی خدمات سے اس قدر پر ہیں کہ اس سے انکار، اردو صحافت سے انکار ہے۔ سمینار میں افتتاحیہ کلمات اکادمی آف ماس کمیونکیشن کے روح رواں محسن خان نے ادا کیے۔ اس موقعے پر پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے شاہد کمال نے کہا کہ منشی نول کشور کو اردو اخبارات میں وہی مقام حاصل ہے جو انگلینڈ میں جان والٹر اور بارمس ورتھ کو حاصل تھا۔ 1887 میں لکھنؤ سے ایک بڑا اخبار اودھ پنچ منظر عام پر آیا اور اس اخبار نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، اکبر الٰہ آبادی قابل ذکر صحافی ہیں۔ دیگر مقالہ نگاران میں ڈاکٹر اشہد کریم، ڈاکٹر رضیہ بیگم، نجّے مشرا شوق، محمد عرفان احمد اور عارف الرحمٰن نے بھی اپنے عمدہ مقالوں سے سمینار کو زندگی عطا کی اور سبھی مقالہ نگاران نے کہا کہ اردو صحافت میں گراں قدر خدمات انجام دینے میں منشی نوبت رائے کے خدنگ نظر، دیا نرائن نگم کے 'زمانہ' کو فراموش کرنا اردو صحافت کے ساتھ ظلم کرنا ہوگا۔ پروگرام کے آخر میں کنوینر اسد یار خاں نے مہمانوں، مقالہ نگاروں، حاضرین اور صحافیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ایک سمینار اور موضوع کے لیے تعاون فرمایا جس پر کام ہونا وقت و حالات کی اشد ضرورت تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، 12 فروری 2018

اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے

دیوبند: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

'اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

کے اشتراک اور سوسائٹی فار سوشل ویلفیئر اینڈ ڈیولپمنٹ (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے سے' کا انعقاد شعبۂ اردو کے پریم چند سمینار ہال میں ہوا جس کی صدارت صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خالد محمود نے شرکت کی۔ بعد ازاں مہمان خصوصی پروفیسر خالد محمود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسماعیل میرٹھی کا عہد اردو زبان وادب کا سنہرا عہد تھا۔ اس عہد میں سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں موجود تھیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی وسیع اور کثیر الجہات خدمات سے اردو کا جہاں روشن ہے۔ اس عہد میں اردو کی ان بلند قامت شخصیات کے درمیان اسماعیل میرٹھی نے اپنی انفرادیت اور اہمیت ثابت کی اور ان سبھی نے اسماعیل میرٹھی کی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں اور خصوصاً ادب اطفال کے تعلق سے ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی ندرت اور ان کے قوافی کی داد دیتے ہوئے شبلی نے انھیں 'خدائے قوافی' تک کہہ دیا ہے۔ اس خیال کی روشنی میں اسماعیل میرٹھی کی فکری اور فنی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ بچے ملک کا مستقبل ہوتے ہیں اور ایسی تحریک ہمیں اسماعیل میرٹھی کی نظموں سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اسماعیل میرٹھی نے اپنی درسی کتب سے اردو کی تدریس کی بلند و بالا عمارت کی بنیاد رکھی۔ بچوں کی عمر، نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق اسباق تیار کر کے اسماعیل میرٹھی نے نونہالوں کی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کیا۔ سمینار کے دوسرے اور تیسرے اجلاس کی مجلس صدارت پر بالترتیب محترم طالب زیدی میرٹھ، محترم مختار صدیقی (مرادآباد)، اقبال احمد صدیقی (آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد) ڈاکٹر شاہد ملک (ایس نئی دہلی)، پروفیسر تنویر چشتی (سابق ممبر پلاننگ کمیشن، اتراکھنڈ)، ڈاکٹر سراج الدین احمد (میرٹھ)، رونق افروز رہے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور مولانا جبرئیل نے کی۔ ان دونوں سیشنوں میں مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 فروری 2018

اردو صحافت میں طنز و مزاح

مراد آباد: کے سی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک قومی سمینار باشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بعنوان 'اردو صحافت میں طنز و مزاح' مقامی شان انٹر کالج کبیر نگر میں منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کے سرپرست ڈاکٹر مختار فہیم اور کنوینر ڈاکٹر منصور احمد صدیقی تھے۔ پروگرام کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی۔ نظامت کے فرائض منصور احمد صدیقی نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ مشہور سینئر صحافی اسد رضا تھے۔ مہمانان اعزازی میں سابق بی ڈی او ڈاکٹر فرید احمد اور مختار صدیقی تھے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عبدالکریم، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر آصف، ڈاکٹر زیبا ناز، سید محمد ہاشم، ڈاکٹر اعجاز احمد نے صحافت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 287 فروری 2018

بیکل اُتساہی شخص اور شاعر

اعظم گڑھ: لکھنؤ شاہراہ پر واقع موضع داؤد پور میں واقع فاطمہ گرلس کالج داؤد پور کی انتظامی کمیٹی دی مسلم ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی اعظم گڑھ کے زیر اہتمام ملک کے مایہ ناز شاعر پدم شری بیکل اتساہی پر 'بیکل اتساہی شخص و شاعر' کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے اشتراک سے منعقد اس سمینار کا افتتاح حافظ جمشید احمد کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ بعد ازاں کالج کی طالبات نے استقبالیہ نظم پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے بیکل اتساہی کی حیات اور کارناموں اور مرحوم سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں غزل، گیت، نظم و دوہے کے ساتھ ساتھ تمام اصناف سخن پر دسترس حاصل تھی، وہ تمام اصناف سخن میں اپنا الگ انداز رکھتے تھے۔ انھوں نے باضابطہ طریقے سے اگر گیت کہے تو دوسری طرف نئی صنفوں کے دروازے بھی کھولے جو آج ہمارے لیے سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر بدرالدجی خاں (علی گڑھ) نے کہا کہ ان کا صرف تخلص ہی بیکل نہیں تھا بلکہ وہ واقعی بیکل تھے اسی بیکلی نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا تھا۔ ان کے گیتوں میں حب الوطنی کا بھی رنگ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس وطن کو جو کچھ دیا ہے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے نظامت کے فرائض بحسن خوبی انجام دیے۔ سمینار کے افتتاحی سمینار کے دوران بیکل اتساہی کے لائق فرزند اعجاز بیکل اتساہی نے اپنے والد کی کئی غزلیں اور گیت پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی نے تمام شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 فروری 2018

اردو ناول نگاری میں سماج کی عکاسی

امروہہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہاشمی کالج میں ایک سمینار بعنوان '21 ویں صدی میں اردو ناول نگاری میں سماج کی عکاسی' منعقد کیا گیا جس کی صدارت عبدالسلام منصور نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر انجمن ترقی اردو اترپردیش کے سکریٹری مشکور حسن شوق امروہوی موجود رہے۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ آغاز قاری محمد حنیف نے تلاوت قرآن پاک سے کیا جبکہ نعت پاک کا نذرانہ شاعر اسلم بقائی نے پیش کیا۔ سمینار میں اردو اکادمی کے سابق رکن سید محمد ہاشم نے کہا کہ ناول اطالوی زبان کے لفظ Novela سے نکلا ہے۔ لغت کے اعتبار سے ناول کے معنی نادر اور نئی بات کے ہیں لیکن صنف ادب میں اس کی تعریف بنیادی زندگی کے حقائق بیان کرنا ہے۔ مشکور حسن شوق نے کہا کہ ناول ایک فرضی نثری قصہ یا کہانی ہوتی ہے جس میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ صنف

ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ اردو ادب میں ناول کی روایت بہت قدیم نہیں ہے کیونکہ سو، سوا سو سال کی مدت کسی ادبی صنف کے ارتقا کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر، خورشید احمد راہی، ترنم پروین اور غزالہ تبسم نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔

روزنامہ اخبار مشرق دہلی، 13 فروری 2018

'وارث علوی کا تنقیدی شعور' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

آزادی کے بعد سرکاری اردو اداروں کی خدمات

پٹنہ: معروف سماجی تنظیم امن فاؤنڈیشن جھا جھا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے اشتراک سے بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے آڈیٹوریم میں سمینار بعنوان 'آزادی کے بعد سرکاری اردو اداروں کی خدمات' منعقد کیا گیا۔ سمینار میں اردو اداروں سے وابستہ اہم شخصیات نے شرکت کی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی مقررین نے سرکاری اداروں کے حوالے سے پر مغز اور معنی خیز گفتگو کی۔ سمینار کا آغاز امن فاؤنڈیشن کے سکریٹری جناب مقبول احمد، ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ سمینار کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو سے ہمیں عشق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ عشق ہی ہمیں اردو کے فروغ میں مدد کر سکتا ہے۔ جبکہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ سرکاری ادارے امداد دے سکتے ہیں، وسائل فراہم کر سکتے ہیں لیکن اردو کا درد اور جذبہ ہمیں ہی پیدا کرنا ہوگا۔ اردو کی ترقی کے لیے اداروں اور افراد کو یکساں سطح پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی بہار اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر مشتاق احمد نوری نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرکاری ادارے تنہا اس بدحالی کے ذمے دار نہیں ہیں۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہماری اولادیں اردو سے کیوں دور ہوتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم نسل نو کو اردو زبان میں تعلیم و تربیت دیں، ساتھ ہی نئی نسل کو ثقافت و تہذیب سے واقف کرائیں۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر سید احمد قادری نے کہا کہ اردو کا مرثیہ نہ پڑھا جائے بلکہ اس کی بقا کے لیے زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر جناب خورشید حیات نے اردو کی ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے نئے چیلنجوں کے حوالے سے بات کی۔ افتتاحی سیشن کی نظامت ڈاکٹر امتیاز وحید نے کی۔ سمینار کے پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی اور ڈاکٹر مشتاق احمد نوری نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثوبان سعید نے انجام دیے۔ سمینار کے دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر اسرائیل رضا، جناب خورشید حیات، ڈاکٹر سید احمد قادری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریحان حسن نے ادا کیے۔ دونوں سیشن میں پر مغز اور اہم مقالے پڑھے گئے۔ سمینار میں خورشید حیات، شہناز رحمان، انجمن پروین اور ڈاکٹر رضوانہ پروین کی کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔ پروگرام کا اختتام ناہید تبسم کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ اخبار مشرق، دہلی 27 فروری 2018

وارث علوی کا تنقیدی شعور

احمد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی اور دی اکھل بھارتیہ سد بھاونا ٹرسٹ احمد آباد کے باہمی اشتراک سے ایک عظیم الشان قومی سمینار بعنوان وارث علوی کا تنقیدی شعور 4 فروری 2018 بروز اتوار سردار ولبھ بھائی اسمارک بھون (سیمینار ہال)، لال دروازہ، احمد آباد، میں پورے تزک و احتشام کے ساتھ انعقاد پذیر ہوا۔

سیمینار کی صدارت ابہام رشید نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر ثروت خان نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وارث علوی تنقید کے میدان کا قطب تارہ ہے جس نے اپنی درخشانی سے گجرات صوبے کو ہی نہیں اردو کے جید نقادوں کے تنقیدی شعور کو بھی روشنی بخشی کہ جو خود ان کی زندگی میں رشک کا سبب بنی۔ ڈاکٹر ثروت خان کے بعد ڈاکٹر انور ظہیر اور اس کے علاوہ جن مقالہ نگاروں نے پرچے پڑھے، ان میں محترمہ شیبا حیدر، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم، ڈاکٹر حنا کوثر، اشفاق منصوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ مقالوں کی قرأت کے بعد ڈاکٹر ثروت خان اور ڈاکٹر انور ظہیر نے پیش کیے گئے مقالات پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ جناب ندیم انصاری کے زیر صدارت دوسری نشست کا آغاز ہوا۔ مقالہ نگاروں میں جناب عبدالحفیظ، جناب احمد حسین، ڈاکٹر شاہ نور بانو، ڈاکٹر فریدا بانو، ڈاکٹر نادرہ خاتون کے نام قابل ذکر ہیں۔ صدر نشست جناب ندیم انصاری نے پڑھے گئے مقالات پر تنقیدی نظر ڈالی۔

اختتامی کلمات شبیر ہاشمی نے ادا کیے۔ انھوں نے مہمان خصوصی، مقالہ نگار حضرات اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، (بھارت سرکار) نئی دہلی کی اردو زبان کی ترویج و اشاعت سے متعلق خدمات کی ستائش کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس پورے پروگرام کی نظامت جناب ہارون بشر رضوی صاحب نے کی۔

پریس ریلیز: اشفاق شیخ، گجرات، 26 فروری 2018

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............ بتاریخ............ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام: ....

پتہ: ....

دستخط

5 روزہ اردو جرنلزم ورکشاپ

باندرہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور روزنامہ انقلاب کے باہمی اشتراک سے 5 روزہ 'اردو جرنلزم ورکشاپ' کا آغاز کیا گیا۔ ورکشاپ کا افتتاحی پروگرام سینٹ اینڈریوز آڈیٹوریم، باندرہ ویسٹ میں

منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ریاستی وزیر ونود تاوڑے نے شرکت کی۔ صبح ساڑھے 10 بجے منعقد ہونے والی اس تقریب میں ریاستی وزیر برائے تعلیم ونود تاوڑے بطور مہمان خصوصی موجود تھے جبکہ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم اور ایڈیٹر انقلاب شاہد لطیف کی موجودگی میں سابق ڈائرکٹر حمیداللہ بھٹ، معروف ادیب اور فلم نویس جاوید صدیقی اور روزنامہ 'آگ' لکھنؤ کے ایڈیٹر ابراہیم علی نے بطور مہمان شرکت کی۔ اس دوران ابراہیم علوی نے اردو صحافت پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ این سی پی یو ایل کے سابق ڈائرکٹر حمیداللہ بھٹ نے اردو کی گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی کسی زبان میں اگر سب سے زیادہ ہندوستان ہے تو وہ صرف اور صرف اردو زبان ہے۔ اس دوران انھوں نے پریس کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر بھی توجہ دلائی۔'' معروف صحافی، ادیب اور فلم رائٹر جاوید صدیقی نے لیتھو پریس سے لے کر موجودہ دور تک کا احاطہ کرتے ہوئے صحافت کے مختلف ادوار کا تذکرہ انتہائی خوب صورتی سے کیا اور بتایا کہ 1960 کی دہائی میں روبکس ہوٹل سے بسم اللہ ہوٹل کی گلی تک محض 200 گز کے فاصلے پر تقریباً 20 اردو اخبارات کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ روزنامہ 'آگ' کے ایڈیٹر ابراہیم علوی نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو صحافت اور اس کے مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انھوں نے اپنے طویل صحافتی تجربے کی روشنی میں کہا کہ اخبار کا مالک ایڈیٹر یا سرمایہ لگانے والا نہیں بلکہ اس کا قاری ہوتا ہے جو اپنی گاڑھی کمائی سے اخبار خریدتا ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ارتضی کریم نے ورکشاپ میں حصہ لینے والے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ جو میدان بھی منتخب کریں، اس میں امتیازی کارکردگی کی کوشش کریں تو کامیابی بھی ملے گی اور نام بھی ہوگا۔''

ورکشاپ کے دوسرے دن اتوار کو ممبئی یونیورسٹی (کالینہ کیمپس) کے مولانا آزاد بھون ممبئی کانفرنس ہال میں 'فیچر نویسی' کی تکنیک اور تقاضوں پر روشنی ڈالتے ہوئے روزنامہ ممبئی اردو نیوز کے مدیر شکیل رشید نے صحافت کے طلبہ کو بتایا کہ اردو میں فیچر نویسی کی کوئی روایت نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو اخبارات میں فیچر نہ شائع ہوتے ہوں۔ اس کے ثبوت کے طور پر انھوں نے متعدد اردو اخبارات کے فیچر صفحات کی مثال پیش کی اور کہا کہ اگر وسائل کی کمی نہ ہو تو اردو اخبارات بھی ایک ایک فیچر کے لیے ایک ایک صفحہ مختص کرسکیں۔ شکیل رشید نے خبر نگاری اور فیچر نگاری کا بنیادی فرق واضح کیا اور مثالوں کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اچھے فیچر کے لیے اچھی زبان اور اچھے موضوعات کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ فیچر نگاری میں کن باتوں کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے اس پر قطب الدین شاہد نے کئی اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ اس اولین اجلاس کے دوران ہی قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم اور سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے ورکشاپ کے شرکا سے ملاقات اور گفتگو کی۔ دوسرے دن کے دوسرے اجلاس میں آئی بی این لوک مت کے ایڈیٹر پرساد کاتھے نے ''تفتیشی صحافت کیا ہے اور اس میں کن چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے'' پر اپنے عملی تجربات کی روشنی میں اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' 25 و 26 فروری 2018

کوکن میں اردو: سمت و رفتار

رتناگری: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور شعبہ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری کے باہمی اشتراک سے 'کوکن میں اردو: سمت و رفتار' کے عنوان پر رادھا بائی شیٹے سبھا گرہ، گوگٹے کالج کیمپس میں ایک روزہ بین الاقوامی سیمنار 10 فروری کو منعقد کیا گیا جس میں دوحہ قطر سے حسن عبدالکریم چوگلے اور کویت سے میمونہ علی چوگلے کے علاوہ ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد، نئی دہلی، نظام آباد، اورنگ آباد، پونے اور کئی دوسرے شہروں سے اردو کے اہل قلم اور ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ معروف نقاد و شاعر، محقق اور کالم نگار شمیم طارق نے کلیدی خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو نام کی کوئی زبان تاریخ کی کسی بھی دور میں بولی نہیں گئی، اردو نام کی کوئی زبان ہے تو وہ ہندوستان ہی میں ہے، یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔''

دوسرے اور تیسرے دن کے مراٹھی اخبارات نے اس سیمنار کی رپورٹ شائع کی تو یہی سرخی لگائی کہ ہندوستان سے اردو کا رشتہ اٹوٹ ہے اور اردو نے ہندوستانیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہی ہندوستانی تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد مثالیں دیں۔ ان کے اس انکشاف نے سامعین کو حیران کردیا کہ ویر ساورکر بھی اردو داں تھے اور وہ اپنی شاعری اردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ کوکن کا خطہ اردو کے لیے بڑا زرخیز خطہ واقع ہوا ہے۔ شمیم طارق نے جہاں اردو کو خالص ہندوستانی زبان ثابت کیا وہیں کوکن اور اہلیان کوکن سے اردو کے رشتے کو اجاگر کرتے ہوئے کوکن کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، افسانہ نگاروں، ترجمہ کرنے والوں کے کئی درجن نام گنائے اور ان کی خدمات کے علاوہ ان کی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کیا۔ صدارت رتناگری ایجوکیشن سوسائٹی کی چیئرپرسن محترمہ شلپا تائی پٹوردھن نے کی۔ پرنسپل ڈاکٹر کشور سکھٹن کرنے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروفیسر محمد دانش غنی صدر شعبہ اردو نے اس سیمنار کی غرض و غایت بیان کی اور نظامت کے فرائض معین اچلپوری نے ادا کیے۔ ڈاکٹر چترا گوسوامی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: دانش غنی، رتناگری، مہاراشٹر، 15 فروری 2018

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

فرہنگ آصفیہ اب نئی شکل میں

(تین جلدوں پر محیط)

قیمت.................1755 روپے

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

اے ایم یو کشن گنج شاخ کو سو کروڑ روپے

نئی دھلی: انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر

پرکاش جاوڈیکر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کشن گنج سنٹر کے لیے سو کروڑ روپے کی گرانٹ جلد جاری کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ یہ یقین دہانی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کی قیادت میں وفد میں شامل ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ کو کرائی۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ مودی حکومت کا ایجنڈا 'سب کا ساتھ سب کا وکاس' ہے اور ان کی وزارت بھی اسی پر عمل پیرا ہے اور کسی بھی تعلیمی ادارے کو فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہم سب مل کر ملک کو آگے لے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) حکومت میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ حکومت تعلیم کے تئیں بہت حساس ہے اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی سمت میں کام کرے گی۔ مسٹر اسلم علیگ نے بتایا کہ وزیر موصوف نے ہماری باتوں کو بہت ہی سنجیدگی سے سنا اور اے ایم یو کشن گنج کے مسئلے کو جلد از جلد حل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ سنٹر کو جلد رقم مل جائے گی اور زیر التوا کام پورے ہو جائیں گے اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری ہو سکے گا۔ اس موقعے پر مسٹر جاوڈیکر کو اے ایم یو کشن گنج کے سلسلے میں ہیومن چین کی طرف سے ایک میمورنڈم بھی پیش کیا۔ وفد میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کے علاوہ ہیومن چین کے محمد توقیر عالم، نوید شمسی، نسیم حیدر، مجاہد اختر سمیر ہمایوں وغیرہ شامل تھے۔ واضح رہے کہ اے ایم یو کشن گنج کیمپس میں سال 2013 سے بی ایڈ اور سال 2014 سے ایم بی اے کی پڑھائی ہورہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 فروری 2018

200 طلبا کو یو پی ایس سی کی تیاری کرائے گی وقف کونسل

نئی دھلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے 200 طلبا کو یو پی ایس سی امتحان کے لیے کوچنگ کرانے کا وقف کونسل نے فیصلہ لیا ہے۔ 200 طلبا

کو مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تیار کرنا بھی ایک تاریخی عمل ہے، جس کی ہر سمت ستائش ہورہی ہے۔ غور طلب ہے کہ اقلیتی امور وزارت کے تحت سینٹرل وقف کونسل اس سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے 200 طلبا کو یو پی ایس سی کی سول سروس امتحان کے لیے کوچنگ مہیا کرائے گی۔ یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں گزشتہ سال اقلیتی طبقے کے 100 سے زائد امیدواروں کے کامیاب ہونے سے مرکزی اقلیتی امور کی وزارت نئے مالی سال میں سول سروس امتحانات کی تیاری کے لیے خصوصی دھیان دے رہی ہے۔ مرکزی وقف کونسل نے مالی سال 19-2018 میں مذکورہ بالا تینوں یونیورسٹیوں کے 200 طلبا کو یو پی ایس سی امتحانات کے لیے کوچنگ کرانے کے تحت 1.5 کروڑ روپے کا نظم کیا ہے۔ سینٹرل وقف کونسل کے سکریٹری بی ایم جمال کے مطابق مالی سال 19-2018 کے لیے وزارت نے وقف کونسل کے تعلیمی منصوبے کے لیے 2 کروڑ نظم کیا ہے۔ اس میں سے 1.5 کروڑ روپے 200 طلبا و طالبات کو یو پی ایس سی امتحانات کی تیاری پر خرچ کیے جائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ اے ایم یو کے 100، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے 50-50 باصلاحیت طلبا کو کوچنگ دلائی جائے گی۔ یو پی ایس سی کوچنگ کے لیے طلبا کا انتخاب مذکورہ بالا یونیورسٹی میں منعقد تحریری امتحان کے ذریعے ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ بقیہ 50 کروڑ روپے عورتوں کے اختیارات کے لیے خرچ کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مارچ 2018

جامعہ میں چار روزہ تربیتی ورکشاپ

نئی دھلی: خواتین کو سائنسی اور سماجی علوم کے تئیں بیدار کرنے کے لیے چار روزہ ورکشاپ کا انعقاد امریکہ کی اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سی آئی ٹی کانفرنس ہال میں کیا گیا ہے۔ اس ورکشاپ میں جموں و کشمیر کی تقریباً 25 طالبات شریک ہیں۔ اس ورکشاپ کا مقصد مسلم خواتین کو سائنسی علوم کے تئیں خود مختار بنانا اور اس میدان میں ان کی ہمت افزائی کرنا ہے۔ ورکشاپ کے افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے منی پور کی گورنر اور چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نجمہ ہپت اللہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم ہماری زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے، جس میں سائنس کو اہم درجہ حاصل ہے، سائنس کا مقصد غور و فکر کے علاوہ انسانی زندگی کو آسانی فراہم کرنا ہے۔ انھوں نے قدرتی وسائل کی حفاظت اور ان کے تئیں بیدار ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ سائنس کو ہمیں امن و سکون کا گہوارہ بنانے کی

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں چار روزہ تربیتی ورکشاپ

کوشش کرنی چاہیے۔ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ سائنس کے بارے میں مختلف قسم کے مفروضات ہیں، ضرورت ہے کہ ہم چیزوں کو اچھی طرح سے جانیں اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور یہ چیزیں ہمیں سائنسی علوم کے ادراک سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ پروگرام کی ڈائرکٹر پروفیسر سلطانہ ناہید نے کہا کہ اس کا مقصد خواتین کے مابین سائنسی اور سماجی علوم کے تئیں بیداری پیدا کرنا ہے، اس ورکشاپ کے ذریعے طالبات کو بتایا جائے گا کہ وہ بیرون ممالک خصوصاً امریکہ میں کیسے تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، اس کے کیا ذرائع اور وسائل ہوں گے۔ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر کرلن اروِنگ اور ڈاکٹر اکل پردھان بھی شریک تھے، جن کا تعلق اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی سے ہے۔ دونوں نے اپنے تاثرات میں سائنسی اور سماجی علوم کے تئیں خواتین کو خود مختار ہونے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ سائنس اس وقت ایک عالمگیر موضوع ہے جسے نظرانداز کرنا نادانی ہے۔ اس موقعے پر بین الاقوامی تعلقات عامہ کے کوآرڈی نیٹر سمیت پروفیسر باراں رحمان صدیقی، رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ اے پی صدیقی، ڈائرکٹر ایف ٹی کے سی آئی ٹی پروفیسر دوجا، چیف پراکٹر پروفیسر ہارون سجاد اور ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر نوید اقبال وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 فروری 2018

آپریشن ڈیجیٹل بلیک بورڈ

نئی دهلی: مرکزی حکومت نے تمام اسکولوں کو ڈیجیٹل بورڈ سے مربوط کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت فی الحال 25 کیندریہ ودیالیہ میں پائلٹ پروجیکٹ کے طور پر نظام چلایا جا رہا ہے۔ مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم اپیندر کشواہا نے کہا کہ ''آپریشن ڈیجیٹل بلیک بورڈ پروگرام کے تحت تمام اسکولوں کو ڈیجیٹل بورڈ سے مربوط کیا جائے گا اور اس کے لیے شروع کی گئی مہم میں 25 اسکولوں کو ٹیبلیٹس فراہم کرائے گئے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ''ابتدائی مرحلہ میں اسکولوں کو اسمارٹ بورڈ سے لیس کیا جائے گا اور اس کے لیے حال ہی میں مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (سی اے بی ای) نے منظوری بھی دے دی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''60 سال سے ہمارے ملک میں بلیک بورڈ کا استعمال کیا جا رہا ہے، اور اب تکنالوجی کے اس عہد میں ضروری ہے کہ اس بلیک بورڈ کو اسمارٹ بورڈ سے بدل دیا جائے۔ کشواہا نے مزید کہا کہ اب بچوں کو ڈیجیٹل بورڈس پر تعلیم دی جائے گی جس سے بچے اور بچیاں براہِ راست انٹرنیٹ اور آن لائن کتابوں سے جڑ پائیں گے۔ انھوں نے اساتذہ کی تربیت کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قومی کونسل برائے تربیت اساتذہ (این سی ٹی ای) کے مطابق ہندوستان میں تقریباً 14 لاکھ غیر تربیت یافتہ اساتذہ ہیں۔ حالانکہ ضابطے کے مطابق اسکولوں میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ نہیں رکھے جاسکتے۔ اس لیے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جتنے بھی غیر تربیت یافتہ اساتذہ ہیں ان کی تربیت 31 مارچ 2019 تک مکمل کر لی جائے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2018

دهلی:

غالب کے مطالعے کی اہمیت

نئی دهلی: غالب اکادمی نئی دہلی میں غالب کے مطالعے کی اہمیت پر ایک سمینار منعقد کیا گیا، جس میں جامعہ، جے این یو، دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات اور ریسرچ اسکالرز نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں دیکھنا ہے کہ غالب کی شاعری ہمارے عہد کو نئی بنیاد فراہم کر سکتی ہے یا نہیں۔ نئی نثر کی تعمیر میں غالب کی نثر بنیاد بن سکتی ہے کہ نہیں۔ آج کے دور میں غالب کے نام پر بہت سے ادارے قائم ہیں، کالجوں، سڑکوں کے نام غالب سے منسوب ہیں۔ غالب ہر جگہ موجود ہیں ان کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی فارسی غزلیں بے مثال ہیں لیکن اردو شاعری کی اپنی الگ حیثیت قائم ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ غالب کے یہاں جو چیز سب سے اہم ہے وہ ان کی زبان ہے۔ غالب اس لیے پڑھے جا رہے ہیں کہ ان کی تفسیر ابھی باقی ہے ان کے گنجینۂ معنی کا طلسم ابھی کھلا نہیں ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے مقالے میں غالب اور سیکولرزم میں کہا کہ غالب رجحان ساز شاعر ہیں۔ ان کی ندرت سوال یا شکایت قائم کرنے سے ہوتی ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر علیم اشرف نے غالب کی فارسی شاعری کے حوالے سے مقالے پیش کیے اور اس بات پر زور دیا کہ غالب کی عظمت کی بات جب کی جائے گی تو فارسی شاعری کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے غالب ہندوستانیت پر اپنا پرچہ پڑھتے ہوئے کہا کہ مثنوی چراغ دیر ہو یا دستنبو ہو یا مکاتیب ہوں یا اردو فارسی شاعری ہو ان کی وطن پرستی، باہمی اتحاد و رواداری، ہندوستانیت اور حب الوطنی اس دور کے تقاضوں کے مطابق ان پر صادق آتی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر طارق سعید، سہیل انجم، پروفیسر معظم الدین، ظفر محمود، ضیاء اللہ انور، حنا آفرین اور تالیف حیدر نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے دو اجلاسوں میں سولہ مقالے پڑھے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت جی آر کنول اور نظامت شاداب تبسم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور قاضی جمال حسین نے اور نظامت ترنم جہاں نے کی۔ آخر میں سکریٹری غالب اکیڈی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2018

ٹام آلٹر کی یاد میں ایک شام کا انعقاد

ٹام آلٹر کی یاد میں ایک شام کا انعقاد

نئی دهلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام 10 فروری کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے آڈیٹوریم میں ٹام آلٹر کی یاد میں ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سب سے پہلے معروف اداکار ٹام آلٹر پر دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے اپنی استقبالیہ گفتگو میں کہا کہ ٹام آلٹر نے اردو کو جیا ہے، وہ اردو کے عاشق تھے، ان کا تلفظ اور ان کی ادائیگی شاندار تھی۔ ٹام آلٹر کہتے تھے کہ میرے والدین لندن وغیرہ میں پیدا ہوئے مگر میں انڈین ہوں۔ اردو اور ہندی دونوں میری زبانیں ہیں، یہ شام ٹام آلٹر کے نام ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے پروگراموں اور ڈراموں سے اردو کے فروغ کو بڑی تقویت ملی ہے اور اردو کے لیے ان کا وجود نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساہتیہ کلا پریشد کے رکن اور معروف ادیب دلیپ کمار پانڈے نے کہا کہ ٹام آلٹر میں ہندوستانی روح پیوست تھی۔ وہ ہندی اور اردو سے برابر کی محبت کرتے تھے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس دور میں ٹام آلٹر جیسی شخصیت کو یاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی بقا میں ٹام آلٹر کی بڑی خدمات ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ٹام آلٹر کو یاد کرنا احسان شناس گروہ کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ٹام آلٹر کو یاد کرنا ہندوستان کی جیتی جاگتی جمہوریت کو یاد کرنا ہے۔ ٹام آلٹر کی اہلیہ کیرول ایوانس آلٹر نے کہا کہ اردو اکادمی کا بہت شکریہ کہ اس نے میرے شوہر کو یاد کرنے کے لیے شام کا انعقاد کیا۔ انھوں نے اپنے اس ملک کے لیے بہت محبت پیش کی ہے۔ صدارتی تقریر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ میں ادب سے وابستہ نہیں ہوں مگر یہاں آکر مجھے اچھا لگا۔ میں نے ان کی فلمیں دیکھی ہیں، ان کے تھیٹرز نہیں دیکھے، مگر ان کے بارے میں سن کر محسوس کر رہا ہوں کہ فلم سے ان کی شخصیت بہت بڑی ہے۔ آخر میں اردو اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری مستحسن احمد نے تمام مہمانان خصوصی، صدر جلسہ اور دیگر سامعین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت اطہر سعید نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2018

ہنر ہاٹ میں فن خطاطی کا مظاہرہ

نئی دهلی: مرکزی حکومت کی وزارت برائے اقلیتی امور کے زیر اہتمام نئی دہلی کے بابا کھڑک سنگھ مارگ، کناٹ پلیس میں جاری ہنر ہاٹ میں مختلف فنون کے ماہرین 10 فروری سے مسلسل اپنے ہنر دہلی والوں کو دکھا

رہے ہیں۔ دہلی کے علاوہ ملک کے مختلف ریاستوں سے آئے لوگ مختلف فنون کے ماہرین کے فن کو نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ ان کے ذریعے تیار کی جانے والی اشیا اپنے گھر بھی لے کر جا رہے ہیں۔ اس میں ہینڈی کرافٹ کی چیزیں لوگوں کے اشتیاق کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اپنی انگلیوں کے جادو سے سفید کاغذ پر اس طرح رقم کر رہے تھے جن کو دیکھ کر ہر آنے جانے والا بنا رکے آگے جا نہیں پا رہا تھا۔ صوفیہ این جی او کے زیر اہتمام قائم اس اسٹال پر اپنے زمانے کے بہترین خطاطی کا مظاہرہ پیش کر رہے تھے۔ شمال مشرقی ضلع دہلی کے ویلکم علاقے میں رہنے والے محمد زبیر کی ابتدائی تعلیم سرودیہ بال ودھیالیہ جعفر آباد (اردو میڈیم) سے ہوئی اور ذاکر حسین دہلی کالج سے انھوں نے پاس کورس کیا۔ محمد زبیر اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھیں ابتدا سے ہی خطاطی کا شوق تھا جس پر انھوں نے اسکول کے زمانے سے ہی دہلی اردو اکادمی کے کیلی گرافی کورس میں داخلہ لے لیا۔ محمد زبیر بتاتے ہیں کہ اساتذہ کی شفقتوں کے زیر سایہ انھیں ایسی تربیت حاصل ہوئی کہ دہلی اردو اکادمی نے انھیں اپنے یہاں کانٹریکٹ کی بنیاد پر کیلی گرافی سکھانے پر رکھ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ بہت سے کام ایسے ہیں جن پر کمپیوٹر نے پوری طرح قبضہ کر لیا ہے مگر خطاطی وہ فن ہے جو مٹانے سے بھی مٹنے والا نہیں ہے اور اس کے شائقین برابر سیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2018

عالمی یوم مادری زبان پر 23 ہندوستانی زبانوں کے مشاعرے کا انعقاد

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام عالمی یوم مادری کے موقعے پر ملک کی 23 زبانوں کے شعرا پر مشتمل مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح ڈوگری زبان کی معروف شاعر اور رائٹر پدما سچدیو نے کیا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ ہم جس بھی زبان کے بولنے والے ہیں وہ ہماری مادری زبان ہے اور وہ ہماری ماں کی ہی طرح ہوتی ہے جس کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ انھوں نے افسوس کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کی نئی نسل اپنی مادری زبان سے بہت دور ہے اور اس کے استعمال سے انجان ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ زبان ختم ہو جانے کی راہ پر گامزن ہے اور اس کو بچایا تبھی جا سکتا ہے جب اس کا بہتر اور زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ ڈوگری ہماری ماں ہے تو ہندی ہماری دادی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ڈوگری کے بعد اگر کسی زبان کو میں بہت زیادہ پسند کرتی ہوں تو وہ اردو زبان ہے۔ اس موقعے پر خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری کے شرینواس راؤ نے کہا کہ مادری زبان ہماری شناخت ہوتی ہے، جس کے ذریعے ہم اپنی ثقافتی پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی ملک کی 24 اہم زبانوں کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ نظامت ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر (ہندی) انوپم تیواری نے کی۔ مشاعرے میں اردو زبان کے شاعر تحسین منور، زیبن نارا (اسمیا) دیوکانت رام چریا (بوڈو)، گنیش بسپوتے (مراٹھی)، انامیکا (ہندی)، سجاتا چودھری (اڑیا)، موہن ہم تھاڑی (سندھی)، پرتھا نند کمار (کنڑ)، مال چند تیواڑی (راجستھانی)، ہریش مناشر (گجراتی) اور ارہیم میچو بی (منی پوری)، فیلو مینا سین فرانسکو (کونکنی)، اتم کمار چھیرتی (نیپالی)، ونیتا (پنجابی)، یعقوب (تلگو)، انیتا تھمپی (ملیالم)، رمن کمار سنگھ (میتھلی)، روی سبرامنیم (تمل)، گوبند چندر مانجھی (سنتالی) اور رما کانت شکل نے سنسکرت زبان میں اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 فروری 2018

تلنگانہ:

مانو میں قومی اردو سائنس کانگریس کا افتتاح

حیدر آباد: زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا، مذہب اور زبانیں توڑتی نہیں جوڑتی ہیں۔ قومی صحت کے لیے مذہبی اور لسانی تعصب سے دور رہنے کی ضرورت ہے۔ سائنس،

ذہنی کشادگی، رواداری اور شخصیت پرستی سے انکار کا درس دیتی ہے۔ سائنسی تعلیم کے لیے انگریزی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اس لیے طلبہ کو انگریزی سکھانے کا انتظام یونیورسٹی میں کیا گیا ہے تاکہ اگر وہ اعلیٰ تعلیم انگریزی سے حاصل کرنا چاہیں، یا کہیں ملازمت کی تلاش میں جائیں تو انھیں وقت نہ ہو۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے آج دو روزہ قومی اردو سائنس کانگریس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ سائنس کانگریس کا اہتمام اردو مرکز برائے فروغ علوم اور اسکول برائے سائنسی علوم کے اشتراک سے کیا جارہا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ اردو کے فروغ میں اردو سائنس کانگریس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔ گزشتہ سال مانو میں منعقدہ پہلی اردو سائنس کانگریس کا ثمر اب حاصل ہورہا ہے۔ توضیحی فرہنگ حیوانیات وحشریات جسے شمس الاسلام فاروقی نے مرتب و مدون کیا ہے آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اس نوعیت کی مزید کئی کتابیں زیرطبع ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کالج میں مولوی ذکاءاللہ اور ماسٹر رام چندر نے اردو میں سائنسی علوم کی کتابوں کی منتقلی کا کام شروع کیا تھا۔ بعد میں سائنٹفک سوسائٹی اور دیگر اداروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 1928 میں انجمن ترقی اردو کے بینر تلے 'سائنس' کے نام سے سہ ماہی پرچہ نکالا تھا۔ اردو کی نئی نسل کو سائنسی موضوعات سے متعارف کرانے اور ان میں سائنس کا ذوق وشوق پیدا کرنے کی غرض سے میں نے پچیس برس پہلے ماہنامہ 'سائنس' جاری کیا۔ مجھے نہایت خوشی اور اطمینان ہے کہ میری کوشش بیکار نہیں گئی۔ اس رسالے نے اردو قارئین میں اپنی جگہ بنائی اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ڈاکٹر ایم اے سکندر، رجسٹرار مانو نے سائنس کانگریس کے مندوبین کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے مقاصد میں اردو کا فروغ بھی شامل ہے۔ اس کانگریس کے انعقاد سے اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ مہمانِ خصوصی شاہ شمس الدین عثمانی تبریز، پرنسپل ایمیریٹس، انگلش اسپیکنگ اسکول، دبئی جو خصوصی طور پر کانگریس میں شرکت کے لیے حیدرآباد آئے تھے نے کہا کہ نام نہیں، کام کی اہمیت ہے۔ سنجیدہ لوگوں میں سے کچھ دیوانوں نے اردو کو سائنس سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اردو کو ترقی سے ہم کنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے چاہنے والے دیوانہ وار کام کریں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 فروری 2018

مسابقتی امتحانات اب اردو میں بھی

حیدرآباد: تلنگانہ میں تیلگو اور انگریزی میں منعقد کیے جانے والے مختلف مسابقتی امتحانات اب اردو میں بھی منعقد کرانے کا ریاستی حکومت نے فیصلہ کیا ہے۔ ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، جس کے پیش نظر اہلیتی امتحان کے پرچہ سوالات کو اردو میں فراہم کرنے کا ہائر ایجوکیشن کونسل نے فیصلہ کیا ہے۔ ذرائع کے مطابق ہائیر ایجوکیشن کونسل نے درکار انتظامات کرنے کی ہدایت دی ہے۔ اب تک مختلف کورسوں میں داخلوں کے لیے ہونے والے امتحانات کے پرچے کو تیلگو اور انگریزی میں فراہم کیے جاتے تھے، تاہم تعلیمی سال 2018-19 سے پہلی مرتبہ آن لائن اہلیتی امتحانات کے پیش نظر آن لائن فراہم کیے جانے والے سوالات اردو میں بھی فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سیٹ کمیٹی کو بھی تفصیلات سے واقف کرادیا گیا ہے۔ مادری زبان اردو والے طلبہ کے لیے یہ کافی مددگار ثابت ہوگا۔ پوسٹ گریجویشن کے مسابقتی امتحان میں اردو میں پرچہ سوالات دینے کا افسروں نے فیصلہ کیا ہے۔ انگریزی سے اردو زبان میں سوالات کے ترجمے کے لیے مترجمین کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 فروری 2018

جموں و کشمیر:

جموں وکشمیر میں کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل

سری نگر: جموں وکشمیر میں محبوبہ مفتی کی قیادت والی حکومت نے ریاست کی سرکاری زبان اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جموں وکشمیر کونسل برائے فروغ اردو زبان تشکیل دے دی ہے۔ محترمہ مفتی نے جمعہ کے روز مائیکرو بلاگنگ کی ویب سائٹ ٹویٹر پر اردو زبان وادب کی مایہ ناز شخصیت داغ دہلوی سے منسوب شعر

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

سے آغاز کرتے ہوئے لکھا ہماری حکومت نے جموں و کشمیر کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کونسل نہ صرف اردو زبان کو زندہ بلکہ اس کی ترقی و ترویج کے لیے کام کرے گی۔ واضح رہے کہ ریاستی وزیر برائے خزانہ ڈاکٹر حسیب درابو نے رواں برس جنوری کے اوائل میں قانون ساز اسمبلی میں بجٹ پیش کرتے ہوئے ریاست میں اردو کونسل تشکیل دینے کا اعلان کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اردو نہ صرف ریاست کی سرکاری زبان ہے جو یہاں کے تمام خطوں میں بولی جاتی ہے بلکہ یہ برصغیر ہند کے ثقافتی ورثہ کا ایک وسیع خزانہ ہے جسے عرف عام میں گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 فروری 2018

محفل نسا اور یوم اردو کمیٹی کے زیر اہتمام جشن اردو کا عظیم الشان انعقاد

کرناٹک:

محفلِ نسا اور یوم اردو کمیٹی کے زیر اہتمام جشنِ اردو کا عظیم الشان انعقاد

نسل نو میں اپنی مادری زبان اردو سے محبت پیدا کرنے اور ہمارے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کے لیے کوشاں محفلِ نسا اور یوم اردو کمیٹی کے زیر اہتمام بڑے پیانے پر جشنِ یوم اردو کا سالانہ جلسہ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر بھون میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ کا آغاز پروفیسر محمد منظور نعمان کے کلامِ پاک کی تلاوت سے ہوا۔ جناب مبین منور نے نعت شریف پیش کی۔ نائب صدر، محفلِ نسا ڈاکٹر زبیدہ بیگم نے استقبال کرتے ہوئے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ مہمانانِ خصوصی میں جناب کے رحمٰن خان، رکن پارلیمان، راجیہ سبھا، جناب آر روشن بیگ، وزیر برائے اربن ڈیولپنٹ، حج ووقف، حکومت کرناٹک، جناب نصیر احمد، چیرمین کرناٹکا اسٹیٹ میناریٹیز کمیشن، حکومتِ کرناٹک موجود تھے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر قدیر ناظم سرگرو، چیرمین کرناٹک اردو اکادمی، معروف افسانہ نگار محترمہ عذرا نقوی، محترمہ قمر جمالی، جناب اعجاز علی، چیرمین،

یوم اردو کمیٹی، جناب اقبال احمد بیگ، تبریز احمد وغیرہ کے علاوہ اساتذہ، ادبا، شعرا اور طلبا کی کثیر تعداد نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر شائستہ یوسف، صدر، محفل نسا نے اپنے خطاب میں ادارے کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ایک زندہ زبان ہے اس کے چاہنے اور بولنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب تک جو مقابلے ستاروں کی کھوج کے نام سے ریاستی سطح پر منعقد کیے جاتے رہے ہیں ان شاءاللہ آئندہ یہ مقابلے قومی سطح پر منعقد کیے جائیں گے اور انعام یافتگان کو 'ستارہ ہند' کے خطاب سے نوازا جائے گا۔ اس موقع پر معروف افسانہ نگار عذرا نقوی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس تقریب کی کامیابی پر محفل نسا کی صدر کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اتنی بڑی تعداد میں اردو کے پرستاروں کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کو اردو زبان کی طرف راغب کرانا چاہیے۔ محترمہ قمر جمالی نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو ہمارے تہذیبی ورثے سے جوڑنے کے لیے اردو زبان کی طرف راغب کرانا ضروری ہے۔ اس طرح کی انجمنیں اور مختلف تنظیمیں خود سے آگے بڑھ کر کوشش کریں گی تو اردو زبان زندہ و آباد رہے گی۔

اس تقریب میں اردو ستاروں کی کھوج کے انعام یافتگان کو 'اردو ستارہ' کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے نام ہیں۔ عبدل اویس، محمد جنید، محمد منہاج الدین پرواز، ندیم شیخ، ثاقب بگلی، ابرار باگیوازی، ڈاکٹر بتول قاضی، مسز زہرہ جبین، جناب سید محمد سلمان، رخسار پروین، تبسم بیگم اور مرزا داؤد بیگ۔ جلسے سے قبل محفل نسا اور یوم اردو کمیٹی کے زیر اہتمام اردو ریلی کا اہتمام کیا گیا۔ یہ عظیم الشان اردو ریلی اسکول اور کالج کے بچوں پر مشتمل چھوٹے میدان شیواجی نگر سے ہوتے ہوئے امبیڈکر بھون پہنچی جہاں پر جشن یوم اردو کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر فجیہہ سلطانہ اور پروفیسر سعیدہ بیگم نے انجام دیے۔ ہدیہ تشکر محترمہ صبیحہ جہان نے پیش کیا۔

پریس ریلیز: شائستہ یوسف، صدر محفل نسا، 26 فروری 2018

مہاراشٹر:

ای لرننگ ورکشاپ برائے اردو اساتذہ

شولاپور: اردو ذریعۂ تعلیم کو زندہ رکھنا ہے تو صرف یہی راستہ ہے کہ اردو مدارس جدید ٹکنالوجی سے آراستہ ہو جائیں۔ کوئی بھی زبان اس وقت تک فروغ نہیں پاتی جب تک کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ ای لرننگ طریقۂ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کی دوری کو دور کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی اور کاوش ممبئی کے صدر عامر انصاری نے خادمان اردو فورم شولاپور، بیگم قمر النسا کاریگر گلزار اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج شولاپور اور ڈیجیٹل اسٹپس کمیونٹی شولاپور کے اشتراک سے منعقد ای لرننگ ورکشاپ برائے اردو اساتذہ کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ شولاپور میں تیسرا عشرۂ اردو بڑے ہی آب و تاب سے منایا جا رہا ہے۔ یہ ورکشاپ اسی سلسلے کی ایک اہم سرگرمی ہے۔ شولاپور کے اس عشرۂ اردو کے اثرات اب ممبئی تک پہنچ گئے ہیں، اس کے مضافات میں بھی اس طرح کا عشرہ منایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید شیخ نے افتتاحی کلمات ادا کیے اور اس پروگرام کے کنوینر نبی لال شیخ نے تمہیدی بیان میں اس کے اغراض و مقاصد سے واقف کروایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2018

اعزاز و اکرام:

پروفیسر اختر الواسع

نئی دهلی: ملک کے معروف اسلامی اسکالر پروفیسر اختر الواسع کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروفیسر ایمیریٹس کے لیے نامزد کیا ہے۔ جامعہ کے رجسٹرار احمد پیام صدیقی کے دستخط سے

جاری نوٹیفکیشن کے مطابق یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے مجلس تعلیمی اور شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد کے ذریعے تشکیل شدہ کمیٹی کی سفارش پر پروفیسر اختر الواسع کو پروفیسر ایمیریٹس کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ پروفیسر اختر الواسع کو یہ اعزاز ان کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا ہے۔ جامعہ میں پروفیسر اختر الواسع کی وابستگی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے رہے گی۔ فی الحال پروفیسر اختر الواسع مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھ پور، راجستھان کے پریسیڈنٹ (وائس چانسلر) ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر اور ہیڈ، فیکلٹی آف ہیومنیٹیز کے ڈین، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر اور ادارے سے شائع ہونے والے چار علمی مجلات 'اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج'، 'اسلام اور عصر جدید'، 'اسلام اور آدھنک یگ' اور رسالہ جامعہ کے طویل عرصے تک مدیر رہے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع کو حکومت ہند نے 2013 میں پدم شری کے اعلی سرکاری اعزاز سے بھی نوازا۔ پدم شری حاصل کرنے والے وہ ہندوستان میں اسلامیات کے پہلے پروفیسر ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں حکومت ترکمانستان نے مخدوم قلی میڈل اور جامعہ اردو، علی گڑھ نے دکتور ادب ایوارڈ دیا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع حکومت ہند میں نیشنل کمشنر برائے لسانی اقلیات کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ انھیں حکومت امریکہ کی جانب سے مشہور علمی وقار 'فل برائٹ فیلوشپ' کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔ اسلامیات کے وہ پہلے فل برائٹ فیلو ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین بھی رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2018

مشہور افسانہ نگار محمد بیگ احساس سمیت 23 ادیبوں کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دهلی: اردو کے معروف افسانہ نگار اور مدیر محمد بیگ احساس سمیت 23 ادیبوں کو 2017 کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اکادمی کے نومنتخب صدر اور کنڑ کے مشہور ادیب چندر شیکھر امبار نے یہاں ایک باوقار تقریب میں ان ادیبوں کو ایوارڈ سے نوازا۔ اس ایوارڈ کے تحت ایک لاکھ روپے کا چیک، توصیفی سند اور ایک علامتی نشان دیا جاتا ہے۔ جن دیگر ادیبوں کو انعامات دیے گئے ان میں ہندی کے مشہور ناقد ڈاکٹر رامیش کنتل میگھ کے علاوہ افسر احمد (بنگلہ)، ریتا بارو (بوڈو)، شیو مہتا (ڈوگری)، ممنگ وئی (انگلش)، ارمی گھنشیام، ڈیسائی (گجراتی)، ٹی پی اشوک (کنڑ)، اوتار کرشن رہبر (کشمیری)، گیانن رگھوناتھ جوگ (کونکنی)، ادے نارائن سنگھ نچکیتا (میتھلی)، کے پی رام نی (ملیالم)، راجن توئی جامبا (منی پوری)، شری کانت دیش مکھ (مراٹھی)، وینا ہانگ کم (نیپالی)، گایتری صراف (اوڈیہ)، نچھتر (پنجابی) نیرج دیا (راجستھانی)، نیرج مشرا (سنسکرت)، بھوجنگا ٹوڈو (سنتھالی)، جگدیش لچھانی (سندھی)، ٹی دیوی پریا (تیلگو) شامل ہیں۔ خیال رہے کہ حیدرآباد میں رہنے والے محمد بیگ احساس اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کی پیدائش دس اگست 1948 کو حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے اردو ادب میں ماسٹرس ڈگری اور حیدرآباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

محمد بیگ احساس نے متعدد کتابوں کی تدوین کی۔ ان کی تخلیقات میں خوشہ گندم، حنظل (افسانوں کا مجموعہ)، شور جہاں (تنقیدی مضامین)، شاذ تمکنت (مونوگراف) وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں تلنگانہ ریاستی حکومت سے بہترین ادیب کا ایوارڈ اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے ذریعہ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سمیت متعدد دیگر ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔

ساہتیہ اکادمی نے انھیں ان کی کتاب دخمہ کے لیے ایوارڈ دیا ہے جو مختصر کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل بالخصوص حیدرآباد میں رہنے والوں کے اردگرد گھومتی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے جاری کردہ بیان کے مطابق "ان کی کی کہانیوں کا انداز اور طرز انوکھا ہے اور وہ قارئین پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ دخمہ اردو میں تحریر مختصر کہانیوں میں ایک اہم اضافہ سمجھا جائے گا۔"

روزنامہ 'میرا وطن' نئی دہلی، 13 فروری 2018

چندر شیکھر کمبار ساہتیہ اکادمی کے نئے صدر

نئی دھلی: کنڑ کے مشہور ڈرامہ نگار، شاعر، ناول نگار اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ مصنف چندر شیکھر کمبار ساہتیہ اکادمی کے صدر منتخب ہوگئے۔ مسٹر کمبار نے ایک سہ رخی مقابلے میں ہونے والا انتخاب جیت لیا۔ صدر کے انتخابات میں مراٹھی کے مشہور مصنف بھال چندر نیماڑے اور اوڈیا کے معروف مصنف پرتھا رائے بھی میدان میں تھے۔ مسٹر کمبار کی طرح دونوں گیان پیٹھ انعام یافتہ مصنف ہیں۔ دو جنوری 1937 کو کرناٹک کے بیلگام ضلع کے گھوڑے گیری میں پیدا ہونے والے مسٹر کمبار ہندی کے مشہور مصنف وشوناتھ پرساد تیواری کی جگہ لیں گے، جن کی مدت 31 دسمبر کو ختم ہوگئی۔ مسٹر کمبار نیشنل اسکول ڈرامہ کے صدر ہیں۔ انھیں 1983 میں سنگیت ناٹک اکیڈمی، 1991 میں ساہتیہ اکیڈمی 2001 میں پدم شری اور 2011 میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2011 میں سنگیت ناٹک اکادمی کے فیلو بھی بنائے گئے تھے۔ وہ ھیمپی میں کنڑ یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر بھی تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 فروری 2018

اطباء کو اعزازات

کولکاتا: فوڈ اور دواؤں کی ملاوٹ پر قابو پائے بغیر 'سب کے لیے صحت' مشن پر قابو پانا ممکن نہیں ہے اور ملاوٹ کرنے والوں کو سخت سے سخت سزا ملے، اس کے لیے قانون بنایا جانا لازمی ہے۔ یہ باتیں عالمی یوم یونانی میڈیسن کی مناسبت سے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (مغربی بنگال) اور نیچر وویدا کی جانب سے بھاشا بھون، نیشنل لائبریری، کولکاتا میں منعقدہ پہلے انٹرنیشنل سیمینار میں یونانی ڈاکٹروں سے خطاب کرتے ہوئے مغربی بنگال کے گورنر کیسری ناتھ ترپاٹھی نے کہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ طب یونانی کا فروغ ضروری ہے۔ یہ سستا اور طاقتور طریقہ علاج ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ طب یونانی صدیوں پرانا آزمایا ہوا طریقۂ علاج ہے۔ پروگرام کے آغاز پر نیچر وویدا کے مینجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر خالد سیف اللہ نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ جبکہ صدارت کے فرائض انٹرنیشنل یونانی طبی کانگریس بنگلہ دیش کے صدر پروفیسر اے کے محبوب الرحمٰن ساقی نے انجام دیے۔ سیمینار میں مرکزی ریاستی وزیر زراعت وفلاح و بہبود برائے کسان اور پنچایتی راج پرشوتم کے روپالا، ندیم الحق (رکن پارلیمنٹ)، وویک گپتا (رکن پارلیمنٹ)، احمد حسن عمران (رکن پارلیمنٹ) وغیرہ نے بھی مہمان ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔ اس موقعے پر آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی جانب سے یادگار مجلہ 'عالمی یوم یونانی میڈیسن' 2018 کا اجرا عمل میں آیا اور ڈاکٹر خالد محمود صدیقی (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، پروفیسر روح الامین (استاد، طبیہ حبیبیہ کالج اینڈ ہاسپٹل ڈھاکہ، بنگلہ دیش) کو حکیم ابن سینا انٹرنیشنل ایوارڈ، پروفیسر ایم اے فاروقی (استاد پی جی ڈپارٹمنٹ آف معالجات، گورنمنٹ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد) کو حکیم ابوالقاسم زہراوی انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر مسرور علی قریشی (سائنٹسٹ کیبل 4، سی سی آر یو ایم) کو ڈاکٹر عبدالرزاق ایوارڈ، پروفیسر فضل اللہ قادری (سابق استاد گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج، پٹنہ) کو علامہ کبیرالدین ایوارڈ اور ڈاکٹر و حکیم سید افروز حسین (کولکاتا) کو ڈاکٹر سید اشتیاق احمد ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ جبکہ ڈاکٹر سید احمد خاں کی مسلسل تیس سالہ طبی خدمات اور 18 اگست 2010 کو ہر سال یوگا، آیوروید اور ہومیوپیتھی کی طرح مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے یوم پیدائش پر یونانی میڈیسن ڈے منائے جانے کا خاکہ پیش کرنے کے اعتراف میں 'شان طب ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ واضح ہو کہ مذکورہ ایوارڈز مغربی بنگال کے گورنر کیسری ناتھ ترپاٹھی نے تفویض کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 فروری 2018

ایک شام پرویز عالم کے نام

نئی دھلی: سیمانچل میڈیا منچ کے زیر اہتمام شاہین باغ میں واقع منچ کے آفس میں 'ایک شام پرویز عالم کے نام' کے عنوان سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب میں سیمانچل میڈیا منچ کے کارکنان کے علاوہ سیمانچل سے تعلق رکھنے والی دیگر سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر حقانی القاسمی نے مہمان ذی وقار پرویز عالم کا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ پرویز عالم کی کہانیوں میں تحیر اور تجسس کی جو فضا ہے اس نے ان کی کہانیوں کو معنیاتی اور اسلوبیاتی حسن عطا کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی کہانیوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ علاقائی علامات واشارات کا عکس بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ سیمانچل میں تخلیقی ذہانتوں کی کمی نہیں ہے مگر وہاں کے فنکاروں کو وہ مواقع اور وسائل میسر نہیں ہیں جو ادبی دنیا میں شہرت اور شناخت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سماجی کارکن اور ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ نے کہا کہ پرویز عالم کی شخصیت حرکت وعمل سے عبارت ہے۔ اردو کی ادبی اور صحافتی محافل کی آراستگی میں ان کی کوششیں بہت اہم ہیں۔ منت رحمانی نے کہا کہ دہلی میں سیمانچل میڈیا منچ اپنے علاقے کے مسائل کو نہ صرف اجاگر کر رہا ہے بلکہ یہ ایک پریشر گروپ کے طور پر بھی کام کر رہا ہے۔ انگریزی کے صحافی منظر امام نے کہا کہ پرویز عالم کی کہانیاں سماج کو آئینہ دکھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں غور وفکر پر بھی مجبور کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ابصار احمد صدیقی، ڈاکٹر نعمان قیصر، محبوب الٰہی، محمد نوشاد عالم ندوی، پروگرام میں زی سلام سے وابستہ افسر عالم، سیمانچل میڈیا منچ کے جوائنٹ سکریٹری انوارالحق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پرویز عالم کی صحافتی اور ادبی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2018

نمرتا گوتم نے اردو تقریر و اشتہار میں اوّل مقام حاصل کیا

نئی دھلی: ایک ایسے وقت میں جب اردو زبان کو ملک کے مسلمانوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غیر مسلم طالبہ نمرتا گوتم نے اس طرح کی بات کرنے والوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ نمرتا گوتم نے اردو زبان میں منعقد ایک نہیں دو مقابلوں میں بازی مارتے ہوئے اول مقام حاصل کیا جی ہاں یہ حقیقت ہے۔ دراصل حضرت امیر خسرو کے یوم ولادت اور یوم اردو کو لے کر ملک

بھر میں پروگرام ہورہے ہیں تو دہلی کے الامین انسٹی ٹیوٹ میں بھی یوم اردو اور حضرت امیر خسرو کا یوم پیدائش دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس موقعے پر الامین انسٹی ٹیوٹ کے طلبا کے درمیان اردو زبان کو لے کر کئی مقابلے بھی ہوئے لیکن اس کی خاص بات یہ رہی کہ اردو زبان کو لے کر طلبا میں کافی جوش وخروش دکھائی دیا تو نعت، اردو مضمون نگاری، اشتہار پوسٹر اور اردو تقریر کے مقابلے بھی ہوئے۔ خاص بات یہ رہی انسٹی ٹیوٹ کی طالبہ نمرتا گوتم نے اردو تقریر اور پوسٹر واشتہار اردو میں اول مقام حاصل کیا۔ پریرنا کا کہنا تھا کہ اردو زبان اس ملک کی زبان ہے اور سب کی زبان ہے۔ غیر مسلم طالبہ نمرتا گوتم نے حضرت امیر خسرو کو پوسٹر کے ذریعے خراج پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کو اردو زبان کی مٹھاس اچھی لگتی تھی۔ اس لیے وہ بچپن ہی سے اردو زبان سیکھنا چاہتی تھی۔ پریرنا نے کہا کہ وہ اس بات میں یقین نہیں کرتی کہ اردو زبان کو سیکھ کر کریئر کے مواقع نہیں ہیں بلکہ ٹی وی چینل سے لے کر فلم انڈسٹری میں اردو زبان جاننے والوں کے لیے زیادہ مواقع ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2018

اجرا:

یہ مدھر احساس میرے

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج کے شعبۂ اردو میں رقیم علی کے شعری مجموعہ 'یہ مدھر احساس میرے' کی رسم اجرا کے موقعے پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کالج کے پرنسپل غیاث اسد خاں نے کی۔ اس موقعے پر افتتاحی خطاب کے دوران شعبہ اردو ڈاکٹر شباب الدین نے کہا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں بھی ہندی ہو یا اردو ادیب اپنی اہمیت کا لوہا منوا رہا ہے۔ ہم اپنی مصروف ترین زندگی کی مصروفیات سے جب بیزار ہوتے ہیں تو یہی ادب ہمارا سہارا بنتا ہے جس کی مدد سے ہم اپنے سارے درد وغم بھول جاتے ہیں جبکہ اس تھکن کا علاج ڈاکٹروں کے پاس بھی نہیں ہوتا لیکن غزل کا ایک شعر ہمیں وہ راحت دیتا ہے جس کی مثال دنیائے طب میں بھی نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تمام شعبوں میں تبدیلی آئی ہے۔ حتیٰ کہ ریاضی کے فارمولے بدل گئے ہیں لیکن ادب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ ادب احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 فروری 2018

'اردو شاعری میں تاج محل' کا اجرا

عربی ناول کا اردو ترجمہ 'تتلی کے پر'

قاھرہ: ''ہم لوگ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ مصر کے ساتھ ہمارے تعلقات ہر سطح پر استوار رہیں۔ اس سلسلے میں عربی ناول اجنحۃ الفراشۃ کا اردو ترجمہ ''تتلی کے پر' مصر اور ہندوستان کے درمیان علمی اور ثقافتی تعلقات کی نمائندگی کرتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مصر میں ہندوستان کے سفیر سنجے بھٹاچاریہ نے 49 ویں قاہرہ عالمی کتاب میلے کے ایک پروگرام میں کیا جس میں عربی ناول اجنحۃ الفراشۃ کے اردو ترجمہ 'تتلی کے پر' کا اجرا ہوا۔ اس

پروگرام میں ہندوستانی سفیر کے علاوہ ناول نگار محمد سلماوی، ہندوستان سے آئے ناول کے مترجم اور مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین اور قاہرہ یونیورسٹی میں اردو زبان کے استاد و نئی دہلی میں سابق ثقافتی مشیر ڈاکٹر احمد القاضی بھی شریک تھے۔ عربی مجمع سے اردو زبان اور ملک ہندوستان کا تعارف کراتے ہوئے احمد القاضی نے کہا ''ہندی اور اردو زبان میں صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان میں 21 سرکاری زبانیں ہیں۔ یہ ایک بڑا ملک ہے جہاں مختلف تہذیب، زبان اور مذہب کے لوگ کثیر تعداد میں رہتے ہیں۔ ناول کے مترجم ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کہا کہ موجودہ زمانے میں اردو زبان نے کافی ترقی کی ہے، اسی لیے عربی زبان سے اردو کے ترجمے پر کافی توجہ دی جاتی ہے۔ دینی کتابوں سمیت ناول، افسانہ، اشعار اور سوانح عمری کی سیکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2018

اردو شاعری میں تاج محل

نئی دھلی: امبیڈکر نیشنل کانگریس میڈیا سینٹر للتا پارک نئی دہلی میں 'اردو شاعری میں تاج محل' مرتب افتخار الزماں کی کتاب کا امبیڈکر نیشنل کانگریس کے قومی صدر نواب کاظم علی خاں کے بدست اجرا عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ آل انڈیا ریڈیو نیشنل چینل دہلی کے اردو پروگرام سے وابستہ افتخار الزماں کا اردو کے تحقیقی ادب سے صرف ذہنی ہی نہیں، بلکہ عملی رشتہ بھی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زماں کے اندر بے پناہ صلاحیت ہے۔ نواب کاظم علی خاں نے کہا کہ تاج محل محبت کی ایک ایسی نشانی ہے، جہاں نفرت کا بیج بونے والوں کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی محبت، دوستی اور امن کا پیغام اپنے دامن میں سمیٹ کر واپس جاتے ہیں۔ کتاب کے مرتب افتخار الزماں نے کہا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، اس لیے یہاں ہندو شعرا نے بھی اردو شاعری کے حوالے سے بے شمار نظمیں غزلیں اور گیت تحریر کیے ہیں۔ اس موقعے پر بھارتی مومن فرنٹ کے قومی نائب صدر حسام الدین انصاری، کھیا سلیم انصاری، اطہر حسین انصاری، محمد رضوان، افضل حسین، شایان معظم، ڈاکٹر نشاط، فلاح الدین فلاحی، شاد حسین، ایڈیٹر کامل یقین محمد صادق وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2018

وقت کی پکار

ناگپور: ناگپور کے حلقہ ادب سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد ابوالکلام کا گلوبل وارمنگ پر بچوں کا ناول 'وقت کی پکار' کا اجرا قومی اردو کانفرنس 2018 کے افتتاحیہ جلسہ میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی گچی باؤلی حیدرآباد کے ڈی ڈی ای آڈیٹوریم میں بدست ڈاکٹر اسلم پرویز وائس چانسلر اردو یونیورسٹی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر آنند ورما سابق پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد، پروفیسر ظفر احسن سبکدوش پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شاہ شمس الدین عثمانی تبریز پرنسپل امریٹس انگلش اسپیکنگ اسکول دہلی، پروفیسر شکیل احمد نائب شیخ الجامعہ نے بطور مہمانان خصوصی شرکت کی۔ ڈاکٹر عابد نے کانفرنس کی غرض و

غایت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر نجم الحسن نے رسم شکریہ ادا کی اور ڈاکٹر آمنہ تحسین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جلسہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مقالہ نگاروں اور مندوبین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: محمد مظہر الحق، انصار نگر، ناگپور، مہاراشٹر۔

درکھلے پچھلے پہر

ممبئی: نہرو سینٹر ورلی ممبئی کے سالانہ آل انڈیا مشاعرے کے موقعے پر عبدالاحد ساز (معروف جدید شاعر) کے تیسرے شعری مجموعہ 'در کھلے پچھلے پہر' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر شہپر رسول چیئرمین دہلی اردو اکادمی نظامت ڈاکٹر شمیم طارق (معروف صحافی وادیب)، کر رہے تھے۔ اجرا بدست افتخار قادری (سرپرست نہرو سینٹر) ہوا اور قاضی لطافت حسین (ڈائرکٹر کلچر نہرو سینٹر) بہ طور میزبان شریک رہے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے مشاہیر و معاصر شعرا موجود تھے۔

رپورٹ: سروش تنگیکر (افسر نہرو سینٹر ممبئی)، 19 فروری 2018

خبر مشن ادبی ڈائری 2018

ممبئی: گزشتہ دنوں 'امین فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام ایڈوکیٹ شاہد اعظمی کی آٹھویں برسی کے موقع پر ٹیکسی مینس کالونی، کرلا، ممبئی میں زیر صدارت عالی جناب حسین دلوائی (ممبر راجیہ سبھا) ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں شعراء کرام کے ساتھ ساتھ شہر کے معززین نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر نیوز ٹاؤن پبلشرز کی شائع کردہ 'خبر مشن ادبی ڈائری 2018' کا اجراء بدست محترم حسین دلوائی عمل میں آیا۔ ڈائری کی رونمائی کرتے ہوئے حسین دلوائی نے کہا کہ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا کام ہے، سال کا آغاز ہوتے ہی طرح طرح کی ڈائریاں ہماری نظروں سے گزرتی ہیں لیکن اس طرح کی ادبی ڈائری اب تک میری نظروں سے نہیں گزری۔ مجھے اُمید ہے کہ اس ادبی ڈائری کو اُردو دُنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اشتیاق سعید نے ڈائری کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بیشتر شعراء و اُدباء ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد سے واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس ڈائری میں 84 رسائل و جرائد کے پتے، فون نمبر اور میل آئی ڈی شائع کیے ہیں اور ان رسائل و جرائد میں تخلیقات بھیجنے کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز ہر صفحے پر ایک شاعر یا ادیب کی تصویر کے ساتھ ایک شعر شائع کیا ہے۔ اس جلسے میں مہمانانِ خصوصی کے طور پر شمیم خان نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، مہاراشٹر 15 فروری 2018

وفیات:

کنور بہادر سکسینہ ارمان بسولوی

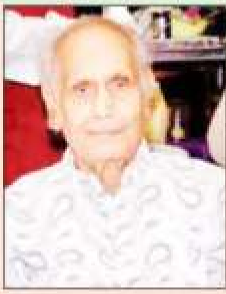

غازی آباد: کہنہ مشق شاعر کنور بہادر سکسینہ کا طویل علالت کے بعد 16 فروری کو اپنے بیٹے کے مکان پر اکیانوے سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا قلمی نام ارمان بسولوی تھا۔ آنجہانی ارمان بسولوی بدایوں کے بسولی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا وہیں ہوئی اور شروع شروع میں انھوں نے بدایوں کے مشہور شاعر کاشی نرائن جوہر سے تلمذ اختیار کیا۔ بعد میں بریلی کے مشہور شاعر شیام موہن لال جگر سے اصلاح لیتے رہے۔ اردو کے کئی رسائل، جرائد اور اخبارات میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام 'علاج غم' اور دوسرے شعری مجموعے کا نام 'ردِعمل' ہے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹے دیپک سکسینہ کے علاوہ پانچ بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک بیٹی نمی رستوگی دہلی کی ایک مشہور ڈاکٹر، سماجی کارکن اور عام آدمی پارٹی کی لیڈر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 فروری 2018

شمس رمزی

نئی دهلی: شاعر و صحافی اور نقاد جمیل احمد شمس رمزی کا 18 فروری کو 56 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا جن کی نماز جنازہ امیر حمزہ مسجد کے امام قاری سراج احمد نے پڑھی۔ سیکڑوں سوگوار صحافی، ادیب، شعرا اور مقامی معزز شخصیات کی موجودگی میں ویلکم قبرستان میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور ایک شادی شدہ بیٹی ہے۔ انتقال کی خبر عام ہوتے ہی آخری دیدار کے لیے ان کی رہائش گاہ گوتم پوری میں عوام و خواص کا تانتا لگ گیا اور یہ سلسلہ قبل نماز جنازہ تک جاری رہا۔ تدفین میں جن ادبا و شعرا نے شرکت کی ان میں منیر ہمدم، اسلم دہلوی، آفتاب آذر، شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، مستقیم خان، جاوید قمر، سیف سحری، مجاز امروہوی، مولانا وکیل احمد اشرفی، مولانا عالم رضا انور غازی آبادی، وارث وارثی، مظفر علی عرف کے بھائی سابق چیئرمین گنور، اسلم چشتی (پونہ)، جاوید مشیری، عبدالسمیع سلمانی، مولانا جاوید قاسمی کے علاوہ عمائدین شہر کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 فروری 2018

شاہد میر

بھوپال: مالوہ کی شعری روایت کے امین، ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور پارکھ، مشہور سائنس داں ڈاکٹر شاہد میر کا 22 فروری کو بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 69 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ مسرت شاہد شامل ہیں۔ مولانا آزاد یونیورسٹی (جودھپور) کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے یہ اطلاع دیتے ہوئے شاہد میر کے انتقال کو ایک کثیر الاوصاف شخصیت، ہماری تہذیبی و ثقافتی و ادبی روایت کے ممتاز نمائندے کا ہمارے بیچ سے اٹھ جانا قرار دیا ہے۔ سرونج میں 1949 کی 10 فروری کو آنکھیں کھولنے والے شاہد میر (شاہد میر خاں) کے شعری مجموعے موسم زرد گلابوں کا اور سازینہ، کلپ ورکش، اے سمندر کبھی اتر مجھ میں کو خاصی پذیرائی ملی۔ مرحوم دوہے راجستھان کے ہفت ورنگ، سخن معتبر کے بھی خالق تھے۔ سہ ماہی انتساب نے 2011 میں شاہد میر نمبر نکالا تھا۔ مدھیہ پردیش، راجستھان اور بہار اردو اکادمیوں اور غالب اکادمی کرناٹک سے ایوارڈ یافتہ شاہد میر نے 1972 سے سنگیت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 23 فروری 2018

خراج عقیدت:

عارف قاضی کی وفات پر تعزیتی نشست

نئی دهلی: اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی اونتی پورہ کشمیر کے شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر عارف قاضی کے اچانک انتقال پر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی اور کل ہند انجمن اساتذہ و علما عربی زبان نے مشترکہ طور پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا۔ تعزیتی نشست کی صدارت پروفیسر محمد نعمان خان صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے اپنے تعزیتی خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر عارف قاضی کی وفات شعبۂ عربی سے وابستہ لوگوں کے لیے بڑا خسارہ ہے، وہ کشمیر میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت میں کوشاں تھے، نوجوانوں کے لیے وہ آئیڈیل استاد تھے۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر سید حسنین اختر جنرل سکریٹری کل ہند انجمن اساتذہ و علمائے عربی زبان نے اپنے خطاب میں کہا کہ عارف قاضی ایک بہت اچھے انسان اور بڑے بااخلاق تھے۔ اس سے مل کر خوشی کا احساس ہوتا تھا، اس نوجوان استاد سے کافی امیدیں وابستہ تھیں، مگر اللہ کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں ہوتا۔ اللہ ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ شعبے کے اساتذہ پروفیسر ولی اختر، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری اور ڈاکٹر مجیب اختر نے بھی تعزیتی کلمات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 فروری 2018

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ایک ندی: نام سرسوتی

مصنف: رتن سنگھ
صفحات: 319
قیمت: 150 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات
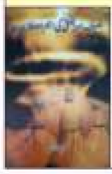
مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت 185 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

انتخابِ سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن
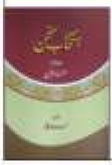
مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی
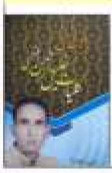
مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل و دوم)
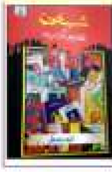
مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

کلیاتِ ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایات
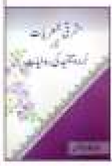
مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 382
قیمت: 170 روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف: ڈاکٹر ستیندر راناڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

شاعری کی تنقید
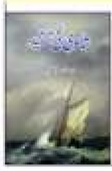
مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

کلیاتِ بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات: 383
قیمت: 180 روپے

انتخابِ سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق
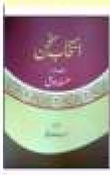
مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

جانے انجانے جاندار

مصنف: شمس الاسلام فاروقی (علیگ)
صفحات: 66
قیمت: 35 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابرا حسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

مصنف: ایس۔ ایم۔ خان
مترجم: سید وجاہت مظہر
صفحات: 166
قیمت: 125 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/03/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, April-2018, Vol.20, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025